مسلمانوں کا نظمِ مملکت

ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈی۔ لٹ (لنڈن)
پروفیسر تاریخِ اسلام فوادِ اوّل یونیورسٹی (قاہرہ)
و
پروفیسر علی ابراہیم حسن۔ ایم۔ اے

کی

محققانہ کتاب "النظم الاسلامیہ" کا ترجمہ

مترجم
مولوی علیم اللہ صاحب صدیقی فاضلِ دیوبند
بی۔ اے۔ جامعہ

۱۹۳۷ء
ندوة المصنفین دہلی

اصل کی تمام خوبیوں اور خصوصیتوں کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔

شکر ہے کہ اس مشکل وقت میں مہینوں کی جاں کاہی کے بعد کتاب طباعت کے مرحلوں سے گذر کر قدر دانوں تک پہنچ رہی ہے۔

آخر میں یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ مشاغل کی کثرت نے اگرچہ مجھے پورے مسودے کے مطالعہ کا موقع نہیں دیا پھر بھی کوشش کی ہے کہ کوئی اہم باب نظر ڈالنے سے رہ نہ جائے۔

دورانِ مطالعہ میں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ بعض حقایق کی تعبیر میں فاضل مولف کا قلم احتیاط کی حدود سے قدرے متجاوز ہو گیا ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ ہمارے اس دینی اور فقہی ماحول کے اندازِ تعبیر کے پابند نہیں ہو سکتے تھے جس کے دائرے میں بیان و تعبیر کی تقدیس کو نہ صرف خاص اہمیت دی جاتی ہے بلکہ اس کی زبردست نگرانی بھی کی جاتی ہے۔

طرزِ تعبیر کی ان خفیف زلتوں کو نظر انداز کر دینے کے بعد پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے آئینِ جہاں بانی کے تمام ضروری شعبوں سے متعلق اس قدر صاف، روشن، حقایق بردامان اور جامع کتاب ہمارے لٹریچر میں موجود نہیں تھی اور اس میں شبہ کی مطلق گنجایش نہیں کہ اس گراں قدر تالیف کی اشاعت سے وقت کی ایک بڑی ضرورت پوری ہو گئی ہے

عتیق الرحمٰن عثمانی

ناظم ندوۃ المصنفین

۷ رمضان المبارک ۶۶ھ

مطابق ۲۶ جولائی ۴۷ء

ترجمہ کے متعلق چند ضروری باتیں

(۱) ترجمہ کے وقت بنیادی خیال یہ رہا کہ ایک زبان دوسری زبان سے بنی نہیں ہے اس لئے لفظا کی جگہ لفظا رکھدینے سے صحیح مفہوم کا ادا ہونا ضروری نہیں ہے۔

(۲) ترجمہ کی جگہ اسے تالیف کہنا زیادہ صحیح ہوگا، نظرثانی کے وقت میرے پیش نظر مصنف کی دوسری کتاب "تاریخ الاسلام السیاسی" (قاہرہ ۱۹۳۵ء) علامہ احمد امین کی "فجر الاسلام" اور "ضحی الاسلام" اور سید امیر علی صاحب کی "اسپرٹ آف اسلام" اور "اے شارٹ ہسٹری آف دی سراسنز" رہی ہیں اور میں نے ترجمہ میں ترمیم و اضافہ کردیا ہے اسی لئے متعدد جگہ عبارتیں اصل سے مختلف دکھائی دیں گی۔

(۳) مکرر اور غیر ضروری عبارتوں کو حذف کردیا ہے، پوری کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ جہاں جہاں ایسا کیا گیا، وہاں ایسا کرنا ضروری تھا۔

(۴) بعض جگہ مصنف نے مصر کو اتنا نمایاں کردیا ہے کہ پورے باب میں اعتدال قائم نہ رہا مثلاً نظام مالیات کا باب، میں نے وہاں مصر کے جزوی اور مقامی حالات کو حذف کردیا ہے ان واقعات سے اردو داں طبقہ کو کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی۔ دوسری طرف اس کی وجہ سے پورے باب میں ایک توازن قائم ہوگیا، ایسا بہت کم کرنا پڑا کیونکہ مصنف نے توازن کا خیال رکھا ہے!

(۵) مقدمۂ مصنف، کا ترجمہ پوری کتاب کا ترجمہ کرنے کے بعد کیا ہے، پوری کتاب کا خاکہ میرے ذہن میں تھا، اسی کے ماتحت اس میں ترمیم کردی ہے۔ آخری پیراگراف

کی ترتیب بھی بدلی ہوئی ہے۔ ہجری نظام کے بارے میں جو عبارت تھی اسے مقدمے سے حذف کر دیا گیا۔ ایک تو وہ مقدمہ میں بے محل نظر آئی دوسرے اردو میں عربوں کی جہاز رانی وغیرہ کے بعد اس کی اہمیت اتنی نہیں تھی کہ اسے اتنا نمایاں کیا جائے۔

(۲) اس کتاب میں جو تاریخی خامیاں تھیں۔ انھیں نہایت تحقیق کے بعد درست کر دیا گیا ہے۔

کتاب میں جو کچھ بھی تصرف کیا گیا ہے وہ اردو داں طبقہ کے ذوق اور ماحول کے اختلاف کی بنا پر کیا گیا ہے۔ اس جسارت کی میں نے مصنف سے معذرت کر دی ہے۔

علیم اللہ صدیقی (شاہجہانپوری)

جامعہ جامعہ نگر
نئی دہلی

۶ر فروری ۱۹۷۳ء

مقدمہ

مسلمانوں کا نظمِ مملکت، تاریخ کا ایک نہایت اہم موضوع ہے، لیکن بدقسمتی سے ابھی تک اس پر بہت کم بحث کی گئی ہے۔ متقدمین میں اس موضوع پر سب سے پہلے ابوالحسن علی ماوردی (متوفی ۴۵۰ھ / ۱۰۵۸ء) نے قلم اٹھایا اور "الاحکام السلطانیہ" تصنیف کی، اس کے بعد اور علما نے ماوردی کے مجمل اور دقیق مطالب کی تشریح کے طور پر کتابیں لکھیں۔ ان میں ابن طباطبا کی تالیف "الفخری فی الآداب السلطانیہ" کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ یہ ۷۰۱ھ کی تصنیف ہے، اس موضوع پر ابنِ خلدون (متوفی ۸۰۸ھ / ۱۴۰۵ء) نے بھی بحث کی ہے، مگر ان کا طرزِ بیان بعض جگہ نہایت الجھا ہوا ہوتا ہے۔ بعض مورخین اور فقہا نے اس موضوع کے کسی ایک پہلو پر روشنی ڈالی ہے مثلاً ابو عمر کندی (+ ۳۵۰ھ / ۹۶۱ء) اور ابن حجر عسقلانی (+ ۸۵۳ھ / ۱۴۴۹ء) نے صرف قُضاۃ کے متعلق کتابیں لکھی ہیں اور جہشیاری (+ ۳۳۱ھ) ہلال صابی (+ ۴۴۸ھ / ۱۰۵۶ء) اور ابن منجب صیرفی (+ ۵۴۲ھ / ۱۱۴۷ء) نے "وزرا" کے بارے میں، اور امام ابویوسفؒ (+ ۱۹۳ء) ابن اسلام (+ ۲۲۴ھ) اور قدامہ بن جعفر (+ ۳۳۷ھ) نے مالیات کے نظام پر بحث کی ہے۔

عہدِ جدید کے اربابِ قلم میں سرولیم میور (+ ۱۹۰۵ء) سرٹامس آرنلڈ (+ ۱۹۳۰ء) اور ڈاکٹر عبدالرزاق احمد سنہوری بک نے "خلافت" پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

نظمِ مملکت سے مراد ہے سیاسی، ملکی، مالی اور عدالتی نظام۔ یوں تو حج، نماز، روزہ وغیرہ کو بھی ایک نظام کی حیثیت حاصل ہے۔ مگر یہ مسائل تاریخ سے زیادہ، دینیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ قدیم اجتماعی زندگی میں غلامی کا نظام ایک

نمایاں حیثیت رکھتا تھا، یونانیوں، رومیوں اور یہودیوں میں صدیوں سے غلامی رائج تھی۔ اسلامی معاشرے میں بھی اس کا دخل کچھ کم نہ تھا۔ اس لئے ایک مستقل باب غلامی کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔

سیاسی نظام میں ہم نے سب سے پہلے خلافت کا ابتدا سے لیکر عثمانیوں کے زمانہ تک جائزہ لیا ہے۔ اس کا شروع ہوکر عروج پر پہنچنا اور پھر مائل بہ زوال ہونا، بغداد میں تاتاریوں کے ہاتھ سے (سنہ ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء) ختم ہوجانا، مصر میں مملوکوں کے عہد میں دوبارہ قائم ہونا اور پھر وہاں سے عثمانیوں کی طرف منتقل ہونا، ان سب امور پر تفصیلی نظر ڈالی ہے۔ اس کے بعد وزارت، کتابت (وزارتِ خارجہ) اور حجابت کی نشوونما کے مختلف دور دکھائے گئے ہیں یعنی عہدِ رسالت، اور خلافتِ راشدہ سے لے کر امویوں، عباسیوں، فاطمیوں اور مملوکوں کے زمانہ تک ان عہدوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

دوسرے باب میں نظامِ حکومت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ابتدا میں گورنروں کے اختیارات و فرائض اور حکومت کے دفاتر کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس ضمن میں بلادِ شام، بلادِ فارس، (سنہ ۸۱ھ) اور مصر (سنہ ۸۷ھ) میں عربی کو دفتری زبان قرار دینے سے جو سیاسی اور تہذیبی اثر پڑا تھا اس پر بھی سرسری نظر ڈالی ہے۔ اس کے بعد عہدِ رسالت، خلافتِ راشدہ، دورِ بنی امیہ، اور عہدِ عباسیہ کے فوجی نظام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ضمناً مسلمانوں کے اسلحۂ جنگ، فوجی قیادت اور طریقۂ جنگ وغیرہ کا ذکر آگیا ہے۔ پھر خاص طور سے عہدِ طولون، اخشیدیہ، فاطمیہ، ایوبیہ اور مملوکوں کے زمانہ کے فوجی نظام پر بحث ہے۔ اس باب میں نہایت تفصیل کے ساتھ مسلمانوں کے اس عظیم الشان بحری بیڑے کی عہد بعہد ترقی کا جائزہ لیا گیا ہے جس نے یورپی مملکتوں کے لئے نمونے کا کام دیا تھا۔ (آج بھی جنوبی یورپ میں کثرت سے عربوں کی بحری اصطلاحات مستعمل ہیں) اس کے بعد مصر کے جہاز سازی کے کارخانوں پر ایک اجمالی نظر ڈالی گئی، جہاں مشرقی دولت روما سے مقابلہ کرنے کے لئے جہاز تیار ہوتے تھے۔ طولون نے اپنے زمانہ میں جزیرہ روضہ میں جہاز سازی

کا ایک بہت بڑا کارخانہ قائم کیا تھا، اخشیدیہ کے موسس محمد بن طغج نے اس کو اور ترقی دی، فاطمی خلیفہ معز الدین نے مقس میں، جہاز سازی کے ایک عظیم الشان کارخانہ کی بنیاد رکھی تھی۔ جہاں چھ سو جہاز طیار کئے گئے تھے، ایوبیوں اور مملوکوں نے بھی اپنے پیشرو حکمرانوں کی جانشینی کا حق ادا کر دیا اور بحری بیڑے کو ترقی دینے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا، اس وقت مصر کا بحری بیڑا اپنی حریف عیسائی حکومتوں کے بیڑوں سے کسی حیثیت سے کم نہ تھا، آخر میں ڈاک اور پولس کے نظام پر تفصیل سے نظر ڈالی گئی ہے۔

تیسرے باب میں مالیات کے نظام سے بحث ہے اور نہایت وضاحت کے ساتھ ذرائع آمدنی اور مصارف پر روشنی ڈالی گئی۔ ذرائع آمدنی میں، زمین کے لگان، جزیہ، زکوٰۃ، فے[۱]، مال غنیمت اور عشر (۱/۱۰) یا چنگی کی آمدنی کا خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے، اس ضمن میں دیوان خراج، محکمۂ احتساب، نظام جاگیرداری وغیرہ پر بھی ایک جامع تبصرہ کیا ہے۔

بنی امیہ اور بنی عباسیہ کا ذکر ایک مستقل عنوان کے تحت میں ہے۔ ابتدا میں ان کے لگان وصول کرنے کا طریقہ اور لگان کی مقدار بتائی گئی ہے۔ ذرائع آمدنی کے ذکر کے بعد بیت المال کے مصارف کا جائزہ لیا گیا ہے اور عہدہ داروں اور فوجیوں کی تنخواہوں، علماء و ادباء کے وظائف، فوج اور بیڑے کے اخراجات، ذرائع آبپاشی کے مصارف اور قیدیوں کے خورد و نوش وغیرہ کے مصارف پر اجمالاً اور آخر میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ مصر کے مالیات پر بحث کی گئی ہے پہلے حضرت عمرو بن عاصؓ کے زمانہ سے عہد طولون کے آغاز تک پھر طولون کے عہد سے اخشیدیوں، فاطمیوں اور مملوکوں کے عہد تک۔ ایک نقشہ باب کے خاتمہ پر دیدیا ہے جس میں مختلف اسلامی عہدوں کے خراج کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

چوتھے باب میں عدالت کے نظام کا ذکر ہے، اور دور جاہلیت، عہد رسالت، خلافت راشدہ، عہد بنی امیہ، عباسیہ کے عہد عروج (جس میں مذاہب نے جنم لیا) اور دور زوال کے عدالتی نظام

---

[۱] وہ مال جو دشمن چھوڑ کر بھاگ گیا۔

پر تاریخ کی روشنی میں نظر ڈالی گئی۔ مصر کے عدالتی نظام کا ایک جداگانہ فصل میں تذکرہ کیا گیا ہے اور اس میں فتح اسلامی سے لیکر فاطمیوں، ایوبیوں اور مملوکوں کے زمانہ تک کسی قدر تفصیل سے نگاہ ڈالی ہے۔ اس باب میں عدالتِ عظمیٰ (Supreme Court) اور عدالتِ احتساب (Court of Inqnesition) کا بھی مجمل طور پر ذکر آگیا ہے۔

پانچویں باب میں غلامی پر ایک جامع تبصرہ ہے۔ ابتداء میں یونانیوں، رومیوں، یہودیوں اور عربوں کے نظامِ غلامی کا اجمالی خاکہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد "اسلام میں غلامی کی حقیقت" بیان کی گئی ہے۔ یہ منزل قرآن وحدیث اور تاریخ کے سایہ میں طے کی گئی اور نہایت وضاحت سے بیان کیا گیا کہ اسلام میں غلاموں کی حیثیت صرف جنگی قیدیوں کی تھی، ان سے عدل وانصاف اور شفقت ومحبت کا سلوک کیا جاتا تھا۔ ان میں اور آقاؤں میں کھانے پینے اور تعلیم وتہذیب میں مساوات قائم کی گئی اور کوئی امتیاز روا نہ رکھا گیا۔ ضمناً غلامی کے اسباب، اس کی قسموں، آزاد کرنے کے طریقوں اور موالیوں پر بھی ایک سرسری نگاہ ڈالی ہے۔ آخر میں اس سلوک کا ذکر ہے جو آنحضرت، خلفاءِ راشدین، خلفاءِ بنی امیہ اور خلفاءِ بنی عباسیہ نے غلاموں کے ساتھ کیا تھا۔ مصر اور بلادِ اندلس کی غلامی کے مختصر بیان کے بعد یہ باب ختم کر دیا ہے۔

سیاسی وقعات کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج تھی اس لئے ہم نے انہیں چھوڑ دیا اور صرف مختلف فرمانرواؤں کے نام اور تخت نشینی کے سن دیدینا کافی سمجھا تاہم کتاب کی ترتیب میں اس کا خیال ضرور رکھا گیا ہے کہ پڑھنے والا آنحضرت کے زمانہ سے خلافتِ عثمانیہ کے زوال ۱۳۴۲ھ تک اسلام کی پوری سیاسی تاریخ کا اجمالی طور پر واقف ہو جائے۔ مصر کی سیاسی تاریخ کا حضرت عمرو بن عاص کے ہاتھ سے ۲۱ھ سے سلطان سلیم اول کی فتح (۱۵۱۷ء) تک زیادہ تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے جو لوگ اس موضوع پر مزید مطالعہ کرنا چاہیں ان کی آسانی کیلئے عربی، انگریزی، جرمنی اور فرانسیسی مآخذوں کا جا بجا ذکر کر دیا گیا ہے آخر میں ان کی ایک فہرست بھی دیدی گئی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ تاریخ اسلام کے اس پہلو پر ... روشنی ڈالی ہے اس کا مطالعہ ریسرچ سکالروں اور اونچے درجوں کے طلبہ کیلئے ضروری ہے امید ہے اس کی قدر کی جائے گی۔

حسن ابراہیم حسن　　　علی ابراہیم حسن

۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

باب سوم
نظامِ مالیات

باب اوّل

سیاسی نظام

(۱) خلافت

(۲) وزارت

(۳) کتابت

(۴) حجابت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خلافت کی ابتدا

آنحضرتؐ کی حکومت | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (۶۱۰ء-۶۳۲ء) کی حکومت، دینی حکومت تھی، صحابہ کا اعتقاد تھا کہ آپ کی حکومت کا محور وحی خداوندی ہے، خدا، حضرت جبرئیلؑ کے واسطے سے احکام بھیجتا ہے، آپؐ انھیں کو عمل میں لاتے ہیں۔ اس حکومت کی بنیاد خاندانی عصبیت اور نسلی شعور کی جگہ دینی وحدت پر قائم تھی، عربوں کی شیرازہ بندی میں اس کا بہت بڑا دخل تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا صحابہؓ کے دل و دماغ پر اتنا اثر تھا کہ بہتوں کو آپؐ کی وفات کا یقین نہ آتا تھا، یہ سانحہ مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا حادثہ تھا، اس وقت، ایک گروہ اس خیال سے سراسیمہ نظر آتا تھا کہ خدا کی حکومت کی جگہ اب انسانوں کی فرمانروائی ہوگی اور قریش یا کوئی اور دوسرا خاندان، نفسانی رجحانات کے زیر اثر امت پر حکومت کرے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جانشینی کا سوال ایک سیاسی ہنگامہ کی شکل میں اٹھا۔ بات یہ تھی کہ آنحضرتؐ نے اس کا فیصلہ اپنی زندگی میں نہیں کیا تھا اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ آپ عربوں کے نظام جمہوری کو بہت پسند کرتے تھے۔ صحابہؓ اس سے واقف تھے، اس لئے آپ کو اعتماد تھا کہ مسلمان، جمہوری طریقۂ انتخاب سے ایک شخص کو اپنا حاکم بنالیں گے۔ آپؐ کے بعد یہ مسئلہ اٹھا اور صحابہؓ کے اندر شدید اختلاف پیدا ہوگیا۔ اس نازک وقت میں حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ وغیرہ نے اپنی غیر معمولی فہم و فراست سے یہ ہنگامہ فرو کیا اور جانشینی کے لئے حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب عمل میں آیا۔

یہ خلافت کی ابتدا تھی۔

خلافت کا مفہوم | خلافت کے لغوی معنی "جانشینی" اور اس کا اصطلاحی مفہوم "آنحضرتؐ کے جانشین کی حیثیت سے مطلق دینی اور دنیاوی امور میں فرماں روائی کا حق" تھا۔ خلیفہ کی شخصیت شرعی نقطۂ نظر سے دینی اور دنیاوی معاملات میں فرماں روائی کی حامل تھی یہ فرمانروائی شریعت کے دستور اور قوانین کی پابند تھی۔ خلافت کا حقیقی مقصد، ناموسِ اسلام کا تحفظ اور شرعی زاویۂ نگاہ سے، حکومت کے نظم و نسق کی تنظیم اور اس کا قیام تھا۔ [1]

اسلامی معاشرہ یا ہیئتِ اجتماعی میں خلیفہ، آنحضرتؐ کا جانشین خیال کیا جاتا تھا اُسے مطلق سیاسی اور مذہبی اختیارات حاصل تھے، خلیفہ کا فرض تھا کہ وہ اسلامی قوانین کا تحفظ اور اُن کا نفاذ کرے، عام فلاح و بہبود کی ذمہ داریاں اٹھانا بھی اُس کا منصبی فرض تھا وہ مسلمانوں کا مذہبی اور سیاسی مرکز تھا، اس لحاظ سے اس کی حیثیت، قرونِ وسطیٰ کے پاپائے روم سے مختلف تھی۔ سرٹامس آرنلڈ نے قرونِ وسطیٰ میں، مشرق کے خلافت کے نظامِ حکومت اور مغرب کے کلیسائی نظامِ حکومت پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے۔

"یہ دونوں نظام مذہبی اثر اور قوت کی بنیاد پر قائم تھے، اسلام اور عیسائیت دونوں عالمگیر مذہب تھے اور اپنا اپنا دائرۂ عمل وسیع کرنے کی فکر میں ہمیشہ رہتے تھے، اِن دونوں میں فرق یہ تھا کہ مقدس رومی سلطنت پچھلی بت پرست سلطنت ہی کی بگڑی ہوئی شکل تھی اس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ شہنشاہ شارلی مان (۷۶۸ء - ۸۱۴ء) کے القاب بت پرستانہ عقائد کے آئینہ دار تھے۔ دوسرے یورپ میں دو فرماں روا تھے، ایک سیاسی جسے شہنشاہ کہتے تھے، دوسرا مذہبی یا روحانی جسے پاپا سے خطاب کیا جاتا تھا۔ لیکن خلافت کی بنیاد کسی پچھلے سیاسی نظام پر قائم نہیں تھی بلکہ وہ ایک جدید نظام تھا جس کی تعمیر اور تکوین زمانہ کی احتیاجات اور اس سیاسی ماحول کی بنیاد پر ہوئی تھی جو

[1] مقدمہ ابنِ خلدون ص ۱۶۲۔

ظہورِ اسلام کے بعد عربوں کے بلادِ فارس اور مشرقی سلطنت روما کے ایک بڑے حصے پر تسلط قائم کر لینے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا خلیفہ کے سیاسی فرماں روا ہونے کا مفہوم یہ تھا کہ وہ مذہبی اور سیاسی دونوں قسم کے اختیارات کا حامل ہے۔ مذہبی حیثیت سے اس کی حکومت کا حقیقی مقصد صرف دین کا تحفظ تھا۔ حامی دین کی حیثیت سے وہ جنگ کرتا تھا، مذہب کو صدمہ پہنچانے والے افراد کو سزائیں دیتا تھا۔ نماز میں امامت اور جمعہ میں خطبہ دینا بھی اس کا ایک منصبی فرض تھا لیکن پاپا صرف ایک راہب اعظم کی حیثیت رکھتا تھا جو صرف گنہ گاروں کے قصور معاف کر سکتا تھا اور مذہبی معاملات میں اُسے آخری فیصلہ کرنے کا حق حاصل تھا۔" ۱؎

خلیفہ کے القاب | حضرت ابوبکرؓ عالمِ اسلامی کے نظم و نسق اور آئینِ اسلام کے قیام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام تھے۔ اس لئے آپ کا لقب "خلیفۂ رسول اللہ" تھا۔ حضرت عمرؓ کا لقب کچھ عرصہ "خلیفہ خلیفۂ رسول اللہ" رہا۔ اس کے بعد اس لفظ کے ترکیبی ثقل کی وجہ سے "امیر المومنین" کا لقب اختیار کیا گیا۔ یہ لقب اس پر بھی ہلکی سی روشنی ڈالتا ہے کہ مسلمانوں نے حکومت کا دائرہ وسیع کرنے کا عزم کر لیا تھا اور حضرت عمرؓ اُن کے قائد تھے کیونکہ "امیر" عہدِ جاہلیت میں فوج کے سردار کو کہا جاتا تھا۔ اسلام میں حضرت عمرؓ پہلے شخص تھے جنہوں نے یہ لقب اختیار کیا تھا۔ سچ پوچھئے تو حضرت عمرؓ ہی کی روحانی قیادت، فتوحاتِ اسلامیہ میں کارفرما تھی۔ اس لفظ کے مفہوم میں جنگی اور انتظامی قیادت داخل ہے، آپ اس کے صحیح مصداق تھے خلیفہ کو "امام" اس لئے کہا جاتا تھا کہ اسے مذہبی تقدس حاصل تھا اور وہ نماز میں امامت کا فرض انجام دیتا تھا جو مسلمانوں میں دینی مرکزیت پیدا کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔

شیعہ اپنے پیشواؤں کو امام اس لئے کہتے تھے کہ وہ حضرت علیؓ کے گھرانے سے تھے۔ جب وہ خلافت کا سب سے زیادہ مستحق خیال کرتے تھے ان کے اعتقاد میں اس خاندان کے افراد

۱؎ Sir Thomas Arnold The Caliphate. P. B. 9. 18.

کو خدا کی طرف سے ایک خاص روحانی بصیرت حاصل ہوتی ہے جو ایک امام یا امیر کے لئے ناگزیر ہے، مہدی کے عقیدہ میں اسی عقیدت کا دخل ہے قرآن[۵۱] میں یہ لفظ "پیشوا" "رہنما"[۵۲] اور "سردار" کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

آنحضرتؐ نماز میں مسلمانوں کے پیشوا کی حیثیت سے امامت کرتے تھے آپ نے اپنے مرضِ وفات میں حضرت ابوبکرؓ کو نماز کی امامت کے لئے مامور فرمایا تھا حضرت ابوبکرؓ کے استحقاقِ خلافت کی سنیوں کے نزدیک یہ بہت بڑی دلیل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین امامت کا فرض انجام دیتے تھے اس دور میں یہ حکومت کی شان کا مظاہرہ خیال کیا جاتا تھا۔ عالمِ اسلامی میں گورنروں کا فرض تھا کہ وہ امامت کریں۔

اسلام کے دورِ اول میں خلیفہ کے تین لقب تھے۔ خلیفہ، امیر المومنین، اور امام سر ٹامس آرنلڈ ان القاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"فقہاء نے خلیفہ کے ان القاب پر تفصیلی بحث کی ہے مگر ان کی توجیہات غیر تسلی بخش ہیں، امام کے جو معنی انھوں نے بیان کئے ہیں اس سے ان کا مقصد ثابت نہیں ہوتا ہے۔ لفظ خلیفہ" قرآن[۵۳] میں اس اصطلاحی معنی میں مستعمل نہیں ہوا ہے جو اسلام میں خلیفہ کے لئے جاتے ہیں۔ فقہاء نے اپنی بحث کی بنیاد انھیں آیات پر رکھی ہے۔ جس طرح عیسائیوں کے دونوں گروہوں کلیسائی اور رومی شہنشاہیت کے حامیوں نے اپنے اپنے اغراض اور نظریوں کے ماتحت انجیل سے سند ڈھونڈی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظ خلیفہ قرآن کے اندر جس مفہوم میں آیا ہے وہ خلافت کے اس سیاسی نظام پر کسی طرح صادق نہیں آتا ہے جو عالمِ اسلامی میں رائج تھا۔"[۵۴]

---

۵۱ سورۂ انبیاء ۲۱: ۷۳۔ — ۵۲ Sir Thomus Arnold. Caliphate, P.P. 29, 33

۵۳ سورہ بقر آیت ۳۰ — سورہ انعام آیت ۱۶۵ — سورہ ص آیت ۲۶

۵۴ The Caliphate. P.P. 42.

قرآن اور نظامِ حکومت

قرآن نے کوئی ایسا دستورِ حکومت متعین نہیں کیا تھا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمان عمل درآمد کرتے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض آیات اربابِ حکومت کی اطاعت پر آمادہ کرتی ہیں۔ مثلاً

"اللہ کی اطاعت کرو، اللہ کے رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی اطاعت کرو جو تم میں صاحبِ حکم و اختیار ہوں۔" [1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلفائے راشدین کا دور آیا۔ اس عہد میں فرماں روا کا انتخاب شوریٰ کے ذریعہ کیا جاتا لیکن بنی امیہ اور بنی عباسیہ کے عہدِ خلافت میں یہ جمہوری طریقہ خودسر اور موروثی حکومت کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ اس زمانہ میں شوریٰ کا وجود ختم ہو گیا، اور انتخاب صرف نام کو رہ گیا۔ فقہا نے اس بادشاہی نظامِ حکومت کے جواز کو ثابت کرنے کے لئے اس قسم کی احادیث سے استدلال کی کوشش کی ہے "خلافت میرے بعد چالیس سال تک رہے گی پھر جبر و استبداد کی حکومت ہو جائے گی" سر ٹامس آرنلڈ کا خیال ہے کہ اس قسم کی بہت سی احادیث اس نظامِ استبدادی کی صحت کو ذہن نشین کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط منسوب کر دی گئی ہیں اور فقہائے اسلام اس نظریہ کی تائید میں کہ ائمہ قریش سے ہوں گے، اس حدیث سے استناد کرتے ہیں۔

خلیفہ کی صفات؟

خلیفہ کے لئے علم، عدالت، کفایت اور ان اعضا اور حواس کی صحت و سلامتی ضروری خیال کی جاتی۔ جن کا اثر رائے و عمل پر پڑتا ہو۔ خلیفہ میں کم سے کم اتنی علمی استعداد لازمی خیال کی جاتی تھی کہ وہ نئے نئے مسائل کا اپنی اجتہادی قابلیت سے فیصلہ کر سکے۔ عدالت سے مراد بلند سیرت (Noble Character) اور معاصی سے اجتناب ہے۔ کفایت کا مفہوم یہ ہے کہ آئین اور حدودِ اسلام کے نافذ کرنے کی قوت رکھتا ہو، فوجی بصیرت ہو، وقت پر جہاد کا جوش و ولولہ پیدا کر سکے، مدبر اور صاحبِ فہم و درایت ہو۔ [2]

[1] سورۂ نساء، آیت ۵۹۔ [2] الاحکام السلطانیہ (ماوردی) ص ۴، مقدمہ ابن خلدون ص ۱۵۲۔

انتخابِ خلیفہ
مختلف فرقوں کے زاویۂ نظر سے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مدینہ میں مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کے اندر جانشینی کے بارے میں شدید اختلاف پیدا ہوا۔ ذیل میں اس پر ایک اجمالی نظر بے محل نہ ہوگی۔

۱۔ مہاجرین و انصار

مہاجرین کا خیال تھا کہ خلافت کا منصب قریش کو سونپ دینا چاہیے دلیل یہ تھی کہ وہ عرب کا شریف ترین قبیلہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی سے نسلی تعلق رکھتے تھے، دوسرے اثر و رسوخ کے اعتبار سے بھی کوئی دوسرا قبیلہ اس کا ہمسر نہیں ہے اس لئے تمام جزیرۂ عرب کا قریش کی حکومت کو تسلیم کر لینا آسان ہے، اس کے برعکس اگر کسی اور قبیلہ کا فرد خلیفہ منتخب ہوگا تو مختلف قبائل میں باہمی رشک و حسد کی وجہ سے رقیبانہ کشمکش شروع ہو جائے گی اور اندرونی فتنہ اٹھ کھڑا ہوگا۔ ان حضرات کی نظر ان مہاجرین پر پڑ رہی تھی، جو آنحضرتؐ پر سب سے پہلے ایمان لائے تھے اور مشرکینِ مکہ کی روح فرسا اذیتوں پر صبر و ضبط سے کام لیا تھا۔

انصار کا گروہ مہاجرین سے زیادہ اپنے آپ کو اس منصب کا مستحق سمجھتا تھا۔ دلیل یہ تھی کہ انصار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین کو مدینہ میں پناہ دی، ان کی پشت پناہی کی اور مشرکین کے مقابلہ میں ان کی طرف سے سینہ سپر ہو کر جانیں لڑائیں[1]۔ یہ انصار خلافت کو کسی ایک خاندان کے ساتھ مخصوص خیال نہیں کرتے تھے بلکہ اس کا دائرہ ہر خاندان تک وسیع سمجھتے تھے۔

مہاجرین و انصار میں اس وقت سخت اختلاف تھا، ہر طبقہ اپنے استحقاقِ خلافت کی دلیلیں پیش کرتا تھا، مہاجرین کہتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "امام قریش سے ہوں گے" اور فرمایا "ہم تمہیں (مہاجرین) اپنے محسنوں (انصار) کے ساتھ نیک سلوک کی وصیت کرتے ہیں، تمہیں چاہیے کہ ان کی کوتاہیوں سے درگذر کرو" مہاجرین کہتے تھے اگر خلافت

---

[1] مقدمہ ابنِ خلدون ص ۱۷۰۔

تم میں چلی گئی تو اس وصیت کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔" آپ نے یہ بھی فرمایا تھا "حکومت کا منصب قریش میں، عدالت کا محکمہ انصار میں، اور اذان کا اعزاز حبشہ میں ہوگا۔" ایک بار ارشاد فرمایا تھا "امام قریش سے ہوں گے، جب تک وہ عدل کے ساتھ حکومت کریں گے وعدہ وفائی کریں گے، رحم و شفقت کریں گے"[۵۱] مہاجرین نے یہ تمام احادیث تو پیش کر دیں مگر قرآن سے کوئی ثبوت پیش نہ کر سکے جس سے یہ ظاہر ہو کہ خلافت کسی خاص قبیلہ یا طبقہ تک محدود ہے۔ برعکس اس کے قرآن نے فیصلہ کر دیا تھا "خدا کے نزدیک سب سے زیادہ قابل عزت وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو"[۵۲]

۲۔ **شیعہ** شیعوں کا نظریہ تھا کہ خلافت کا منصب آنحضرتؐ کے خاندان کے ساتھ خاص ہے یہ اہل بیت کے حامی تھے اور ان کا مخلصانہ خیال تھا کہ خلافت کا حلقہ اہل بیت تک اور وہ بھی صرف حضرت علیؓ کی اولاد میں محدود رہنا چاہیے۔ ان کے ہاں خلیفہ کے انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان کے نقطۂ نگاہ سے خلافت کا صحیح استحقاق صرف حضرت علیؓ کو حاصل تھا اور پھر ان کے بعد ان کے خاندان میں اس کو منتقل ہونا چاہیے تھا۔ مزید براں وہ خلیفہ کے ساتھ مذہبی تقدس وابستہ کرنے کی بھی وکالت کرتے تھے۔ چنانچہ ان کا خیال تھا کہ علم شرعی کا مرکز اور امین صرف خلیفہ ہے۔ صرف وہی صحیح طور پر قرآن اور حدیث کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور قرآن و حدیث کی تفسیر کرنا بھی صرف اسی کا حق ہے۔ اسی لئے وہ خلیفہ کو امام کے لقب سے خطاب کرتے تھے اور اس کو اپنا مذہبی پیشوا سمجھتے تھے۔ حضرت علیؓ کے معاملہ میں ان کا غلو حد سے زیادہ تجاوز کر گیا تھا۔ انھوں نے ان کو مقام الوہیت کا درجہ دے رکھا تھا لیکن ابن خلدون شیعوں کے اس نظریہ سے کہ خلافت بھی دین کا ایک رکن ہے اور اس کے انتخاب کے لئے امت کا مشورہ ضروری نہیں ہے، بالکل متفق نہیں۔[۵۳]

خوارج کے نظریۂ خلافت "ہر طبقہ کا فرد خلافت کا اہل ہے" سے بھی ابن خلدون کو

[۵۱] تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۶، [۵۲] سورۂ حجرات آیت ۱۳، [۵۳] مقدمہ ابن خلدون ص ۱۵۳-۱۵۴۔

اتفاق نہیں ہے، وہ خلافت اس قبیلہ کے لئے موزوں سمجھتے ہیں، جس میں عصبیت ہو اور شیرازہ بندی کی صلاحیت رکھتا ہو، وہ اپنی دلیل میں یہ پیش کرتے ہیں "مسلمانوں کی نظرِ انتخاب قریش پر اس لئے پڑی تھی کہ ان میں عصبیت تھی اور وہ تمام عرب پر اقتدار قائم رکھنے کی قابلیت رکھتے تھے، یہ بات کسی دوسرے قبیلہ کو حاصل نہ تھی، جزیرۂ عرب میں قریش کو سب سے زیادہ اثر و رسوخ حاصل تھا، کسی قبیلہ کو ان کی سیادت سے انکار نہ تھا" ابن خلدون کا خیال ہے کہ خلافتِ راشدہ ہمارے سامنے سب سے اعلیٰ نمونہ ہے، اس دور میں اور صدہا تغیرات ہوئے مگر اس بنیادی نظریہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور صاحب عصبیت اور با اثر قبیلہ ہی کو خلافت کا مستحق خیال کیا جاتا تھا۔ اس میں کسی خاص قبیلہ کی کوئی تخصیص نہ تھی، اس کی وجہ اسلام کا آئینِ مساوات تھا، جس میں کسی فرد کو نسلی شرف کی وجہ سے ترجیح حاصل نہ تھی، خلافت کیلئے نسباً قریشی ہونے کی شرط پر ان الفاظ میں ابنِ خلدون اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

"ہر شرعی حکم کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ کسی خاص مقصد پر مبنی ہو، ہم جب خلافت کے لئے قریشی نسب کی شرط اور حکمت سے بحث کریں تو ہمارا دائرہ بحث سطحی اہلِ طبقہ کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف تعلق تک محدود نہیں رہنا چاہئے اس شرف و افتخار سے انکار نہیں، مگر شرف و فخر کوئی مقصد تو نہیں ہے اس لئے ہمیں اس شرط کی کوئی دوسری حکمت تلاش کرنی پڑے گی، اگر ہم عمیق نظر سے دیکھیں تو اس کی وجہ اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ قریش عصبیت کے لحاظ سے ممتاز تھے اور ان میں مرکزیت قائم کرنے کی صلاحیت تھی، وہ اتنی طاقت رکھتے تھے کہ ظالم سے مظلوم کا حق دلا سکیں، اس زمانہ میں صاحب عصبیت قبیلہ کا خلیفہ آسانی سے لوگوں کی شیرازہ بندی کر سکتا تھا اور اندرونی فتنہ و فساد اور اختلافات دبا دیتے ہیں اسے کوئی دشواری نہیں تھی، شہریوں کو اس سے زیر حکومت جان و مال کے تحفظ کی توقع تھی۔ اس لئے حکومت کی تنظیم میں وہ ہمارا دیتے یہ بیان کرنے کی شاید ضرورت نہیں کہ

قریش مُضر کا سب سے با اثر، صاحب عصبیت اور طاقتور قبیلہ تھا۔ جزیرۂ عرب کے باشندے اس حقیقت سے واقف تھے اور اسی لئے قریش سے دبتے تھے، یا ان کا احترام ادب کرتے تھے۔ اس ماحول کی وجہ سے آپ نے امامت کے لئے "قریش" کی شرط لگائی تھی، آپ کی دوربین نگاہ نے دیکھ لیا تھا کہ جزیرۂ عرب میں اگر کوئی خاندان مرکزیت پیدا کر سکتا ہے تو وہ قریش کا خاندان ہے، آپ ان کی فطری صلاحیتوں، فہم و درایت جاہ و ثروت اور ہمہ گیر عظمت اور احترام سے واقف تھے اس لئے آپ کو اعتماد تھا کہ وہ اس بار کو نہایت آسانی سے سنبھال لیں گے اور امت کا شیرازہ منتشر نہ ہونے دیں گے۔ مستقبل نے ظاہر کر دیا کہ آپ کا یہ خیال صحیح تھا!

جب قریش کا ایک ممتاز اور ہر دل عزیز فرد خلیفہ منتخب ہو گیا تو تمام قریش نے عربوں میں مرکزیت پیدا کرنے میں اس کا ہاتھ بٹایا اور قریش کے اثر و نفوذ اور اعزاز کی وجہ سے تمام قبائل مُضر نے ان سے اتحاد عمل کیا، یہ دنیا جانتی ہے کہ مضر کی نسل جزیرۂ عرب کے چپہ چپہ میں منتشر تھی اور اثر و اقتدار اور ثروت کے لحاظ سے تمام جزیرہ پر حاوی تھی۔ اس نسلی عصبیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام عرب ایک مرکز پر قائم رہے اور زندگی کی جد و جہد میں آگے بڑھے اور دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ عربوں کی یہ عصبیت جب تک قائم رہی اس وقت تک ان کی حکومت متزلزل نہ ہو سکی۔ جب اس عصبیت کا جنازہ اٹھ گیا تو ان کی حکومت نے بھی تڑپ کر دم توڑ دیا! [۱]

۳۔ خوارج | خوارج کا ابتدا میں نظریہ یہ تھا کہ خلافت ہر آزاد عربی نسل متنفس کا حق ہے مستقبل میں یہ فرقہ وان فلوٹن (Von Floton) کے الفاظ میں: "عالمگیر جمہوریت کے اصول کا حامی بن گیا تھا۔ اور اس نے اپنے نظریے میں ترمیم کی اور خلافت کی بنیادی شرط عربی نسل اور حریت کی جگہ صرف بلند سیرت اور مسلمان ہونا قرار دی۔ یہ وہ وقت تھا جب کثرت سے

---

[۱] ابن خلدون ص ۱۷۰، ۱۷۵ دیکھو السیادۃ العربیہ والشیعہ والاسرائیلیات فی عہد بنی امیہ ترجمہ ڈاکٹر حسن ابراہیم ط ۲۹

عجمی مسلمان ان کی جماعت میں داخل ہوگئے تھے، خوارج کے زاویۂ نگاہ سے خلیفہ کا معزول کرنا حتی الامکان جائز نہ تھا، لیکن اگر خلیفہ جبر و استبداد کا مرتکب ہو تو نہ صرف معزول کرنا جائز تھا بلکہ مصلحتِ وقت کے لحاظ سے اس کا قتل کر دینا بھی ان کے اعتقاد میں معیوب نہ تھا۔ ؎۱

۴۔ مرجئہ اور معتزلہ | مرجئہ کے زاویۂ نگاہ سے خلافت کے لئے مسلمان ہونا اور زبان سے کلمۂ شہادت پڑھنا کافی ہے، انھیں خلیفہ کے ذاتی افعال سے کوئی غرض نہ تھی، ان کے خیال میں یہ بندہ اور خدا کا معاملہ تھا، اس فرقہ نے بنی امیہ کی خلافت کو صحیح قرار دیا تھا مرجئہ کے نظریۂ خلافت کا بنی امیہ کی تعمیر اور استحکام میں بڑا دخل تھا۔ بنی امیہ کے فرماں رواؤں نے اس جماعت کو اپنا آلۂ کار بنایا اور اپنے لئے سیاسی میدان ہموار کیا۔ مرجئہ ہی کی جد و جہد کا یہ اثر تھا کہ سوادِ اعظم نے بنی امیہ کی خلافت تسلیم کرلی تھی، شیعوں اور خوارج کے نظریوں سے اس نظریہ کا تصادم تھا، بنی امیہ کے ساتھ اس فرقہ کا آفتاب بھی غروب ہوگیا اور مستقبل میں کسی مستقل اور با اثر طبقہ کی حیثیت نہ رہی۔

معتزلہ یا قدریہ فرقہ کا بھی اسلامی سیاست پر ان تینوں فرقوں سے کچھ کم اثر نہ پڑا تھا جس طرح یہ فرقہ قضاء و قدر پر اعتقاد رکھتا تھا، اسی طرح انسان کی آزادیٔ رائے اور ارادہ کا بھی قائل تھا۔ یہ فرقہ ابتدا میں سیاست سے الگ تھلگ رہا۔ اس وقت اس کا دائرہ عمل مذہبی موشگافیوں تک محدود تھا اور سیاسیات سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر تھوڑے عرصہ میں یہ بھی سیاسی بھنور میں پھنس گیا اور امامت اور شروطِ خلافت پر بحث و مناظرہ شروع کر دیا۔ ان کا نظریہ تھا کہ امامت ؎۲ امتِ مسلمہ کا حق ہے، دلیل یہ تھی، خدا نے اس منصب کے لئے کسی خاص خاندان یا فرد کی تعیین نہیں کی ہے۔ امت کو اختیار ہے کہ تنفیذِ احکام کے لئے وہ اپنا فرماں روا یا خلیفہ جس کو چاہے منتخب کرلے۔ ان کے نزدیک ہر زمانہ کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنا ایک امام ضرور منتخب کریں، معتزلہ کے اس زاویۂ نگاہ سے "خلیفہ کا تقرر امت کا فرض ہے"

؎۱ مروج الذہب (المسعودی) ج ۲ ص ۱۱۰ و ۱۱۱۔ ؎۲ مروج الذہب (المسعودی) ج ۲ ص ۱۹۱-۱۹۲۔

تمام فرقے متفق ہیں۔ اور خارجیوں کے تمام فرقے بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں صرف اباضیہ اور نجدیہ دو خارجی فرقوں کا خیال ہے کہ اگر امت میں عدل و مساوات، رواداری اور اخلاق کی پاکیزگی کا عالمگیر جذبہ پایا جاتا ہو اور معصیت کا رجحان جاتا رہا ہو، اس وقت امام یا خلیفہ کا تقرر امت پر فرض نہیں ہے۔ اس نظریہ میں چند متقدمین اور متاخرین معتزلہ بھی ان کے ہم نوا ہیں۔ خلافت کے استحقاق میں جو لوگ عالمگیر مساوات کے قائل ہیں اور قریشی اور غیر قریشی کو ایک درجہ میں رکھتے ہیں وہ اپنی دلیل میں حضرت عمرؓ کے یہ آخری الفاظ پیش کرتے ہیں:۔

"اگر آج سالم (حضرت حذیفہؓ کا آزاد کردہ غلام) زندہ ہوتے تو میں اطمینان و سکون سے دنیا سے رخصت ہوتا۔ مجھے اعتماد تھا کہ وہ اس بارِ حکومت کو سنبھال لیتے۔"

یہ حضرت عمرؓ نے اس وقت فرمایا تھا جب وہ امت کی کشتی کا بادبان اہل شوریٰ کے سہارے پر چھوڑ رہے تھے، اگر حضرت عمرؓ کے خیال میں تمام مسلمانوں کو امامت کا حق حاصل نہ ہوتا تو اس قسم کے الفاظ وہ ارشاد نہ فرماتے اور ابی حذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام سالم کی موت پر ان کو افسوس نہ ہوتا۔ اس نظریہ کی تائید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بہت سی روایات منقول ہیں، مثلاً آپ نے مسلمان فرماں رواؤں کے بارے میں فرمایا "سنو اور اطاعت کرو، اگرچہ وہ ایک نکٹا غلام ہو"۔ قرآن نے ان الفاظ میں مساوات کا اعلان کیا اور نسلی امتیازات کو باطل قرار دیا "خدا کے نزدیک سب سے شریف وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ ڈرتا ہو"۔

بیعت | بیعت کا مفہوم ان امور میں خلیفہ کی اطاعت کا عہد و پیمان تھا جن کا تعلق مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی فلاح و بہبود سے ہو۔ بیعت۱؎ کے وقت خلیفہ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا جاتا، یہ عربوں کے تمدن میں عہد و پیمان کا محکم طریقہ تھا۔ دارالخلافت سے دور ممالک میں یہ بیعت گورنروں اور نائبوں کے واسطے سے ہوتی۔ بیعت کے وقت ایمان کی تجدید

۱؎ مقدمہ ابن خلدون ص ۱۶۲۔

بھی کی جاتی، خلافت کی بیعت میں جبر و اکراہ کا اکثر زمانوں میں دخل تھا!

میرے زمانہ میں (ابنِ خلدون ۸۰۸ھ) ساسانی سلاطین کا طریقہ بیعت رائج ہے، بیعت کے وقت عام رعایا کا معمول، جھک کر زمین بوسی کرنا، ہاتھ پیر اور دامن چومنا ہے ان باتوں کو بیعت کا مترادف خیال کیا جاتا ہے، صرف چند خاص امراء مصاحبین اور پیشوائے ملک ضرور ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت کرتے ہیں یہ انتہائی خصوصیت کی نشانی ہے۔

خلافت، فقہا۔ فلاسفہ اور اہلِ اخلاق کے زاویہ نگاہ سے

عباسیہ کے دورِ انحطاط (۲۳۲ھ تا ۶۵۶ھ) سے خلافت، فقہاء کے فکر و نظر کا موضوع بنی، اس وقت خلیفہ بسترِ سیاست پر دم توڑ رہا تھا اور نظم و نسق میں اس کا کوئی دخل نہ تھا، فقہاء اور مورخینِ اسلام نے خلافت پر نظری اور عملی دونوں پہلوؤں سے بحث کی ہے۔

ابوریحان بیرونی (۴۴۰ھ - ۱۰۴۸ء) نے اپنے عہد کے خلیفہ کی حالت کا خاکہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔ صرف وہ مذہبی اجارہ دار رہ گیا ہے ورنہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔[۵۱]

خلافت کے مسئلہ پر ایک اور فقیہ ابوالحسن علی ماوردی[۵۲] (۴۵۰ھ - ۱۰۵۸ء) نے بھی بحث کی ہے۔ ماوردی خلیفہ عباسی طائع باللہ کے عہد (۳۶۳-۳۸۱ھ = ۹۷۳-۹۹۱ء) میں پیدا ہوا، اور خلیفہ قائم باللہ کے عہد (۴۲۲ - ۴۶۷ھ = ۱۰۳۱ - ۱۰۵۷ء) میں وفات پائی، اس فقیہ نے خلافت پر صرف نظری حیثیت سے نظر ڈالی ہے ماوردی کے نقطۂ نظر سے خلافت کا طریقہ انتخابی ہونا چاہیئے، اس کے خیال میں یہ منصبِ جلیل ہر اس شخص کو سونپا جا سکتا ہے جس میں اس کی پوری صلاحیت موجود ہو، وہ نسلی امتیازات بے معنی خیال کرتا ہے۔

ماوردی نے حضرت ابوبکرؓ سے لے کر اپنے زمانہ تک، تاریخ خلافت اور بیعت کا جائزہ لیا ہے اور اس کی روشنی میں خلافت کی شرطیں، خلیفہ کے مذہبی، اماراتی، عدالتی اور جنگی فرائض اور اختیارات بیان کئے ہیں۔ ماوردی کی رائے میں خلفاءِ راشدین کی بیعت

---

[۵۱] کتاب الآثار الباقیہ (لندن ۱۸۷۹ء) [۵۲] الاحکام السلطانیہ۔ قاہرہ ۱۲۹۶ء (ص ۸ - ۱۲)

شرعی زاویہ نگاہ سے صحیح تھی۔ اس فقیہ نے اپنے عہد کے سیاسی حالات سے تجاہل برتا ہے۔ غالباً حالات کی نزاکت اس کی تحقیق کے بار کی متحمل نہ تھی۔

بیرونی اور ماوردی کے بعد نظامی عروضی نے خلافت کے موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے ان کے نقطۂ نظر سے خلیفہ تمام امت میں ہر پہلو سے بہتر ہو، اس کے نائب اور گورنر ہوں جو صوبوں میں قائم مقام کی حیثیت سے حکمراں ہوں۔" [۱]

دوسرے ممتاز فقہاء اسلام جنھوں نے خلافت پر روشنی ڈالی ہے ابن حزم (۴۵۶ - ۶۴ء) بدرالدین بن جماعہ۔ اور شہرستانی (۵۴۸ھ - ۱۱۵۳ء) ہیں۔ شہرستانی نے خلافت کے بارے میں مختلف فرقوں کا زاویہ نگاہ پیش کیا ہے اور خلفاء اول کی امامت پر سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

خلافت کے موضوع پر بلند پایہ مورخ، فقیہ اور اجتماعیات کے ماہر علامہ ابن خلدون (۸۰۸ھ = ۱۳۸۲ء) نے بھی بحث کی ہے۔ سب سے پہلے اس نے انسانی اجتماع، رجحانات اور خصوصیات کا جائزہ لیا ہے اور مذہبی فرماں رواؤں کو انسانی فلاح و بہبود کا سرچشمہ ثابت کیا ہے ابن خلدون نے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ اسلامی شریعت نے اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کی ہے۔ اور اس کے آئین و قوانین نوعِ انسانی کی عالمگیر بہبودی کے حامل ہیں، تمہید میں اس نے نہایت وضاحت سے ذکر کیا ہے کہ دنیا و آخرت میں ایک محکم رشتہ ہے دنیا "کشت گاہ" اور آخرت جزا و سزا کا مقام ہے۔ دوسرے الفاظ میں دنیا، دین کے لئے میدانِ عمل ہے۔ بحث و نظر کی اس منزل پر اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مذہبی حکومت و خلافت دنیا کی تمام انواعِ حکومت سے بہتر ہے، یہ نوعِ انسانی کی عالمگیر دنیاوی اور اخروی سعادت کی حامل ہے۔ اس کے خیال میں خلافت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نمایندگی کا نام ہے اور خلیفہ کی شخصیت آپ کے جانشین کی حیثیت سے مذہبی اور سیاسی فرماں روائی کی حامل ہے

[۱] الفصل فی الملل والاہواء والنحل۔ قاہرہ ۱۳۱۷ھ ج ۴ ص ۱۶۳۔

اور ناموسِ دین کا تحفظ اور شرعی حدود کا نفاذ اس کا فرض ہوتا ہے۔ اس کی رائے میں خلافت ہر باعصبیت خاندان کے فرد کا حق ہے، خواہ وہ کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ خلافت کی عہد بہ عہد کی تاریخ کا جائزہ لینے کے بعد ابن خلدون نے بیان کیا ہے کہ آغازِ خلافت سے یوں صدہا تبدیلیاں اس کے نظام میں پیدا ہوئیں مگر یہ تعمیم ہمیشہ قائم رہی اور خلافت کا حق کسی خاص خاندان میں محصور نہ رہا۔

خلافت، ان فلاسفہ اور علمائے اخلاق کے فکر و نظر کا بھی موضوع رہی، جو یونان کے علوم و فلسفہ سے بہت متاثر تھے، خصوصاً جن پر ارسطو اور افلاطون کے فلسفیانہ خیالات کا نہایت گہرا اثر تھا۔ ان میں معلم ثانی ابو نصر فارابی (م ۳۳۹ھ) افلاطون کی جمہوریت[۵۱] (Republic) سے سب سے زیادہ متاثر تھا۔ اس نے اپنی کتاب آرا اہل المدینۃ الفاضلہ میں ایک مستقل باب "القول فی العضوی الرئیس" کے عنوان سے لکھا ہے۔[۵۲]

"اخوان الصفا" نے بھی فلسفیانہ زاویۂ نگاہ سے خلافت پر نظر ڈالی ہے۔ ان حکما کا نظریہ ہے "سلاطین زمین پر خدا کے خلیفہ ہیں" ان کی فرماں روائی کا مقصد دین کا تحفظ ہے اس "حکمت کدہ" میں نظام الدین، وزیر ملک شاہ سلجوقی نمایاں درجہ رکھتا ہے، اس نے "سیاست نامہ" میں نظام حکومت اور اربابِ حکومت پر تفصیل سے بحث کی ہے، یہ کتاب

---

۵۱ افلاطون نے اپنی کتاب "جمہوریت" میں بہترین مملکت اسے قرار دیا ہے جس کا اقتدارِ اعلیٰ فلاسفہ کے ہاتھ میں ہو۔

۵۲ دیکھو ص ۸۰ - ۹۰ نیز دیکھو ابو نصر فارابی کی سیاست پر وہ مقالہ جو ۱۹۱۱ء کے مجلہ مشرق میں الاب شیخو الیسوعی کے قلم سے نکلا تھا۔ ص ۱۸ - ۳۴۔

Sherwani, Al-Farabi's Political Theories Studie in the History of Islamic Political Philosophy, No.? (Aligarh. 1938)

Siyasat Nawab Traite-de-Government, Texte-(ed-Charles Schefer) Paris, 1897.

(۴۸۵ھ=۱۰۹۲ء) کی تصنیف ہے، حضرت شہاب الدین سہروردی (۵۸۷ھ=۱۱۹۱ء) نے بھی "حکمۃ الاشراق" میں اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ آپ افلاطون کی کتاب جمہوریت سے بے حد متاثر تھے، شیعہ فلاسفر نصیر الدین طوسی نے[۵۱] "اخلاقِ ناصری" میں افلاطون اور ارسطو کی طرح بادشاہ کے "خداداد فرماں روائی کے حق" کی تائید کی ہے۔ اس کے زاویۂ نگاہ سے بادشاہ کی حکومت کا محور خداوندی ارادہ ہے، اس لئے بادشاہ کے احکامات میں چون وچرا کی گنجائش نہیں ہوتی ہے! یہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اسی شیعہ فلاسفر نے ہلاکو خان کو خلافتِ عباسیہ کی بربادی کے لئے آمادہ کیا تھا۔

عہدِ جدید میں، خلافت کا مسئلہ مستشرقین کے بحث و نظر کا بھی موضوع بنا ہے، ان میں اے، متز (A. Metz)[۵۲] جے، گولڈ زیہر (J.Gold.Zher.)[۵۳] اور سر ٹامس آرنلڈ (Sir Thomus Arnold.)[۵۴] نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

---

۵۱ T.W.Arnold, The Calip rate, P.P. 121–126.

۵۲ A. Metz. Die Renaissance deo Islam (Heidelherg, 1922. P.P. 7–13,
trans. into English by Khuda Bakhsh and Margolion (London 1937) P.P. 8–14.

۵۳ J. Gold Zher,
Vorlesungen Ender den Islam, 2nd ed. (Heidelberg, 1910) Trans. into French by Felix Arim (Paris, 1920) Under the litle "Le Dogneet laloi de 1, Islam"

۵۴ Sir Thomas Arnold,
The Caliphate (Oxford. 1924.)

(ب) خلافتِ راشدہ

(۱۱ - ۴۰ ھ = ۶۳۲ - ۶۶۱ء)

بیعتِ سقیفہ | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے۔ مقصد یہ تھا کہ باہمی مشورہ سے انصار میں سے آپ کا ایک جانشین منتخب کرلیں۔ اس وقت بیماری کی حالت میں سعد بن عبادہؓ بنی خزرج کے سردار نے اپنی تقریر کے دوران میں فرمایا:۔ انصار

"انصار کے لوگو! اسلام میں اعزاز و وقار کے لحاظ سے عرب کا کوئی قبیلہ تمہارا ہمسر نہیں ہے۔ تمہیں اولیت کا شرف حاصل ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دس برس سے زیادہ اپنی قوم میں رہ کر خدا کی عبادت اور شرک و کفر کو ترک کرنے کی ہدایت فرماتے رہے۔ مگر وہاں صرف چند آدمی مسلمان ہوسکے۔ جو اس قابل بھی نہ تھے کہ دشمنوں سے آپ کی حفاظت کرسکیں۔ وہ خود اپنی حفاظت نہیں کرسکتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت اور دین کو سربلند کرنا تو بڑی بات ہے۔ جب خدا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ورود کا شرف مدینہ کو بخشا تو تم نے آپ کی حمایت کی۔ آپ کے دشمنوں سے جہاد کیا۔ تمہاری تلواروں نے بڑے بڑے سرکشوں کے سر خدا کے سامنے سرنگوں کردیئے۔ آج اسی کا نتیجہ ہے کہ جزیرہ عرب کے چپہ چپہ میں اسلام کی فرمانروائی ہے۔ وصال کے وقت آپ تمہارے ہاں قیام فرما تھے اور تم سے بہت خوش تھے۔ ان باتوں کے بعد اگر میں یہ کہوں کہ تم لوگ آپ کے جانشین بننے کے اوروں سے زیادہ مستحق ہو تو بیجا نہ ہوگا۔"

حضرت عمرؓ کو اس اجتماع کی خبر ہوئی تو فوراً وہاں پہنچے۔ آپ کے ہمراہ حضرت ابوبکرؓ

اور حضرت ابوعبیدہ ابن جراحؓ بھی تھے۔ اس اجتماع میں حضرت ابوبکرؓ نے کھڑے ہو کر ایک تقریر کی، جس میں مہاجرین کی حیثیت اور ان کے استحقاقِ خلافت کے دلائل تھے۔ اس میں آپ نے انصار کے فضائل اور اسلام میں ان کی امتیازی حیثیت کی بھی صراحت کی۔ آپ نے اللہ کی حمد و ثناء، عرب کی گذشتہ حالت اور شرک و بت پرستی کی برائی کے بعد فرمایا۔

"عربوں کے لئے یہ دشوار تھا کہ اپنے آبا و اجداد کا دین ترک کر دیں، لیکن آپ کی قوم میں خدا نے مہاجرین اولین کو یہ شرف بخشا کہ انھوں نے آپ کی تصدیق کی، ایمان لائے، غمخواری کی، اپنی قوم کی جانب سے صبر آزما مصیبتیں جھیلیں۔

اور لوگوں کی مخالفتوں اور گالیوں کو برداشت کیا اور اپنی قلت تعداد لوگوں کے بغض و نفرت اور اپنی قوم کی مخالفت و عداوت کی پرواہ نہ کی۔ سب سے پہلے سرزمین عرب پر خدا کی عبادت۔ مہاجرین اولین نے کی جو آپ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے بعد مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ خلافت کا سب سے زیادہ مستحق مہاجرین اولین کا گروہ ہے۔ اس باب میں غیر منصفوں کے سوا ہر قدم پر جھگڑا ہوگا۔ انصار کے لوگو! دین میں تمہاری قدر و منزلت اور ایمان میں تمہاری سبقت کا ہم سب کو اعتراف ہے۔ خدا نے اپنے رسول اور دین کے حامیوں (انصار) کی حیثیت سے تمہارا انتخاب کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہارے ہاں ہجرت کا حکم دیا اور آپ کی اور مہاجرین کی اکثر بیویاں تمہارے ہی خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہمارے دل میں مہاجرین اولین کے بعد سب سے زیادہ تمہاری قدر و منزلت ہے۔ ہماری حیثیت امراء کی اور تمہاری حیثیت وزراء کی ہوگی۔ ہم بغیر تمہارے مشورہ کے کوئی امر طے نہیں کریں گے۔"

اس تقریر کے بعد ایک انصاری حباب بن منذر کھڑے ہوئے اور انصار سے خطاب کرتے ہوئے کہا، اچھا ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک مہاجرین میں سے ہو لیکن

حضرت عمرؓ نے مخالفت کی اور قریش کے استحقاق خلافت پر دلائل پیش کئے، آپ نے فرمایا "بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایک زمانے میں دو امیر جمع ہوں! لہٰذا عرب کبھی یہ گوارا نہ کریں گے کہ تمہارے محکوم ہوں، درانحالیکہ ان کا نبی دوسرے قبیلہ سے ہو۔ ہاں! عرب اس قبیلہ کی اطاعت اور حکومت تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہ کریں گے جس میں سے نبی ہو۔ یہ دلیل ہمارے پاس اتنی زبردست ہے کہ کسی کو مجال انکار نہیں ہو سکتی۔ ہم آپ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ہم سے زیادہ آپ کی جانشینی کا حق دار کون ہو سکتا ہے۔ اس سے انکار ایک ہٹ دھرم ہی کر سکتا ہے۔" [۱]

بحث و مباحثہ کی اس منزل پر بنی خزرج، سعد بن عبادہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے آمادہ دکھائی دیئے۔ اوس نے ان کی مخالفت کی۔ انھیں یہ گوارہ نہ ہوا کہ ہمارے رقیب کو حکومت حاصل ہو جائے۔ اس وقت اوس مہاجرین کے ہم آہنگ ہو گئے۔

حضرت عمرؓ کی چشم بیدار نے یہ موقع غنیمت دیکھا اور کھڑے ہو کر حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اور پُرجوش الفاظ میں کہا "ابو بکر! کیا آنحضرتؐ نے آپ کو اپنے بجائے نماز پڑھانے کا حکم نہیں دیا تھا۔ ہم آپ سے بیعت کرتے ہیں۔ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہیں۔ آپ سے بیعت کرنا آنحضرتؐ کے محبوب ترین شخص سے بیعت کرنا ہے" [۲]

مہاجرین، بنی اوس اور دوسرے انصار نے آپ کا ساتھ دیا اور یکے بعد دیگرے بیعت کرنے لگے۔ حضرت عمرؓ فرماتے تھے:۔

"یہ وقت ہماری زندگی میں سب سے سخت اور صبر آزما تھا۔ ہمیں خطرہ تھا کہ ہمارا ساتھ اگر قوم نے نہ دیا اور ہمارے بیعت کرنے کی وجہ سے فوراً دوسری بیعت شروع ہو گئی۔ اس وقت ہمیں یا تو اس خلاف طبع کام پر رضامند ہونا پڑے گا یا مخالفت کرنا پڑے گی جس کا نتیجہ فتنہ و فساد ہو گا۔" [۳]

---

[۱] طبری ج ۳ ص ۲۰۷-۲۰۹۔ [۲] ابن ہشام ج ۳ ص ۳۶۴-۳۰۲۔ [۳] طبری ج ۳ ص ۲۰۱۔

حضرت عمرؓ کے بعد ابو عبیدہؓ، بشیر بن سعد نے آپ کی تقلید کی، اس کے بعد مہاجرین اور انصار نے بھی یکے بعد دیگرے بیعت شروع کر دی۔

یہ بیعت "بیعتِ خاصہ" کے نام سے موسوم ہے۔ اس دن صرف ان چند مسلمانوں نے بیعت کی تھی جو سقیفہ میں موجود تھے۔ دوسرے روز مسجد میں حضرت ابوبکرؓ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور تمام لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اسے "بیعتِ عامہ" کہا جاتا ہے۔

حضرت علیؓ اور ان کے ہم خیال دوسرے بنی ہاشم نے حضرت ابوبکرؓ کی اس وقت بیعت نہیں کی تھی کیونکہ وہ خود اپنے آپ کو خلافت کا سب سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے[1]

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی بنیاد جمہوریت کے اصول پر قائم تھی۔ اس کا رواج عرب میں اسلام سے قبل موجود تھا۔ عہد جدید میں جمہوریت کے اس نظام کو (Patriarchal State) "شیخ قبیلہ کی حکومت" کہا جا سکتا ہے۔ اس نظام میں انتخاب کی بنیاد سن و سال اور امتیازی خصوصیات قرار دیا جاتا تھا۔ سر ٹامس آرنلڈ کے الفاظ میں حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب میں ان صفات کا لحاظ کیا گیا تھا جو شیخ قبیلہ کے انتخاب کے وقت لازمی خیال کی جاتی تھیں۔ سچ پوچھئے تو یہ انتخاب عربوں کے نظریہ انتخاب کی حقیقی روح کا حامل تھا۔[2]

حضرت علیؓ اور ان کے حامیوں نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے گریز کیا تھا۔ ان میں سے قابلِ ذکر حضرت عباسؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ تھے۔ ان لوگوں کا حضرت علیؓ کے ساتھ اتحاد تھا۔ پھر حضرت فاطمہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کا مطالبہ کیا تھا جس کا جواب خلافت کی طرف سے نفی میں دیا گیا تھا۔ یہ سب امور ایسے جمع ہو گئے تھے جنہوں نے امتِ مسلمہ کو دو فرقوں، سنیوں اور شیعوں میں تقسیم کر دیا تھا۔[3]

حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنی ایک تقریر میں اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ اور

۱؎ [illegible] ۲؎ The Caliphate P.20 ۳؎ [illegible] مطبوعہ یورپ

ان کے ساتھی حضرت فاطمہؓ کے مکان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں لگے ہوئے تھے اس لئے وہ سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع میں ہمارے ساتھ شریک نہ ہوسکے تو وقت نازک تھا اور فوری قطعی فیصلہ کے بغیر کوئی چارہ کار نہ تھا (اس لئے بغیر ان کے فیصلہ کرلیا گیا)[۱]

حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی امور میں قائم مقامی کی۔ اسی لئے لفظ "خلیفہ" کے مفہوم میں حکومت کے معنی شامل ہوگئے ورنہ کلام پاک میں یہ لفظ ان معنی میں مستعمل نہیں ہوا ہے۔ بیعت کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے ایک مختصر و جامع تقریر کی، اس میں اپنی آئندہ سیاسی حکمتِ عملی کا ان الفاظ میں اعلان کیا۔

"صاحبو! میں تم پر حاکم مقرر کیا گیا ہوں۔ حالانکہ تم لوگوں میں سب سے بہتر نہیں ہوں اگر میں فلاح و بہبود کے کام کروں تو میری امداد کرنا ورنہ اصلاح کردینا۔ صدق و سچائی اپنا دیانتدارانہ فرض خیال کروں گا۔ کذب و دروغ منصبی خیانت تصور کروں گا۔ تم میں سے کمزور میرے نزدیک طاقتور ہوگا۔ ظالم سے اس کا حق دلاکر رہوں گا تم میں سے طاقتور میرے نزدیک کمزور ہوگا۔ انشاء اللہ مظلوم کا حق اس سے دلاؤں گا۔ دیکھو! تم میں سے کوئی جہاد ترک نہ کرے۔ جس قوم نے اس سے اجتناب کیا وہ دنیا میں اپنی عزت قائم نہیں رکھ سکتی۔ میں خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کروں تو میری اطاعت کرو۔ لیکن جب خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت ضروری نہیں"[۲]

حضرت ابوبکرؓ کا دور خلافت سنہ ۱۱ھ / ۶۳۲ء سے شروع ہوا سنہ ۱۳ھ / ۶۳۴ء پر ختم ہوا ہے۔

بیعتِ عمرؓ حضرت ابوبکرؓ جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور اپنی زندگی کی طرف سے ان کو مایوسی ہوئی تو انھیں خطرہ پیدا ہوا کہ اگر خلافت کا انتظام اپنی زندگی میں کسی ایسے

[۱] دیکھئے پورا خطبہ سیرۃ ابن ہشام ج ۳ ص ۷۴۔ طبری ج ۳ ص ۲۰۰۔ [۲] دیکھو ابن ہشام ج ۳ ص ۳۴۳ طبری ج ۴

شخص کے سپرد نہ کر دیا جو مسلمانوں کی شیرازہ بندی کر سکے، تو ممکن ہے کہ پھر آپس میں پہلے کی طرح اختلاف پیدا ہو اور بیرونی دشمن اس موقع سے فائدہ اٹھائیں۔ آپ کی دور بیں نظر نے ایسے شخص کی جستجو شروع کی جو اسلامی ریاست کے نظم و نسق کو صحیح معنی میں سنبھال سکے۔ اور مسلمانوں کو اپنی فہم و فراست اور بیدار مغزی سے باہمی اختلافات سے بچالے۔ آپ کی نظر میں اس منصب کے لئے ایسا شخص موزوں تھا جو سخت ہو مگر سنگ دل نہ ہو، نرم دل ہو مگر بزدل نہ ہو۔ اس وقت آپ کی نگاہ انتخاب حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ پر پڑی۔ ان دونوں میں مابہ الامتیاز خصوصیت یہ تھی کہ حضرت عمرؓ کسی کام کا عزم کر لیتے پھر اگر انھیں یقین ہو جاتا کہ یہ مصلحت وقت کے خلاف ہے تو اپنا عزم فسخ کر دیتے تھے یہ ان کی نفسیاتی خصوصیت تھی۔ حضرت علیؓ کی فطرت تھی کہ جب وہ کسی کام کا بیڑا اٹھا لیتے تو اسے کر کے ہی دم لیتے، انھیں کوئی چیز ارادہ سے باز نہ رکھ سکتی تھی۔ اس لئے حضرت ابوبکرؓ کی فہم و فراست نے حضرت عمرؓ کو ترجیح دی[۱]۔

حضرت ابوبکرؓ کی فکر و نظر کی کاوشوں نے حضرت عمرؓ کا انتخاب ضرور کیا مگر آپ نے اپنی انفرادی رائے سے انکا تقرر مناسب نہ سمجھا اور ممتاز اور صاحب الرائے صحابہؓ سے مشورہ لیا۔ سب نے آپ کی رائے کی تحسین کی اور حضرت عمرؓ کی بے حد تعریف کی۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا " وہ سب سے افضل ہیں۔ ان سے بہتر امت میں کوئی نہیں ہے۔ ہاں ان میں تھوڑی سی سخت مزاجی ضرور ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مجھے نرم مزاج دیکھتے ہیں اگر انھیں خلافت کا بار سنبھالنا پڑا تو اپنے مزاج کو اعتدال پر خود قائم کر لیں گے۔

حضرت عثمانؓ سے مشورہ لیا گیا تو فرمایا جہاں تک میں جانتا ہوں ان کا باطن ان کے ظاہر سے بہتر ہے۔ ان جیسا ہم میں ایک بھی نہیں ہے۔ اسید بن حضیر سے دریافت کیا گیا

توجواب دیا "آپ کے بعد میں ان کو سب سے بہتر سمجھتا ہوں، ان کا باطن ظاہر سے بہتر ہے۔ اس منصب کے لئے ان سے زیادہ موزوں اور کوئی نہیں ہے۔ ان صحابہ کے سوا حضرت ابوبکرؓ نے سعید بن زیدؓ، قاضی مصر اور دوسرے مہاجرین اور انصار سے بھی مشورہ کیا۔ سب نے حضرت عمرؓ کی تعریف کی اور انھیں اس منصب کا اہل بتایا۔

اس مشورہ کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عثمانؓ کو بلا کر حضرت عمرؓ کے بارے میں یہ تحریر لکھوا دی۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - میں نے عمرؓ کو تمہارا حاکم مقرر کیا ہے۔ اگر انھوں نے عدل وانصاف اور فلاح وبہبودی کے کام کئے تو میرا خیال ان کے بارے میں غلط نہیں نکلا۔ اگر ظلم واستبداد کے مرتکب ہوئے تو میں بے قصور ہوں، مجھے غیب کا علم نہیں ہے۔ میں نے ظاہری حالت پر اعتبار کر لیا ہے۔ خدا جانتا ہے میری نیت اچھی ہے۔"

حضرت ابوبکرؓ کی حالت جب زیادہ خراب ہوئی تو مکان سے باہر تشریف لائے اور لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا "کیا تم عمرؓ کی خلافت کے بارے میں میرے ہمنوا ہو، میں نے انتہائی غور وخوض کے بعد ان کا انتخاب کیا ہے۔ یہ منصب میں نے اپنے کسی عزیز کے سپرد نہیں کیا۔ کیا میں امید کروں کہ تم ان کی پوری اطاعت کرو گے؟ سب نے یک آواز ہو کر کہا "ہم ان کی کامل اطاعت کریں گے"۔[1]

اس کے بعد حضرت عمرؓ کو آپ نے بلایا اور انھیں بہت سی نصیحتیں کیں۔ جب حضرت عمرؓ چلے گئے تو آپ نے ہاتھ اٹھا کر خدا سے التجا کی "خدایا! اس سے میری نیت امت کی فلاح وبہبودی کی ہے۔ میں نے فتنہ سے ڈر کر انھیں حاکم مقرر کر دیا ہے تو واقف ہے۔ میں نے انتہائی غور وخوض کے بعد اپنے خیال میں سب سے بہتر سب سے طاقتور اور سب سے زیادہ

۱۔ طبری ج ۴ ص ۵۱۔

رشد و ہدایت کے دلدادہ فرد کو ان کا خلیفہ منتخب کیا ہے۔ میں اب موت کی گھڑیاں گن رہا ہوں۔ امت کو تیرے سپرد کرتا ہوں، وہ تیرے بندے ہیں، ان کی جان و آبرو تیرے اختیار میں ہے۔ ان کے حاکم فلاح و بہبودی کے کام کریں اور صراطِ مستقیم پر قائم رہیں۔ عمر کے وسیلے سے امت کو سربلند کر اور اس کی اصلاح فرما۔"

حضرت عمرؓ کی بیعت کی رسم جب ختم ہوئی تو آپ منبر پر کھڑے ہوئے اور فرمایا:۔

"میں تم سے چند باتیں کرنی چاہتا ہوں۔ اس وقت عربوں کی مثال ایک نکیل پڑے ہوئے اونٹ کی ہے جو بے چون و چرا اپنے قائد کا اتباع کرتا ہے۔ قائد کو اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ کہاں لے جا رہا ہے۔ ربِ کعبہ کی قسم میں انھیں صراطِ مستقیم پر لے چلوں گا۔"[1]

حضرت ابوبکرؓ کی انتخابی کاروائی کا جائزہ لینے کے بعد یہ بیان کرنے کی احتیاج نہیں رہتی کہ یہ منصبِ خلافتِ راشدہ میں موروثی نہ تھا بلکہ جمہوری تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس سیاسی عہدے کو اپنے کسی صاحبزادے یا عزیز کو نہ بخشا، پھر انتخاب میں اپنی رائے کو پیش پیش نہ رکھا، بلکہ مسلمانوں کے مشورہ کے بعد ایک ایسی ہستی کا انتخاب کیا جسے رائے عامہ احترام و محبت کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور وہ نہایت بلند سیرت اور پاکیزہ صفات کا حامل انسان تھا۔

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت کی مدت سنہ ۱۳ھ / ۶۳۴ء تا ۲۳ھ / ۶۴۴ء ہے۔

شوریٰ کا واقعہ یا بیعتِ عثمانؓ

حضرت عمرؓ جب زخمی ہوئے تو چند ممتاز صحابہؓ ان کے پاس آئے اور کہا "امیر المومنین! مناسب ہو تو اپنا جانشین کسی کو مقرر فرما دیجئے۔" آپ نے متاسفانہ لہجہ میں جواب دیا "کسے جانشین بناؤں؟ اگر ابوعبیدہ بن جراحؓ آج زندہ ہوتے تو انھیں اپنا جانشین بنا دیتا۔ خدا کو میں یہ جواب دے سکتا تھا کہ تیرے رسول کے اس قول پر اعتماد کیا تھا۔ ابوعبیدہؓ امتِ مسلمہ کے امین ہیں۔ اگر ابوحذیفہؓ کے غلام سالم زندہ ہوتے تو انھیں جانشین مقرر کر دیتا۔ اگر مجھ سے خدا کے یہاں جواب طلب ہوتا تو میں یہ جواب دیتا کہ میں نے

[1] طبری ج ۳ ص [illegible] و ابن اثیر ج ۲ ص ۱۸

سکتا تھا کہ تیرے رسول نے فرمایا تھا "سالم" خدا سے بے حد محبت کرنے والے ہیں"۔ اس وقت ایک شخص نے درمیان میں دخل دیا "عبد اللہ بن عمرؓ کو مقرر کر دیجئے" آپ کو یہ بے حد ناگوار گذرا اور فرمایا:۔

"اس کا تو مجھے کبھی وہم تک نہیں ہوا ہے۔ مجھے اقرار ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے جو مجھ سے بہتر تھے اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہم دونوں سے بہتر تھے اپنا خلیفہ مقرر نہیں کیا تھا۔ تم جاؤ! خدا اپنے دین کی حفاظت خود کرے گا۔ اسے برباد نہیں ہونے دیگا"

صحابہؓ کو خطرہ ہوا کہ کہیں آپ خلیفہ مقرر کرنے سے قبل ہی دنیا کو خیرباد نہ کہدیں۔ اس ڈر سے دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا "امیر المومنین اگر اسی حالت میں آپ ہم سے بچھڑ گئے؟" آپ نے جواب دیا:۔

"اچھا ان لوگوں میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کر لینا جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخری وقت تک خوش رہے۔ اور ان کے بارے میں فرمایا تھا کہ "وہ جنتی ہیں" میرا اشارہ حضرت علیؓ، عثمانؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، عبد الرحمن بن عوفؓ، زبیر بن عوامؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھانجے) طلحہ بن عبید اللہؓ اور عبد اللہ بن عمرؓ کی طرف ہے۔ لیکن عبد اللہ بن عمرؓ کو خلافت سے کوئی واسطہ نہ ہوگا، یہ صرف مشورہ میں شریک ہوں گے۔ اتفاق سے اگر امیدواروں کے ووٹ برابر ہوں تو اس پارٹی کے امیدوار کو خلیفہ بنا لینا جس میں عبد اللہ بن عمرؓ شامل ہوں۔

آخر میں آپ نے فرمایا:۔

"جب تم اپنا حاکم بنا لو تو اس کی پشت پناہی کرنا اور اس کی امداد میں کبھی دریغ نہ کرنا"۔ [۵۱]

[۵۱] طبری ج ۵ ص ۳۴ و ابن اثیر ج ۳ ص ۵۷۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو خطاب فرمایا اور کہا "تم ممتاز اور سربرآوردہ لوگ ہو، خلافت کے لئے نظر تمہیں پر پڑے گی۔ وفات کے وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تم سے خوش تھے، اگر تم راہِ مستقیم سے نہ ڈگمگائے تو مجھے جمہور کی جانب سے کوئی اندیشہ نہیں لیکن میں تمہارے باہمی اختلاف کے اندیشہ سے مطمئن نہیں ہوں، تمہارا باہمی اختلاف مسلمانوں کو خانہ جنگی میں مبتلا کر دے گا، اچھا اب جاؤ اور حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں ان کی اجازت سے داخل ہو اور وہاں مشورہ کر کے اپنا حاکم منتخب کر لو۔"

یہ صحابہؓ حضرت عمرؓ کے قریب ہی جا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں تلخ کلامی کی نوبت آ گئی اور زور زور سے بات چیت شروع ہو گئی۔ حضرت عمرؓ نے یہ کراں سے کہا "خدا کے لئے اس قسم کی باتوں سے تم احتراز کرو، میرے مرنے کے بعد تین دن کے اندر اندر مشورہ کر کے خلیفہ ضرور منتخب کر لینا، صہیبؓ اس اثنا میں نماز کی امامت کریں۔ مشیر کی حیثیت سے عبداللہ بن عمرؓ کو بھی شریک کر لینا مگر خلافت کا عہدہ انہیں نہ دینا، طلحہؓ اگر تین دن کے اندر اندر مدینہ آ جائیں تو انہیں خلافت کا امیدوار بنا لینا لیکن اگر وہ تین دن کے اندر اندر نہ آئیں تو ان کا انتظار نہ کرنا اور فیصلہ کر لینا، طلحہؓ کے بارے میں .... تم میں ضمانت کون لیتا ہے؟" سعد بن ابی وقاصؓ نے جواب میں عرض کیا "میں ضامن ہوں، بسر و چشم آپ کے حکم کی تعمیل کی جائیگی" حضرت عمرؓ نے جواب دیا "مجھے بھی امید ہے" مقداد بن اسودؓ سے خطاب کر کے فرمایا "جب تم مجھے قبر میں اتار چکو تو ایک مکان میں ان لوگوں کے اجتماع کا انتظام کرنا تاکہ یہ اپنا حاکم منتخب کر لیں" صہیب سے فرمایا "تین روز تک نماز میں امامت کرنا اور علیؓ، عثمانؓ، زبیرؓ، سعدؓ، عبدالرحمن بن عوفؓ اور طلحہؓ کو اگر وہ اس وقت تک مدینہ آ جائیں، مجلس شوریٰ میں شرکت کے لئے جمع کرنا، تمہارے ذمہ ہے، عبداللہ بن عمرؓ کو بھی شریک کرنا ... تم ننگی تلواریں لے کر کھڑے ہو جانا، اگر ایک شخص کی پانچ شخص تائید کریں اور ایک شخص مخالف ہو تو اس کی گردن اڑا دینا، اگر چار شخص متفق ہوں اور دو مخالف ہوں تب بھی ان دونوں کی گردن اڑا دینا

اگر تین موافق اور تین مخالف ہوں تو عبداللہ بن عمرؓ کو ثالث بنا لینا جس کے بارے میں وہ فیصلہ کر دیں اسے حاکم منتخب کر لینا، اگر ان کے فیصلہ کو تسلیم کرنے سے لوگوں کو انکار ہو تو اس پارٹی میں شامل ہو جاؤ جس میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ ہوں اور بقیہ ان تمام لوگوں کی گردن اڑا دو جو اکثریت کے فیصلہ کے مخالف ہوں۔"[1]

حضرت عمرؓ کی تدفین کے بعد یہ صحابہؓ مشورہ کے لئے جمع ہوئے اور بحث و تمحیص میں تین روز گذر گئے، مگر جانشین کا انتخاب عمل میں نہ آسکا یہ حالت دیکھکر حضرت عبدالرحمٰنؓ نے کہا "تم میں سے کون کون شخص اس خیال سے خلافت کی امیدواری سے دست بردار ہوتا ہے کہ یہ منصب مجھ سے بہتر شخص کے سپرد کیا جائے"[2]

اس کا کسی نے جواب نہ دیا اور سب خاموش رہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے فرمایا "میں سب سے پہلے اپنا نام واپس لیتا ہوں۔ حضرت عثمانؓ نے کہا میں بھی آپ کی اقتدا کرتا ہوں اور اپنا نام واپس لیتا ہوں، میں نے آپ کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو "زمین و آسمان میں امین" کہتے ہوئے سُنا ہے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ کے نامزد کئے ہوئے دوسرے حضرات نے بھی حضرت عثمانؓ کی طرح اپنے اپنے نام واپس لے لئے مگر حضرت علیؓ خاموش رہے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ان سے کہا ابوالحسن! تمہارا کیا خیال ہے؟ جواب دیا "مجھے اس کا یقین دلا دو کہ حق و انصاف کے لئے ایثار کرو گے، نفسانی خواہشات کی پابندی نہ کرو گے اور امتِ مسلمہ کے حق کو نظر انداز کر کے رشتہ داروں کے ساتھ کسی خصوصیت کو روا نہ رکھو گے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا "تم لوگ مجھ سے اس بات کا وعدہ کرو کہ جس شخص کو میں تمہارا خلیفہ بنا دوں، تم اس کی خلافت تسلیم کر لو گے اور جو شخص میرے اس فیصلہ سے انحراف کرے تم اس کی مخالفت کرو گے اور میرا ساتھ دو گے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں اس بات کا وعدہ کرتا ہوں کہ میں مسلمانوں کے حقوق کو نظر انداز نہ کروں گا۔ اور اپنے رشتہ داروں کے ساتھ کسی قسم کی خصوصیت کو روا نہ

---

[1] طبری ج ۵ ص ۳۴ و ۳۵ - [2] ایضاً ج ۵ ص ۳۵ و ۳۶

رکھوں گا" اس سوال و جواب کے بعد . . . . حضرت عبدالرحمٰنؓ نے
ان تمام حضرات سے وعدہ لیا اور خود ان سے اسی قسم کا وعدہ کیا۔

اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ صحابہؓ اور ممتاز افراد سے جانشینی کے بارے میں مشورہ میں مصروف ہو گئے، حضرت علیؓ سے فرمایا "تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت داری، اسلامی خدمات اور اولین مسلمانوں کی صف میں داخل ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو خلافت کا سب سے زیادہ مستحق خیال کرتے ہو اور یہ بے جا بھی نہیں ہے۔ لیکن فرض کرو، تم سے قطع نظر کر لی جائے تو اس منصب کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ فرمایا "عثمانؓ" اس کے بعد خلوت میں حضرت عثمانؓ سے گفتگو کی انھوں نے بھی یہی جواب دیا اور حضرت علیؓ کا نام لیا۔ حضرت زبیرؓ سے تنہائی میں مشورہ لیا تو انھوں نے بھی ان ہی دونوں حضرات کا نام لیا۔

یہ واقعہ اس کا شاہد ہے کہ خلافت کے استحقاق کے بارے میں صحابہؓ کا خیال ان ہی دونوں حضرات تک محدود تھا!

جب حضرت عمرؓ کی مقرر کی ہوئی تین روز کی مدت ختم ہوئی تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ جو شبانہ روز ان ایام میں لوگوں کے خیالات اور ان سے مشورہ لینے میں مشغول رہے تھے صبح کی نماز کے وقت مسجد میں تشریف لائے یہاں دوسرے مہاجرین، ممتاز انصار، اور سپہ سالار موجود تھے۔ جب تمام لوگوں کا مسجد میں اجتماع ہو گیا تو حضرت عبدالرحمٰنؓ نے کھڑے ہو کر فرمایا "دوستو! لوگوں کی خواہش ہے کہ اپنے اپنے شہروں کو جانے سے قبل اپنے امیر کو معلوم کر لیں"۔

اس وقت حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کے حامیوں میں اختلاف پیدا ہونے لگا۔ عمار بن یاسرؓ نے کھڑے ہو کر کہا "اگر لوگوں کو اختلاف سے بچانا چاہتے ہو تو علیؓ کی بیعت کرو" مقداد بن اسودؓ نے ان کی پرزور تائید کی۔ جب [illegible] نے کھڑے ہو کر کہا "اگر قریش میں

سے طبری ج ۵ ص [illegible]

پھوٹ ڈالنا نہیں چاہتے ہو تو عثمانؓ سے بیعت کر لو" حضرت عبداللہ بن ابی ربیعہؓ نے ان کی پرزور حمایت کی۔ عمار ابن ابی سرحؓ نے طنزیہ لہجہ میں ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا "تم کب سے اس قابل ہو گئے کہ مسلمانوں کو پند و نصیحت کرو؟"

اس پر بنی ہاشم اور بنی امیہ میں تو تو میں میں شروع ہو گئی، عمارؓ نے کھڑے ہو کر کہا "لوگو! خدا نے ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دین کی وجہ سے عزت دی، یہ انصاف کے خلاف ہے کہ اس منصب کو آپ کے گھرانے سے کسی دوسرے خاندان کی طرف منتقل کیا جائے" سعد بن ابی وقاصؓ نے کہا "عبدالرحمٰن! لوگوں کے فتنہ و فساد میں مبتلا ہونے سے پہلے اس کام سے فارغ ہو جاؤ" عبدالرحمٰنؓ نے کہا "میں خود بھی اس معاملہ پر غور و خوض کر چکا ہوں اور دوسروں سے بھی مشورہ لے چکا ہوں مگر مجھے کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ کیا کیا جائے؟" اس کے بعد حضرت علیؓ کو بلا کر کہا "تم حلف اٹھاؤ کہ قرآن و حدیث اور ابو بکرؓ و عمرؓ کے نقش قدم پر چلو گے! حضرت علیؓ نے جواب دیا مجھے امید ہے میں ایسا کروں گا لیکن اپنے مبلغ علم اور استطاعت کو بھی نظر انداز نہیں کروں گا"

پھر حضرت عثمانؓ کو بلایا اور ان کے سامنے وہی الفاظ دہرا دیئے جو حضرت علیؓ سے کہے تھے۔ آپ نے غیر مشروط طریقہ پر اس کا وعدہ کیا تو ان سے بیعت کر لی اور ان کے بعد اور لوگوں نے بھی بیعت شروع کر دی اور حضرت عثمانؓ کا انتخاب عمل میں آگیا۔

حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ یا دوسرے الفاظ میں بنی ہاشم اور بنی امیہ کے دلوں میں اسی وقت سے گرہ پڑ گئی کیونکہ خلافت کا استحقاق اب انھیں دو خاندانوں میں منحصر ہو گیا تھا، ممکن تھا حضرت علیؓ کا انتخاب اسی وقت عمل میں آجاتا۔ جب حضرت عبدالرحمٰنؓ نے ان سے دریافت کیا تھا تم وعدہ کرو کہ ابوبکرؓ و عمرؓ کے نقش قدم پر چلو گے اس کا جواب حضرت علیؓ نے مشروط دیا تھا کہ میں اپنے مبلغ علم پر بھی عمل کروں گا، یہ سن کر حضرت عبدالرحمٰن نے حضرت عثمانؓ کے سامنے جب یہی سوال دہرایا تو انھوں نے بہ طیب خاطر و بلا شرط

اس کا وعدہ کیا، اس بنا پر یہ منصب جلیل انھیں تفویض کر دیا گیا یہ آخر ذی الحجہ ۲۳ھ کا واقعہ ہے۔

حضرت عثمانؓ کے انتخاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان دو پارٹیوں، بنی امیہ اور بنی ہاشم میں تقسیم ہو گئے۔ حضرت علیؓ بنی ہاشم میں اپنی دینی خدمات، قربانیوں، حضرت فاطمہؓ کے شوہر اور اولین مسلمانوں میں داخل ہونے کی وجہ سے سب سے ممتاز تھے۔

حضرت عثمانؓ نے بیعت خلافت کے بعد ایک تقریر کی اس میں فرمایا۔

"دنیا کی زندگی ناپائیدار ہے، اپنی موت سے قبل جہاں تک ممکن ہو سکے بھلے کام کرو . . . . دنیا دھوکہ کا نام ہے۔ تمہیں دنیاوی زندگی دھوکہ نہ دے۔ خدا سے غافل نہ کر دے، گذشتہ واقعات سے عبرت حاصل کرو اور عمل خیر میں جد و جہد کرو، تم سے کوئی کوتاہی نہ ہو کہ تمہارا پیدا کرنے والا تمہارے اعمال سے غافل نہیں، ارباب دنیا نے مدت تک دنیا میں جوتا بویا، فائدہ اٹھایا اس سے تم ناواقف نہیں ہو، مگر نتیجہ کیا! آخر مر گئے، میں دنیا کو اسی نظر سے دیکھتا ہوں جس طرح سے خدا نے اس کی تمثیل بیان کی" اور فرمایا" (اے پیغمبر!)

انھیں دنیاوی زندگی کی مثال سنا دو۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے زمین کی روئیدگی کا معاملہ) آسمان سے ہم نے پانی برسایا اور زمین کی روئیدگی اس سے مل جل کر ابھر آئی (اور خوب پھلی پھولی) پھر (کیا ہوا؟ یہ کہ) سب کچھ سوکھ کر چورا چورا ہو گیا ہوا کے جھونکے اسے اڑا کے منتشر کر رہے ہیں!! اور کون سی بات ہے جس کے کرنے پر خدا قادر نہیں۔ مال و دولت اور آل اولاد دنیوی زندگی کی دلفریبیاں ہیں (مگر چند روزہ اور ناپائیدار) اور جو نیکیاں باقی رہنے والی ہیں تو وہی تمہارے پروردگار کے نزدیک بہ اعتبار ثواب کے بہتر ہیں۔ اور وہی ہیں جن کے نتائج سے بہتر امید رکھی جا سکتی ہے[1]

اس کے بعد لوگوں نے آپ سے بیعت شروع کی[2]

---

[1] سورۂ کہف آیت ۴۵۔ [2] طبری ج ۵ ص ۳۰۔

یہ خطبہ حضرت عثمان رض کی سیاسی پالیسی پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا ہے۔ یہ چند نصیحتیں ہیں جن کا تعلق دین سے ہے، سیاست سے نہیں۔ مستقبل میں بھی حضرت عثمان رض نے کوئی ایسی سیاسی پالیسی اختیار نہیں کی جو عالم اسلامی کو مطمئن کر سکے، اس کی وجہ ان کی ضعیف العمری تھی، ان کی فطری نرم دلی، حد سے زیادہ دینداری اور ضرورت سے زیادہ اسلاف پرستی اور تازیانہ کی کمی تھی۔ [1]

حضرت عثمان رض خلافت کے منصب پر فائز ضرور ہو گئے مگر نظم و نسق سنبھال نہ سکے۔ بیرونی ممالک اسلامیہ کے باشندوں کو دربارِ خلافت سے تکلیفیں پہنچیں، اندرون ملک کے بہت سے مہاجرین اور انصار اس بنا پر غضب آلود تھے کہ مجلس شوریٰ میں انھیں شریک کیا گیا مگر ان کی حیثیت عضو معطل سے زیادہ نہ تھی۔ مزید براں حضرت عثمان رض نے بعض ان لوگوں کو جو عمر اور صلاحیت دونوں میں ممتاز اور با اثر انصار و مہاجرین سے کمتر تھے محض اپنے رشتہ دار ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے عہدے دے دیئے تھے۔ یہ مواد بڑھتا رہا اور ایک دن اس شکل میں پھٹا کہ بصرہ اور مصر کا ایک مشتعل گروہ مدینہ پہنچا اور حضرت عثمان رض سے خلافت سے دست بردار ہونے کا مطالبہ کیا، انھوں نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا "میں اس لباس کو جسے خدا نے پہنایا اتارنے کو تیار نہیں ہوں" اس جواب پر اس گروہ نے ان کے گھر کا پوری طرح سے محاصرہ کر لیا اور انھیں شہید کر دیا۔

حضرت عثمان رض تقویٰ و پرہیزگاری، حلم و بردباری، نرم خوئی اور تواضع میں ممتاز تھے لیکن عالم اسلامی پر حکومت کرنے کے لئے غیر موزوں تھے۔ یہ وہ وقت تھا، جب دولتِ اسلامیہ کا دائرہ حکومت غیر معمولی طور سے وسیع ہو گیا تھا۔ مسلمانوں کے پاس مال و دولت کے انبار لگ گئے تھے۔ ان کی نفسانی خواہشات اور حرص و ہوا میں روز افزوں ترقی تھی۔ اس وقت اگر خلافت ان کی کمزور سیاسی حکمت عملی کی بھینٹ چڑھ گئی تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ پالیسی اس زمانہ کی ہم آہنگ نہ تھی۔

---

[1] تاریخ الاسلام السیاسی ج ۱ ص ۳۴۳۔

سنہ ۲۳ھ / سنہ ۶۴۴ء میں حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے اور سنہ ۳۵ھ / سنہ ۶۵۶ء میں جامِ شہادت نوش فرمایا۔

بیعتِ علیؓ

حضرت علیؓ کا خیال تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد میں مسلمانوں میں سب سے زیادہ خلافت کا مستحق ہوں، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے، آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کے شوہر تھے، بچوں میں سب سے پہلے مسلمان تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اہم مسائل میں ان سے مشورہ لیتے تھے۔ حضرت عمرؓ ان کے مشورہ کے بغیر کوئی اہم کام نہیں کرتے تھے اور ان کی ذکاوت، مذہبی معلومات اور تفقہ کے بے حد معترف تھے۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد مجلسِ شوریٰ کے افراد میں حضرت علیؓ بھی داخل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ خلافت کا منصب مجھے تفویض کیا جائے گا۔ لیکن جب حضرت عثمانؓ خلیفہ منتخب کر لئے گئے تو حضرت علیؓ نے بھی ان کی بیعت کر لی تھی۔ حضرت عثمانؓ کے ابتدائی دورِ خلافت میں وہ ان کے مشیر کار رہے اور حضرت عثمانؓ اکثر امور انہیں کے مشورہ سے انجام دیتے تھے[۱]۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد کچھ . . . . لوگوں کا رجحان تھا کہ حضرت علیؓ کو خلیفہ بنایا جائے اس وقت صحابہؓ کی اکثریت مختلف ملکوں میں منتشر تھی۔ مدینہ میں صرف چند افراد موجود تھے۔ یہ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے زیر اثر تھے۔ بعض صحابہ مثلاً سعد بن ابی وقاصؓ اور عبداللہ بن عمرؓ کو حضرت علیؓ کی بیعت میں تامل تھا۔ بعض انصار بھی ان کے ہم آہنگ تھے، یہ انصار حضرت عثمانؓ کے ہمدرد تھے، مغیرہ بن شعبہؓ اس صورتِ حالات کو دیکھ کر شام چلے گئے تھے۔ اس ماحول میں حضرت علیؓ کی بیعت عمل میں آئی۔ اگرچہ بنی امیہ اور مدینہ میں مقیم چند دوسرے صحابہؓ نے مخالفت کی تھی بعد میں یہ مخالفین مصلحتِ وقت کو دیکھ کر کچھ شام کو روانہ ہو گئے۔ کچھ مکہ چلے گئے[۲]۔

حضرت علیؓ نے بیعت کے بعد فوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے عہد کی تجدید کا قصد کیا اور وقت کی نبض پہچانے بغیر اسے عملی جامہ پہنانے کا بیڑا اٹھایا،

[۱] مروج الذہب مسعودی ج ۲ ص ۲۔ [۲] Nicholson, P.191.

ان کی روایات پر عمل درآمد شروع کردیا اور بلا تامل حضرت عثمانؓ کے گورنروں کی معزولی کا حکم جاری کردیا۔ ان کے چند ہمدرد صحابہ نے سمجھایا کہ حالات پُر سکون پیدا ہونے تک اس ارادہ کو ملتوی کردیجئے مگر آپ نے ان کے مشورہ پر عمل نہیں کیا۔ نکلسن کے الفاظ میں " یہ سیاسی شعور اور پختہ کاری کے خلاف تھا" لہ

ان معزولیوں سے گورنر غیظ و غضب سے دانت پیسنے لگے لیکن تعمیل کے سوا چارہ کار بھی نہ تھا۔ صرف حضرت امیر معاویہؓ نے آپ کے حکم کی تعمیل سے صاف انکار کردیا تھا۔ ان کے پاس زبردست فوج موجود تھی جس کے مصارف میں مصر و شام کی دولت کی فراوانی کی وجہ سے انھیں کوئی دقت نہ ہوتی تھی اس فوج کے اعتماد پر انھوں نے اس معزولی کے فرمان کو ماننے سے انکار کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا، حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ میں جنگ چھڑ گئی اور تحکیم (ثالث بنانا) کی شکل میں دونوں کا تصفیہ ہوا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد حضرت علیؓ شہید کردیئے گئے اور امیر معاویہؓ کو خلافت کا منصب حاصل ہوگیا اور انھوں نے دولت بنی امیہ کی بنیاد ڈالی!۔

حضرت علیؓ کی خلافت کی ابتداء ۳۵ھ سنہ ۶۵۶ء سے ہوئی اور ۴۰ھ سنہ ۶۶۱ء میں آپ کی شہادت کا الم انگیز واقعہ پیش آیا۔

خلافت راشدہ کے طریقۂ انتخاب پر ایک تنقیدی نظر

خلفائے راشدین کے انتخاب کی اگرچہ کوئی متعین و منظم شکل نہ تھی۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وراثتی نظام سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ان کی بیعت میں شوریٰ کا دخل تھا جس کی تعمیر میں عربی روح کارفرما تھی اگر یہ کہا جائے کہ حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب سے ایسا کوئی طریقہ کار نہیں ملتا ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ لوگ اپنے اپنے امیدوار کو انتخاب کے لئے نامزد کرسکتے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ انصار نے حضرت سعد بن عبادہؓ کے بارے میں تحریک پیش کی تھی اور حضرت ابوبکرؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ اور حضرت عمرؓ کے نام پیش کئے تھے، لیکن حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت میں

لہ Nicholson. P. 191.

عجلت سے کام لیا اور حاضرین نے بھی ان کے ساتھ ہی بیعت کرلی تھی۔ اس کے بعد عام مسلمانوں نے بھی ان کی بیعت کرلی تھی۔

حضرت عمرؓ کا قول ہے "میرے کانوں تک یہ بات پہنچی ہے کہ اگر عمرؓ کا انتقال ہوگیا تو میں فلاں شخص کی بیعت کرلوں گا، دیکھو کسی ایسے شخص کی بات سے دھوکہ نہ کھانا جو یہ کہتا ہو کہ ابوبکرؓ کی بیعت ...... عجلت میں ہوگئی تھی اس لئے اس میں کوئی حرج نہیں ہے اس سے انکار نہیں کہ .. ایسا ہوا تھا مگر خدا نے اس کے شر سے امت کو بچا لیا تھا۔ اب ابوبکرؓ جیسا تم میں کوئی موجود نہیں ہے جو ہوشیار امیر البحر کی طرح امت کی کشتی کو بچا لیجائے"[۱]

حضرت ابوبکرؓ کی بیعت میں نظام شوریٰ کا دخل تھا۔ اس میں صحابہ کا اجتماع ہوا تھا اور تبادلہ خیالات اور اسباب ترجیح پر نقد و تبصرہ بھی ہوا تھا، یہ اعتراض مہمل ہے کہ اس انتخاب کے لئے باقاعدہ اجتماع کا اعلان نہیں کیا گیا تھا اور اس میں مہاجرین کی اکثریت موجود نہ تھی، ان لوگوں کو غالباً اس کا علم نہیں کہ صحابہؓ کی اکثریت اس انتخاب میں شریک تھی، اس سے بحث نہیں کہ انصار تھے یا مہاجرین، یہ تفریق بے سود ہے۔ یہ اعتراض جدید مورخوں نے خاص طور سے کیا ہے۔ اعتراض کے وقت شاید انھیں خیال نہیں رہا کہ وہ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کے واقعات کو اس زمانہ کے ماحول پر منطبق کر رہے ہیں جس کی حیثیت قیاس مع الفارق سے زیادہ نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ کا انتخاب بھی جمہوری اصول پر ہوا تھا، اس کو ولایت عہد یا خود مملکت کی جانب سے تعیین و نامزدگی کے نام سے تعبیر نہیں کرسکتے ہیں، حضرت ابوبکرؓ نے اپنی رائے میں کسی قسم کی خودسری و مطلق العنانی سے کام نہیں لیا تھا ورنہ جمہور کو حضرت عمرؓ کی خلافت تسلیم کرنے پر مجبور کیا تھا بلکہ اپنا فیصلہ صحابہؓ کے مشورہ سے کیا تھا، تمام صحابہؓ نے ان کی رائے سے اتفاق کیا تھا اور تحسین کی تھی، لیکن حضرت ابوبکرؓ کا یہ طریقہ کار لائحہ عمل نہیں بنایا جاسکتا ہے،

---

[۱] طبری ج ۲ ص ۲۰۰۔

یہ طرزِ عمل خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ گو اس طریقہ کی شکل توریث کی نہیں بلکہ شوریٰ کی ہے تاہم اس صورت میں خلیفہ اپنے جانشین کے انتخاب میں بڑی حد تک آزاد ہے، وہ کسی قید و شرط کا پابند نہیں ہے، یہ ممکن ہے کہ خلیفہ اپنے انتخاب میں غلطی کرے یا حسنِ ظن سے کام لیکر غیر مستحق کو ولی عہد مقرر کردے، یہ حسن اتفاق تھا ورنہ ہر خلیفہ ابوبکرؓ نہیں ہے اور ہر ولی عہد عمرؓ نہیں ہے اس طریقہ کار میں کم سے کم انتخاب میں غلطی کا احتمال ضرور ہے۔

حضرت عثمانؓ کا انتخاب حضرت عمرؓ کے انتخاب کے مقابلہ میں نظام شوریٰ سے بہت زیادہ قریب ہے۔ اس انتخاب کے وقت خلافت کے امیدوار متعدد تھے اور مسجدِ نبوی میں مسلمانوں کی اجتماعی مجلس کا انتخاب میں بڑا دخل تھا۔

حضرت علیؓ کی بیعت بھی نظام جمہوری پر مبنی تھی۔ ان سے اہلِ مدینہ نے بیعت کر لی تھی اور ان کا انتخاب ہو گیا تھا یہ صحیح ہے، جمہور مسلمانوں نے ان سے بیعت نہیں کی تھی مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اکثریت نے بیعت کرلی تھی۔ اس اعتراض کا جواب "ان سے صرف اہلِ مدینہ نے بیعت کرلی تھی اور دوسرے اسلامی مرکزوں کے مسلمانوں سے کوئی رائے نہیں لی گئی تھی"، یہ دیا جاسکتا ہے کہ امام مالکؒ کے نزدیک اہلِ مدینہ کی رائے خلافت کے انتخاب میں کافی ہے حضرت علیؓ کا انتخاب پچھلے خلفاء سے کچھ مختلف تھا، حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب ان صحابہؓ کی مرضی سے ہوا تھا جو مدینہ میں موجود تھے، اگرچہ ابتداء میں آپس میں اختلاف پیدا ہوا تھا حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد خلافت کے بارے میں کوئی اختلاف . . . . . پیدا نہیں ہوا۔ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اس کا فیصلہ کردیا تھا اور حضرت عمرؓ کو خلیفہ مقرر کردیا تھا۔ حضرت عمرؓ کا انتقال ہوا تو حضرت عثمانؓ کا انتخاب اس طریقہ شوریٰ کے مطابق ہوا جو حضرت عمرؓ نے مقرر کردیا تھا۔

خلفائے راشدین کی سیاسی زندگی کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے انھیں مطلق فرمانروائی حاصل تھی، ان کے اختیارات و فرائض کسی دستور میں تفصیل و وضاحت کے ساتھ لکھے ہوئے نہ تھے

لیکن ان کے اقتدار و اختیار کی غیر تفصیلی و اجمالی حد بندی ضرور تھی اور وہ یہ کہ فرائض کی بنیاد شریعت اور امت کی رضامندی پر قائم تھی وہ ان حدود سے تجاوز نہیں کرتا تھا۔ اگر وہ اس کا مرتکب ہوتا تو اس کی فرمانروائی و خلافت کا حق باطل ہو جاتا اور جن ممتاز افراد نے اسے خلیفہ بنایا تھا وہ اسے معزول کر سکتے تھے۔

تاریخ گواہ ہے خلفاء اربعہ نے حدودِ شرع میں رہ کر حکومت کے فرائض انجام دیئے ہیں، ان کی فرمانروائی کی بنیاد شرعی دستورِ حکومت تھا اور وہ اس سے سرمو انحراف نہیں کرتے تھے، ان میں سے صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ان کے دشمنوں نے یہ الزام لگانے کی کوشش کی ہے کہ آپ نے عزیز و اقارب کے ساتھ مراعات کر رکھی تھیں، مال و دولت ان پر لٹاتے تھے اور عدل و انصاف نہیں کرتے تھے۔

خلافت راشدہ کا جائزہ لینے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ صحیح خلافت، جو تمام شرط اور قدیم روایات عرب کی حامل ہو، مجموعی حیثیت سے صرف خلفاء اربعہ کے عہد میں پائی جاتی تھی۔

خلافتِ بنی امیہ

(۴۰ھ ۱۳۲ھ = ۶۶۱ء ۷۵۰ء)

خلفاء بنی امیہ:-

سنہ ۴۰ھ	معاویہ بن ابی سفیان	سنہ ۶۶۱ء
سنہ ۶۰ھ	یزید اوّل	سنہ ۶۸۰ء
سنہ ۶۴ھ	معاویہ ثانی	سنہ ۶۸۳ء
سنہ ۶۴ھ	مروان بن حکم	سنہ ۶۸۳ء
سنہ ۶۵ھ	عبدالملک بن مروان	سنہ ۶۸۵ء
سنہ ۸۶ھ	ولید	سنہ ۷۰۵ء
سنہ ۹۶ھ	سلیمان	سنہ ۷۱۵ء
سنہ ۹۹ھ	عمر بن عبدالعزیز رحمہ	سنہ ۷۱۷ء
سنہ ۱۰۱ھ	یزید ثانی	سنہ ۷۲۰ء
سنہ ۱۰۵ھ	ہشام	سنہ ۷۲۴ء
سنہ ۱۲۵ھ	ولید ثانی	سنہ ۷۴۳ء
سنہ ۱۲۶ھ	یزید ثالث	سنہ ۷۴۴ء
سنہ ۱۲۶ھ	ابراہیم	سنہ ۷۴۴ء
سنہ ۱۲۷ تا سنہ ۱۳۲ھ	مروان ثانی	سنہ ۷۴۴ء تا سنہ ۷۵۰ء

خلافتِ بنی امیہ کی خصوصیات

خلافتِ راشدہ کے خاتمہ کے بعد زمامِ خلافت بنی امیہ کے ہاتھ میں آگئی اور اس وقت سے خلافت حکومت کی شکل میں تبدیل ہوگئی، امویوں کے کے ہیبت وجلال سے جزیرۂ عرب لرز اٹھا۔ اس سیاسی ماحول میں مسلمانوں کا ایک مذہبی طبقہ بنی امیہ کا آلۂ کار بن گیا۔ اور وہ احادیث کی بنیاد پر یہ ذہنیت پیدا کرتا تھا کہ "حکومتِ وقت کی اطاعت فرض ہے خواہ اس کا نظم ونسق اور دستورِ حکومت کچھ بھی ہو ان کا بیان تھا" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

"عنقریب میرے بعد ظالم اور جابر لوگوں کی حکومت ہوگی۔ دیکھو! تم حق بات میں ان کی باتیں سننا اور اطاعت کرنا اگر وہ بھلائی کریں تو ان کا اور تمہارا دونوں کا بھلا ہے، اگر بدسلوکی کریں تو خدا تمہیں جزا دے گا اور انہیں اس کی سزا بھگتنی پڑیگی۔"

امیر معاویہؓ نے جس سیاسی نظام کا خاکہ بنایا تھا اس میں بنیادی چیز یہ تھی کہ خلیفہ کی ایک مستقل شخصیت ہے۔ گذشتہ روایات کا وہ حد سے زیادہ پابند نہ ہو۔ اس کی پالیسی مصلحتِ وقت اور زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی رہنی چاہیئے، اسے موروثی چیزوں کو اسی حد تک اختیار کرنا چاہیئے جس حد تک وقت کی مصلحتیں اجازت دیں۔

امیر معاویہؓ نے خلافتِ راشدہ کا وہ نظامِ سیاسی ختم کردیا تھا جس کی بنیاد شورٰی اور مذہبی اصول پر قائم تھی۔ اس کی جگہ موروثی نظام کی داغ بیل ڈالی جس میں سیاسی مصلحتوں کے سامنے مذہبی اصول ثانوی درجہ رکھتے تھے، حقیقت یہ ہے امیر معاویہؓ اپنے غیر معمولی سیاسی شعور، فہم وفراست اور وسیع النظری کی وجہ سے اس سیاسی پالیسی میں کامیاب ہوئے تھے ان کے جانشین بھی عالمِ اسلامی پر اس حکمتِ عملی کے زیرِ اثر حکومت کرتے رہے۔

خلافتِ بنی امیہ میں مذہب سے زیادہ سیاست کا پاس کیا جاتا تھا۔ سیاست کے مقابلہ میں مذہب کی ثانوی حیثیت تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی تھی[1]

---

[1] Sir Thomas Arnold, The Calaiphat. P.P. 24.25

امیر معاویہ نے قیصر و کسریٰ کے دربار کے کروفر قائم کر رکھے تھے وہ تختِ شاہی پر جلوہ فرما ہوتے تھے، حفاظت کے لئے پولیس کا انتظام تھا، اس سے قبل خلفاء کی حفاظت کیلئے کوئی خاص انتظام نہ ہوتا تھا۔ امیر معاویہؓ کا دربار ساسانیوں کے دربار کی جیتی جاگتی تصویر تھا آپ نے حضرت علیؓ کے الم انگیز حادثۂ شہادت سے متاثر ہو کر مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے مخصوص حجرہ تعمیر کرایا تھا اور وہاں تنہا نماز پڑھتے تھے۔ جب سجدہ میں جاتے تھے تو محافظ ننگی تلواریں لئے کھڑے رہتے تھے۔ امیر معاویہؓ کی یہ سیاسی پالیسی ان کی غیر معمولی سیاست دانی کا نتیجہ تھی، وہ شامیوں کی ذہنیت اور ان کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے اور جانتے تھے کہ شامی روم و فارس جیسی متمدن حکومتوں کے محکوم رہ چکے ہیں، یہاں حضرت عمرؓ اور ابوبکرؓ کی سادہ اور درویشانہ سیاست سودمند ثابت نہ ہوگی۔

امیر معاویہؓ کے زمانے سے خلافت "موروثی" ہوگئی تھی، آپ کی نظر میں مسلمانوں کی پراگندگی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی "خلیفہ اپنے جانشین کا فیصلہ اپنی زندگی میں نہیں کرتا ہے" اس کے مرنے کے بعد رقیبانہ کشمکش شروع ہو جاتی ہے اور مسلمانوں کی وحدت پارٹیوں میں تقسیم ہو کر پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ اس خیال سے آپ نے اس کا فیصلہ اپنی زندگی ہی میں کر دیا اور اپنے بیٹے یزید کو جانشین مقرر کر دیا تھا۔ اس مسئلہ میں آپ بازنطینی اور ساسانی نظامِ حکومت سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ جن کے یہاں نظامِ حکومت وراثتی تھا اور بادشاہ اپنی زندگی میں ولی عہد مقرر کر دیتا تھا۔ امیر معاویہؓ نے یزید کی ولی عہدی کے لئے اپنی پوری حکمتِ عملی اور سیاسی شعور صرف کر دیا تھا۔ بیعت سے بہت پہلے گورنروں کے نام حکم پہنچا تھا "یزید کی بیعت کے لئے سازگار ماحول پیدا کیا جائے"۔

یزید کی ولی عہدی

امیر معاویہؓ نے یزید کی بیعت کے لئے حالات کو سازگار بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جن سے مخالفت کا کھٹکا تھا، انھیں مقرب بارگاہ بنالیا، بڑے بڑے عہدے دیئے ان سے رواداری برتی اور ان کی کوتاہیوں سے درگذر کی۔ اس حکمتِ عملی کا یہ اثر ہوا کہ اکثریت

ان کی ہمنوا ہوگئی اور لوگ یزید کی بیعت پر آمادہ ہوگئے جب شام و عراق کے باشندوں نے بیعت کرلی تو امیر معاویہؓ یزید کی بیعت لینے مدینہ تشریف لے گئے، وہاں حضرت امام حسینؓ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے مخالفت کی، ابنِ زبیرؓ نے ان سے کہا "ہم تین باتوں کا تمہیں اختیار دیتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو اختیار کرو۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسا کیا ویسا کرو، ابوبکرؓ نے جیسا کیا ویسا کرو، عمرؓ نے جیسا کیا ویسا کرو"

معاویہؓ نے دریافت کیا، انھوں نے کیا کیا؟ جواب دیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات تک کسی کو خلیفہ نہیں بنایا، آپ کے بعد لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ کو اپنی خوشی سے منتخب کرلیا۔ معاویہؓ نے کہا "اب تم میں ابوبکرؓ جیسا کوئی موجود نہیں ہے، مجھے مسلمانوں میں باہمی اختلاف کا اندیشہ ہے" جواب دیا گیا اچھا! جو ابوبکرؓ نے کیا وہی کرو، ابوبکرؓ نے ایک ایسے شخص کو خلافت کا منصب سپرد کیا تھا جو قریش کے خاندان سے ضرور تھا مگر بنی امیہ سے اس کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ ورنہ کم از کم اتنا تو کرو عمرؓ کی طرح چھ اشخاص کی ایک کمیٹی بنادو، ان افراد میں تم بھی عمرؓ کی طرح اس کا خیال رکھو کہ تمہارا کوئی صاحبزادہ یا پوتا اس میں شامل نہ ہو۔

معاویہؓ نے دریافت کیا کہ اس کے سوا کوئی اور شکل نہیں ہے؟ ابنِ زبیرؓ نے جواب دیا نہیں! یہ سن کر امیر معاویہؓ نے جوشِ غضب میں کہا "اب میرے صبر و ضبط کا پیمانہ لبریز ہوچکا۔ خدا کی قسم اگر ایک لفظ بھی کسی کی زبان سے مخالفت کا نکلا تو لفظ ادا ہونے سے قبل اس کی گردن اڑادی جائے گی۔ خیریت اسی میں ہے کہ خاموش رہو۔ اس کے بعد اپنے پولیس افسر کو بلاکر حکم دیا "ان میں سے ہر شخص کے پاس دو دو آدمی ننگی تلواریں لے کر کھڑے ہوجائیں، اگر ایک لفظ بھی مخالفت کا ان کی زبان سے نکلے تو فوراً گردن اڑادی جائے"

پھر ان حضرات کو ہمراہ لے کر مسجد نبوی میں گئے اور منبر پر کھڑے ہوکر اعلان کیا "یہ لوگ (ابن زبیرؓ وغیرہ) مسلمانوں کے سردار اور ممتاز افراد ہیں مسلمانوں میں یہ پختہ کار اور

دانشمند خیال کئے جاتے ہیں اور ان کے مشورہ کے بغیر کوئی اہم کام نہیں کیا جاتا، ان حضرات نے یزید کی بیعت کرلی ہے تم بھی خدا کا نام لیکر بیعت کرلو" یہ سن کر لوگوں نے بیعت کرلی، لوگ انھیں حضرات کی بیعت کے منتظر تھے۔ بعد کو لوگوں نے ان سے دریافت کیا، آپ تو کہتے تھے ہم یزید کی بیعت نہیں کریں گے پھر کیوں کرلی؟ جواب دیا "بخدا ہم نے بیعت نہیں کی" لوگوں نے پوچھا" پھر آپ نے اس وقت تردید نہیں کی"۔ جواب دیا "جان کا خطرہ تھا" [۱]

غرض اس طرح یزید کی بیعت کی تکمیل ہوگئی اور ان حضرات کے ماسوا سب نے بیعت کرلی۔ امیر معاویہؓ نے ان حضرات کے ساتھ نہایت نامناسب رویہ اختیار کیا، آپ نے خلافت کے استحقاق کی شرطوں کو بالکل نظر انداز کردیا اور اس منصب کو موروثی سلطنت میں تبدیل کردیا جس میں شوریٰ اور انتخاب کا کوئی دخل نہ تھا!

امیر معاویہؓ نے اس نظام شوریٰ کو ختم کردیا، جس کی بنیاد پر خلفاء راشدین کا انتخاب ہوا تھا۔ آپ نے خلافت کی جگہ ملوکیت کی بنیاد رکھی جسے تلوار کے بل بوتے سیاسی تدبیروں اور حریفوں کے خلاف ریشہ دوانیوں کے ذریعہ حاصل کیا جاتا تھا۔ امیر معاویہؓ نے جب یزید کو ولی عہد بنایا اس وقت سے وراثت کی ابتدا ہوئی، یہی نظام عہد عباسیہ میں بھی قائم رہا۔ [۲] اس کی وجہ سے مسلمان اپنے طبعی حق یعنی شوریٰ سے محروم ہوگئے۔ یہ وہ حق تھا جس کے عرب خوگر تھے، قرآن نے بھی اس کی حمایت کی تھی، احادیث بھی اس کی تحسین کرتی تھیں۔ ولی عہدی کے سلسلہ میں امویوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا تھا اور اپنی زندگی میں ایک چھوڑ دو دو تین تین ولی عہد مقرر کرنے کی رسم جاری کی!

بنی امیہ کے عہد خلافت کا جائزہ لیتے وقت ان کے زمانہ کے سیاسی ماحول، مقامی خصوصیات اور باشندوں کے ذہنی نشوونما کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ خلافت کے نظام کی تبدیلی میں ان چیزوں کا بہت بڑا دخل تھا۔ خلافت راشدہ میں مدینہ مسلمانوں کا دارالسلطنت رہا۔ اس وقت

[۱] طبری ج ۳ ص ۲۱۷ - ۲۱۸ - [۲] The Calaiphate. P.22 .

عربوں کا عنصر حکومت کی مشینری پر غالب تھا اور خلافت کا نظام عربوں کی خصوصی ذہنیت اور فطرت کے مطابق قائم رہا۔ جب دمشق عربوں کی راجدھانی مقرر ہوئی تو عرب وہاں کے فطری ماحول سے متاثر ہوئے اور نظامِ خلافت بڑی حد تک قیصر و کسریٰ کے نظامِ حکومت کے سانچہ میں ڈھل گیا[۵۱] اور خلیفہ نے زمانہ اور ماحول کے مطابق اپنے اندر بہت سی تبدیلیاں پیدا کرلیں۔

بنی امیہ کے عہد میں یہ معمول رہا کہ خلیفہ اپنی زندگی میں ولی عہد مقرر کر دیتا تھا اور ممتاز افراد اور بڑے بڑے جنرلوں سے اس کی بیعت اپنے سامنے لیتا تھا، عالم اسلامی میں گورنر قائم مقام کی حیثیت سے ولی عہد کے لئے بیعت لیا کرتے۔ بیعت کا طریقہ نظامِ جمہوری اور ملوکیت دونوں کا بیک وقت حامل ہوتا تھا[۵۲] نہ اسے خالص جمہوری کہا جاسکتا ہے اور نہ کامل ملوکیت کا لقب دیا جاسکتا ہے کیونکہ بیعت کی تکمیل ہر طرح سے کی جاتی تھی۔ خوف و دہشت، وعدے وعید اور ترغیب و تحریص غرض ساری تدبیریں عمل میں لائی جاتیں اور کوئی صورت اٹھا نہیں رکھی جاتی تھی۔ اور پھر اس انتخاب کو ہر حال میں شرعی قرار دیا جاتا۔ اس نظام کا یہ اثر ہوا کہ شاہی خاندان میں خلافت کے لئے رقیبانہ کشمکش شروع ہوگئی اور حریف کے مقابلہ میں خلافت کا منصب حاصل کرنے کے لئے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ یہ مرض سپہ سالاروں اور گورنروں تک متعدی ہوگیا تھا۔ حکومتِ بنی امیہ کے زوال کا سب سے بڑا سبب یہی کشاکش ہوئی تھی۔

سید امیر علی کے الفاظ میں "بنی امیہ کے عہد میں مطلق العنان فرمانروائی کے نظریہ پر حکومت کی بنیاد تھی اس میں تقریر کی آزادی تھی جو خانہ بدوش عربوں، علماء اور مذہبی طبقہ کی فطرت میں داخل تھی، تقریر کی اس آزادی کی بنا پر وہ حکومت کے دستور پر احتجاج کرتے تھے اور خلیفہ کے رویہ میں تبدیلی پیدا کرا لیتے تھے۔ یہ آزادئ تقریر انھیں قرآنی نظریہ "حق بات نہ چھپاؤ" نے دے رکھی

---

۵۱ The Calaiphate. P.24.25

۵۲ Amir Ali, A Short History of the Saracens. P.18.

۵۳ Syed Amir Ali, P.P. 405–406. ۵۴ "

تھی اس لئے خلفاء اس آزادی کو ان سے سلب نہیں کر سکتے تھے۔

رجب سنہ ۶۰ھ میں یزید تختِ خلافت پر متمکن ہوا، اس وقت اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ان لوگوں سے بیعت لینے کے احکام جاری کر دیئے جنھوں نے اس کے باپ، امیر معاویہؓ کے عہد میں اس سے انکار کیا تھا، ان لوگوں میں قابلِ ذکر عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، حسین بن علیؓ، عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ، اور عبداللہ بن عباسؓ تھے۔ ان میں سے عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ نے اس کی بیعت کر لی مگر حضرت امام حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بیعت سے انکار کر دیا اور مدینہ سے نکل آئے تھے اس اثناء میں امام حسینؓ کے پاس اہلِ کوفہ کے خطوط آئے جن میں انھیں عراق آنے کی دعوت دی گئی اور ان سے بیعت کرنے کی خواہش کا اظہار کیا گیا، آپ نے ان کی دعوت کو قبول کیا اور کربلا کا روح گداز واقعہ پیش آیا، جس میں آپ کو شہادت نصیب ہوئی، اس شہادت نے شیعیت کے اندر روح پھونک دی اور ان میں مرکزیت پیدا ہو گئی۔ اب تک شیعیت محض ایک سیاسی نظریہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ واقعہ کربلا کے بعد اس نے عملی شکل اختیار کر لی۔ اور بنی امیہ اور علویوں کے درمیان عداوت کی ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی۔

کربلا کے ماتم انگیز واقعہ کے بعد یزید کے حکم سے مسلم بن عقبہ مرّی نے مدینہ منورہ کا "حرّہ" کی جانب سے محاصرہ کر لیا اور فتح کرنے کے تین روز بعد تک عام لوٹ مار کی اجازت دیدی کیونکہ مدینہ والوں نے یزید کی بیعت سے نفرت کا اظہار کیا، اس کے گورنر کو معزول کر دیا اور مدینہ میں مقیم بنی امیہ کو ستایا۔ یہ وہ فردِ جرم ہے جو یزید کی حکومت نے اہلِ مدینہ پر لگائی تھی اس واقعہ کے چند روز بعد یزید کے جنرل حصین بن نمیر نے مکہ کا محاصرہ کر لیا، مقصد، یزید کے خلاف اس شورش کا دبانا قرار دیا گیا جو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اٹھائی تھی۔ یہ بیان کرنے کی شاید حاجت نہیں کہ حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے بعد مکہ میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے خلافت کا دعویٰ کیا تھا۔

معاویہ ثانی یزید کی موت مکہ کے محاصرہ کے زمانہ میں واقع ہوئی۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا معاویہ ثانی اس کا جانشین بنایا گیا جو چالیس روز کے بعد خلافت سے دست بردار ہو گیا۔ اور اس مسئلہ کو جمہور کے فیصلہ پر چھوڑ دیا، اس نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا "انتخاب خلیفہ کا حق صرف تم لوگوں کو حاصل ہے جس کو مناسب سمجھو اپنا خلیفہ بنا لو" اس وقت منبر پر کھڑے ہو کر اس نے حسب ذیل تقریر کی۔

"لوگو میرے دادا امیر معاویہؓ نے اس شخص سے حریفانہ مقابلہ کیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ دار ہونے کی وجہ سے ان سے زیادہ خلافت کا مستحق تھا، میرا اشارہ حضرت علیؓ کی طرف ہے۔ تم جانتے ہو انھوں نے سب کچھ تمہارے بل بوتے پر کیا تھا وہ اپنی راہ گئے اور گناہوں کی گٹھڑی قبر میں ساتھ لے گئے، ان کی موت کے بعد میرے باپ یزید نے خلافت حاصل کی حالانکہ وہ اس کا اہل نہ تھا، اس نے اپنی نفسانی خواہشات پر عمل کیا لیکن موت نے زیادہ دن تک اس کو موقع نہ دیا اور بالآخر وہ بھی اپنے گناہوں کی پوٹری لے کر قبر میں پہنچ گیا"

اس کے بعد اشکبار ہو کر دونوں رخسار آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ تقریر جاری رکھتے ہوئے مزید کہا:۔

"ہمارے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ یہ احساس ہے کہ ان (والد) کا انجام برا ہے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے لوگوں کو شہید کیا۔ حرم میں قتل و خونریزی کی، کعبہ کی بے حرمتی کی اور اسے خراب کیا، میں اس بار خلافت کا متحمل نہیں ہو سکتا، مشورہ کر کے کسی دوسرے کو خلیفہ منتخب کر لو"

خلافت سے دست برداری کے بعد اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور چند روز کے بعد اسی سال اس کا انتقال ہو گیا۔

مروان بن الحکم کا انتخاب معاویہ ثانی کی وفات کے بعد خلافت کے بارے میں شامی عربوں میں نزاع پیدا ہوا۔ قبیلۂ قیس، جو بنی امیہ کی حکومت سے بیزار تھا ضحاک بن قیس فہری کی سرکردگی میں

"مرج راہط" (دمشق میں ایک موضع) کے مقام پر جمع ہوا اور اس نے عبداللہ بن زبیر کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ دوسری طرف قبیلہ کلب "جابیہ" (دمشق میں ایک موضع) کے مقام پر اکٹھا ہوا، ان میں سے ایک فریق کا رجحان خالد بن یزید بن معاویہ کی طرف تھا۔ دوسرا فریق مروان بن حکم بن عاص کی طرف مائل تھا۔ پھر پہلے فریق نے اس خیال سے کہ خالد بن یزید یا دوسرے لفظوں میں ابوسفیان کی شاخ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ عبداللہ بن زبیرؓ کا مقابلہ کر سکے اس لئے سب نے بالاتفاق مروان کے عمر و سن کا لحاظ کر کے اس شرط پر اس کے ہاتھ پر بیعت کرلی کہ اس کے جانشین خالد بن یزید اور عمر بن عاص حسب ترتیب ہوں گے، مروان زیادہ مدت زندہ نہیں رہا، ۶۵ھ میں اس کا انتقال ہوگیا مگر موت سے قبل اس نے خلافت کے لئے اپنے دونوں بیٹوں عبدالملک اور عبدالعزیز کو اپنا جانشین ترتیب وار مقرر کر دیا تھا،

دوسرے الفاظ میں اس نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی تھی جو "جابیہ" کے مقام پر ہوا تھا، جس میں خالد بن یزید اور عمر بن عاص کو علی الترتیب جانشین مقرر کئے جانے کا عہد و پیمان کیا تھا۔

عبدالملک بن مروان | عبدالملک بن مروان کے زمانہ سے بادشاہ کی شان و شوکت اور دربار کے جاہ و جلال کا آغاز ہوا، عبدالملک اور اس کے جانشینوں نے تمام وہ درباری کر و فر اور لوازمات اختیار کئے جو ساسانی بادشاہوں کا طغرۂ امتیاز تھے۔ خلیفہ تخت شاہی پر جلوہ فرما ہوتا تھا دائیں جانب امراء کی نشست ہوتی تھی اور بائیں جانب سلطنت اور شاہی محل کے ممتاز افراد بیٹھتے تھے، سامنے کھڑے ہو کر سلاطین کے سفراء، شعراء، اہل قلم اور فقہاء وغیرہ اپنی اپنی عرضداشتیں پیش کرتے تھے۔ غرض بلاذری کے الفاظ میں

> "عبدالملک بن مروان سب سے پہلا خلیفہ تھا جس نے جاہ و جبروت کے تمام لوازمات اختیار کئے تھے"۔

ولید و سلیمان | عبدالملک کے بعد اس کے بیٹے ولید اور سلیمان خلیفہ ہوئے۔ ولید کی خلافت

کی مدت سنہ ۸۶ھ سنہ ۹۶ھ / سنہ ۷۰۵ء سنہ ۷۱۵ء ہے، سلیمان کا دور خلافت سنہ ۹۶ھ سنہ ۹۹ھ / سنہ ۷۱۵ء۔۷۱۷ء تک قائم رہا، سلیمان کے دور کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ امرا بنی امیہ عیش و عشرت اور لہو ولعب میں سرمست تھے۔

عمر بن عبدالعزیزؒ

سلیمان بن عبدالملک جب بیمار پڑا، تو اس نے اپنے بیٹوں کو جانشین مقرر کرنے کا ارادہ کیا، سالم سدی نے جو اس کا نہایت معتمد امیر تھا، اس ارادہ سے منع کیا اور مشورہ دیا کہ کسی نیک شخص کو خلیفہ مقرر کیجئے۔ سلیمان نے عمر بن عبدالعزیزؒ کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے ان کی بے حد تعریف کی۔ سلیمان نے خلافت کا فرمان عمر بن عبدالعزیزؒ کے نام لکھدیا، اور مہر لگادی۔ یہ واقعہ "دیر سمعان" میں پیش آیا جو حمص کا ایک صوبہ تھا[1]

سلیمان نے اپنے اہل بیت کو بلایا اور کہا اس فرمان میں جس شخص کی خلافت کے بارے میں میں نے تحریر کیا ہے اس کی بیعت کرو، نام نہیں بتایا، سب نے اس حکم کی تعمیل کی اور بیعت کرلی

سلیمان کا جب انتقال ہوگیا، تو سالم سدی نے سلیمان کے خاندان کو جمع کیا اور ان سے وفات کی خبر کو پوشیدہ رکھتے ہوئے کہا "ایک دفعہ اور بیعت کرو" انھوں نے بلا تامل بیعت کرلی، جب اس نے پوری طرح سے اطمینان کرلیا تو سلیمان کی موت کا اعلان کردیا[2]۔ اور سب نے بلا تامل عمر بن عبدالعزیزؒ کی بیعت کرلی، صرف عبدالملک کے دو بیٹوں، سعید اور ہشام نے بیعت نہیں کی تھی۔

یہ مسعودی اور الفخری کی روایت تھی، سیوطی کا بیان ہے "سلیمان کی نظر میں بنی امیہ کے اندر عمر بن عبدالعزیزؒ سے زیادہ خلافت کا اہل کوئی دوسرا نہ تھا۔ اس کی وجہ ان کا زہد و تقویٰ، ناموس دین کا احساس اور عہد و میثاق کی پابندی تھی"۔ ایک خارجی وجہ یہ بھی تھی" ولید نے اپنے بھائی سلیمان کو خلافت سے محروم کردینے اور اپنے بیٹے کو جانشین مقرر کرنے کا ارادہ کیا تھا، حالانکہ عبدالملک نے ولید کے بعد سلیمان کو ولی عہد مقرر کیا تھا، اکثر ممتاز امرا طوعاً و کرہاً

[1] المسعودی مروج الذہب ج ۳ ص ۱۶۷ [2] الفخری ص ۱۱۷۔

اس کے ہم آہنگ بھی ہو گئے تھے۔ اس وقت صرف عمر بن عبدالعزیزؒ کی ذات تھی، جس نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا تھا "ہم نے سلیمان کی بیعت کر رکھی ہے" ولید نے اس جرم میں انھیں محبوس کر دیا تھا۔ اس واقعہ سے سلیمان بے خبر نہ تھا۔ سچ پوچھئے تو حضرت عمرؒ بن عبدالعزیزؒ کی جانشینی سلیمان کی طرف سے اس احسان کا عملی طور سے اعتراف تھا۔

عمر بن عبدالعزیزؒ کا دورِ خلافت ۱۰۱-۹۹ھ یعنی ۷۲۰-۷۱۷ء تک قائم رہا، ان میں اور خلفاء بنی امیہ میں بہت فرق تھا "وہ اس قرن کی عالمگیر مذہبی تاریکی اور گمراہی میں ایک نیر درخشاں تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جبر و استبداد اور خونریزی کا دورہ تھا"[1] سیوطی کی رائے میں "خلفاء صرف تین ہیں ابوبکرؓ، عمرؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ"[2]

مسلمان عمر بن عبدالعزیزؒ کو عدل و انصاف اور زہد و تقویٰ کے اعتبار سے حضرت عمرؓ کا ہم پلہ خیال کرتے ہیں، ان کے اس ہمہ گیر احترام اور ادب کا نتیجہ تھا کہ عباسیوں نے صرف عمر بن عبدالعزیزؒ کی قبر کو چھوڑ دیا تھا اور باقی تمام بنی امیہ کے خلفاء کی قبروں کی بے حرمتی کی تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی صفات، نفسی رجحانات اور سیاسی پالیسی کا وہ خطبہ آئینہ دار ہے جو آپ نے خلیفہ ہونے کے بعد دیا تھا اس میں آپ نے فرمایا تھا:۔

> "لوگو قرآن کے بعد کوئی اور کتاب آسمان سے نہیں نازل ہوگی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اور کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا، میں مقنن نہیں ہوں، صرف قوانین کا نافذ کرنے والا ہوں، میں کسی نئی بات کو رواج نہیں دوں گا مگر اپنے بزرگوں کی تقلید کروں گا۔ میں تم میں سے کسی فرد سے بہتر نہیں ہوں، ہاں! میرے کاندھوں پر بوجھ (بارِ خلافت) ضرور تم سب سے زیادہ ہے۔ یاد رکھو! خدا کی نافرمانی میں بندے کی کوئی بھلائی نہیں ہے۔"

[1] Nishson, Cit. History of Arabs. P. 2. 9.

[2] تاریخ الخلفاء ص ۱۵۳ - ۱۵۲

خلافتِ بنی امیہ کا زوال

حضرت عمر بن عبدالعزیز رح کے بعد عبدالملک کے بیٹے یزید (۱۰۱-۱۰۵ھ / ۷۲۰-۷۲۴ء) اور ہشام (۱۰۵-۱۲۵ھ / ۷۲۴-۷۴۳ء) یکے بعد دیگرے خلیفہ ہوئے۔ یزید لہو ولعب اور عورتوں کے ساتھ دلچسپی لینے میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ ہشام کی فطرت اس کے بالکل برعکس تھی، وہ نہایت دانشمند، بردبار اور پاکباز تھا، حسنِ سیاست اور تدبر کے لحاظ سے اس کی سطح بہت بلند تھی۔ اربابِ بصیرت کا قول ہے، بنی امیہ میں سیاست داں صرف تین ہوئے ہیں، امیر معاویہؓ، عبدالملک، اور ہشام۔ مسعودی کا بیان ہے، منصور عباسی کا دستورِ حکومت اور نظم ونسق ہشام کی سیاست اور لائحہ عمل پر مبنی تھا۔

ہشام بن عبدالملک کے بعد بنی امیہ کی بنیادیں ہلنے لگیں۔ ولید بن یزید (۱۲۵ھ / ۷۴۳ء) عیش ونشاط اور لہو ولعب میں بدمست تھا، یزید ثالث اور ابراہیم کے زمانہ میں بنی امیہ کی بنیادیں اور کھوکھلی ہوگئی تھیں، ابراہیم یزید کی موت کے بعد خلیفہ ضرور تھا مگر اس کی حیثیت کچھ نہ تھی۔ مورخین نے ان الفاظ میں اس کا خاکہ اتارا ہے۔

"بعض لوگ محض خلافت کے لحاظ کی وجہ سے سلام کرلیتے، بعض لوگ امارت کی وجہ سے خوشامدانہ سلام کرلیا کرتے بعض لوگ سلام تک نہ کرتے۔ ان کی نظر میں ان دونوں چیزوں میں سے کسی کی اہمیت نہ تھی"۔ ۱؎

تھوڑی مدت کے بعد اسے مروان بن محمد نے قتل کردیا اور اس کے حامیوں کو عبرتناک سزائیں دیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نزاری اور قحطانی قبائل میں عصبیت کا جذبہ بھڑک اٹھا۔ مروان نے یمنیوں کے مقابلہ میں نزاریوں کے ساتھ اپنا رشتہ مواخاۃ قائم کرلیا اس کی وجہ سے یمنی مروان سے برگشتہ ہوگئے اور انھوں نے دعوتِ عباسیہ کو تقویت پہنچائی۔

دمشق میں مروان بن محمد (۱۲۷-۱۳۲ھ / ۷۴۴-۷۴۹ء) کی بیعت کی رسم ادا ہوئی۔ اس کے عہد میں فتنوں اور شورشوں کا دروازہ کھل گیا اور نہایت آزادی سے شیعہ اپنے خیالات اور عقائد کی تبلیغ کرنے لگے، مہدی کا عقیدہ بھی اسی زمانہ میں ظہور میں آیا جسے بنی امیہ کے زوال میں بہت بڑا دخل ہے

۱؎ الفخری ۱۲۳

الجزیرہ، فلسطین، یمن اور حضر موت میں خوارج بھی کثرت سے پھیل گئے اور بنی امیہ کے خلاف رائے عامہ کو بھڑکانے لگے، ابھی ان مصیبتوں نے دم نہ لیا تھا کہ بنی عباسیہ کی دعوت کا آغاز ہو گیا اس سازش کا انکشاف ایک خط کے ذریعہ ہوا، جو مروان بن محمد کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ یہ خط امام ابراہیم (حضرت عباسؓ کے خاندان کے ایک فرد) نے ابی سلمہ خلال کے نام بھیجا تھا، جو ان کی طرف سے عراق میں عباسیہ کی حکومت کے قیام کے لئے زمین تیار کر رہا تھا۔ مروان نے امام ابراہیم کو قتل کروا دیا۔ ابراہیم نے آخری وقت اپنے خاندان کو "کوفہ" چلے جانے کی وصیت کی اور اپنا جانشین اپنے بھائی ابو العباس اور ابو جعفر کو علی الترتیب مقرر کر دیا۔ عباسیوں نے اپنی دعوت کا مرکز بلادِ خراساں کو بنالیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ بنی امیہ کے مرکزِ خلافت دمشق سے بہت دور تھا دوسرے وہاں کے لوگ خصوصیت کے ساتھ بنی امیہ کے حاکموں سے بیزار تھے اور ان کی غلامی کا جوا اتارنے کے لئے موقع کی تلاش میں تھے۔

ابو مسلم خراسانی نے اپنی سیاست کاری اور غیر معمولی تدبر سے ان ممالک کے قبائلِ عربیہ میں اختلاف پیدا کرا دیا۔ جب اسے یہ اطمینان ہو گیا کہ یہ عرب اب ایک مرکز پر کسی حالت میں جمع نہیں ہو سکتے تو نصر بن سیار پر جو بنی امیہ کا ان بلاد میں حاکم تھا، یورش کر دی اور اسے شکست دی، یہاں سے ابو مسلم نے عراق کا رخ کیا اور کوفہ میں داخل ہو گیا، وہاں اس نے ابو العباس سفاح کی خلافت کا اعلان کر دیا، سفاح نے اپنے چچا عبداللہ بن علی کو مروان بن محمد پر چڑھائی کرنے کے لئے روانہ کیا، مروان سے "زاب" کے مقام پر مقابلہ ہوا، مروان نے میدان چھوڑ دیا، عبداللہ بن علی نے فسطاط تک پیچھا کیا اس جگہ اس نے اپنے بھائی صالح بن علی کو فوج کی کمان سپرد کی، جس نے فیوم کے ایک گاؤں "بوصیر" پر مروان کو قتل کر دیا اور اس کا سر سفاح کے پاس کوفہ بھیج دیا۔ مروان کی شکست کے بعد سیاہ علم (عباسیوں کا جھنڈا) دمشق کے قلعوں پر لہرانے لگا اور بنی امیہ کا آفتاب غروب ہو گیا۔ یہ ۱۳۲ھ کا انقلاب ہے۔

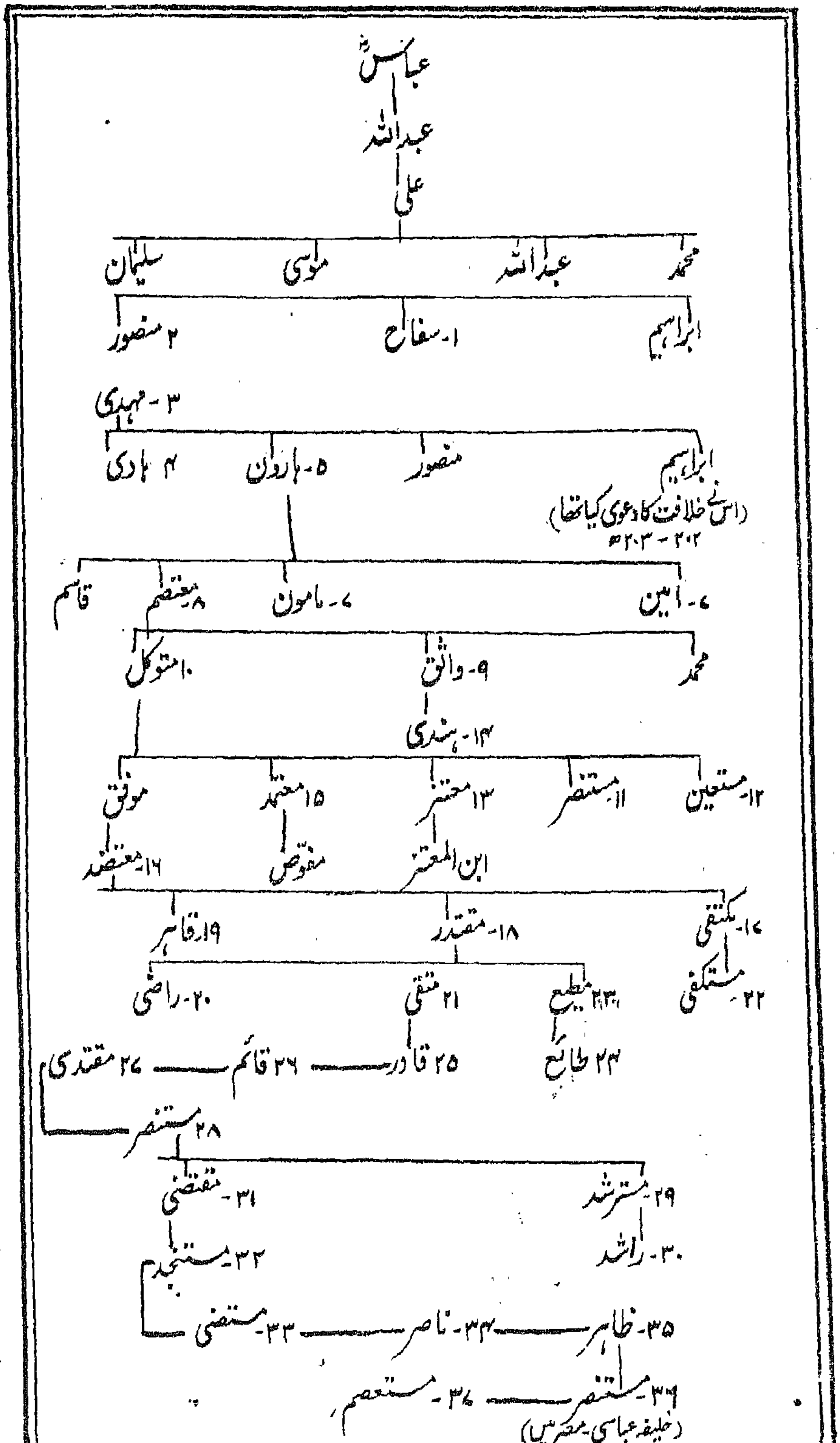
خلافتِ عباسیہ

(۱۳۲—۶۵۶ھ = ۷۵۰—۱۲۵۸ء)

خلفاءِ عباسیہ:-

۱-	۱۳۲ھ	سفاح	۷۵۰ء
۲-	۱۳۶ھ	منصور	۷۵۴ء
۳-	۱۵۸ھ	مہدی	۷۷۵ء
۴	۱۶۹ھ	ہادی	۷۸۵ء
۵	۱۷۰ھ	ہارون رشید	۷۸۶ء
۶-	۱۹۳ھ	امین	۸۰۹ء
۷-	۱۹۸ھ	مامون	۸۱۳ء
۸-	۲۱۸ھ	معتصم	۸۳۳ء
۹-	۲۲۷ھ	واثق	۸۴۲ء
۱۰	۲۳۲ھ	متوکل	۸۴۷ء
۱۱	۲۴۷ھ	منتصر	۸۶۱ء
۱۲	۲۴۸ھ	مستعین	۸۶۲ء
۱۳-	۲۵۲ھ	معتز	۸۶۶ء
۱۴-	۲۵۵ھ	مہتدی	۸۶۹ء
۱۵	۲۵۶ھ	معتمد	۸۷۰ء
۱۶	۲۷۹ھ	معتضد	۸۹۲ء

۱۷-	سنہ ۲۸۹ھ	مکتفی	سنہ ۹۰۲ء
۱۸-	سنہ ۲۹۵ھ	مقتدر	سنہ ۹۰۸ء
۱۹-	سنہ ۳۲۰ھ	قاہر	سنہ ۹۳۲ء
۲۰-	سنہ ۳۲۲ھ	راضی	سنہ ۹۳۴ء
۲۱-	سنہ ۳۲۹ھ	متقی	سنہ ۹۴۰ء
۲۲-	سنہ ۳۳۳ھ	مستکفی	سنہ ۹۴۴ء
۲۳-	سنہ ۳۳۴ھ	مطیع	سنہ ۹۴۶ء
۲۴-	سنہ ۳۶۳ھ	طائع	سنہ ۹۷۴ء
۲۵-	سنہ ۳۸۱ھ	قادر	سنہ ۹۹۱ء
۲۶-	سنہ ۴۲۲ھ	قائم	سنہ ۱۰۳۱ء
۲۷-	سنہ ۴۶۷ھ	مقتدی	سنہ ۱۰۷۵ء
۲۸-	سنہ ۴۸۷ھ	مستظہر	سنہ ۱۰۹۴ء
۲۹-	سنہ ۵۱۲ھ	مسترشد	سنہ ۱۱۱۸ء
۳۰-	سنہ ۵۲۹ھ	راشد	سنہ ۱۱۳۵ء
۳۱-	سنہ ۵۳۰ھ	مقتفی	سنہ ۱۱۳۶ء
۳۲-	سنہ ۵۵۵ھ	مستنجد	سنہ ۱۱۶۱ء
۳۳-	سنہ ۵۶۶ھ	مستضی	سنہ ۱۱۷۰ء
۳۴-	سنہ ۵۷۵ھ	ناصر	سنہ ۱۱۸۰ء
۳۵-	سنہ ۶۲۲ھ	ظاہر	سنہ ۱۲۲۵ء
۳۶-	سنہ ۶۲۳ھ	مستنصر	سنہ ۱۲۲۶ء
۳۷-	سنہ ۶۴۰-۵۶ھ	مستعصم	سنہ ۱۲۴۲-۵۸ء


عباسؓ
عبداللہ
علی
محمد
عبداللہ
موسیٰ
سلیمان
ابراہیم
۱۔ سفاح
۲ منصور
۳۔ مہدی
ابراہیم
(اس نے خلافت کا دعویٰ کیا تھا)
۲۰۲ - ۲۰۳ھ
منصور
۵۔ ہارون
۴ ہادی
۶۔ امین
۷۔ مامون
۸ معتصم
قاسم
محمد
۹۔ واثق
۱۰ متوکل
۱۴۔ مہتدی
۱۲۔ مستعین
۱۱ منتصر
۱۳ معتز
۱۵ معتمد
موفق
ابن المعتز
مفوض
۱۶۔ معتضد
۱۷۔ مکتفی
۱۸۔ مقتدر
۱۹ قاہر
۲۲۔ مستکفی
۲۳ مطیع
۲۱ متقی
۲۰۔ راضی
۲۴ طائع
۲۵ قادر
۲۶ قائم
۲۷ مقتدی
۲۸ مستظہر
۲۹ مسترشد
۳۰۔ راشد
۳۱۔ مقتفی
۳۲ مستنجد
۳۳۔ مستضی
۳۴۔ ناصر
۳۵۔ ظاہر
۳۶ مستنصر
۳۷۔ مستعصم
(خلیفہ عباسی مصر میں)

خلافتِ عباسیہ کے امتیازات	پہلے بیان کیا گیا ہے کہ بنی امیہ کا آفتاب حکومت ۱۳۲ھ ۷۵۰ء میں "زاب" کے معرکہ میں غروب ہوگیا اور بنی عباسیہ کا دور شروع ہوا۔

"بنی عباسیہ نے نہایت شان وشکوہ کے ساتھ پانچ صدیوں تک فرمانروائی کی، ۱۳۲ھ میں ان کا موسس سفاح تخت نشین ہوا اور ۶۵۶ھ میں تاتاریوں نے بغداد میں عباسیہ کا جنازہ دفنادیا، یہ نہایت عظیم الشان حکومت تھی، اس کی عالمگیر حکومت کی سیاست کا امتزاج مذہب وملوکیت دونوں سے تھا، نیک اور اچھے افراد اس کی اطاعت اس کی دین پرستی و مذہب نوازی کی وجہ سے کرتے تھے اور باقی لوگ اس کے ہیبت و جلال یا اپنے حرص وطمع کی وجہ سے اس کے سامنے سر جھکاتے تھے"۔[۱]

عباسیہ کے قیامِ حکومت کے بعد لازمی طور پر نظامِ حکومت بھی بدل گیا، وجہ یہ تھی کہ اس کی بنیاد ایرانیوں کے کاندھے پر رکھی گئی تھی جو بنی امیہ سے اس لئے ناراض تھے کہ انھوں نے اجتماعی اور سیاسی حقوق میں ایرانیوں اور عربوں میں امتیاز قائم کر رکھا تھا اور باوجود قرآن وحدیث کی تعلیم کے مساویانہ حقوق سے انھیں محروم کردیا تھا۔ موروثی حکومت کا طریقہ بنی امیہ کی طرح عباسیہ میں بھی قائم رہا۔ اور آلِ علیؓ سے جن کا اعتقاد تھا کہ شرعی خلافت کے حقدار درحقیقت ہم ہیں، عباسیہ کا بھی مقابلہ رہا اور بنی امیہ کی طرح عباسیہ نے بھی ان کے استیصال اور ان کی تحریک کو کچلنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

خلافتِ عباسیہ کا قیام ایرانیوں کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا جو بادشاہوں کے خداداد حق فرماں روائی (The Divine Right of Kings.) کے قائل تھے اس نظریہ کا مقصد یہ تھا کہ جس شخص کو شاہی خاندان سے کوئی نسلی تعلق نہ ہو وہ حکومت کا مستحق نہیں ہے اگر وہ حکومت پر قابض ہوگیا تو اس کو غاصب سمجھا جائے گا، اس نظریہ کا یہ اثر تھا کہ عباسی خلفاء یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ان کو فرماں روائی کا حق خدا کی جانب سے عطا ہوا ہے، قوم کا عطا کردہ

---

[۱] الفخری ص ۱۲۵۔

نہیں ہے۔ منصور کے یہ الفاظ اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں "میں دنیا میں خدا کی طرف سے فرماں روا ہوں" یہ نظریۂ حکومت خلافتِ راشدہ کے نظریہ سے مختلف تھا۔ خلفاءِ راشدین کا نظریہ یہ تھا "کہ قوم نے انھیں فرمانروائی کا حق دیا ہے" حضرت ابوبکرؓ کے وہ الفاظ اس دعوی کی واضح دلیل ہیں، جو بیعتِ خلافت کے بعد آپ نے خطبہ میں فرمائے تھے " اگر اچھے کام کروں تو ہمت افزائی کرنا، اگر سیدھے راستے سے بھٹک جاؤں تو تلوار سے مجھے سیدھا کر دینا" حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بیعتِ خلافت کے بعد اپنی سیاسی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا تھا "میں تم میں سے کسی سے بہتر نہیں ہوں، اتنا ضرور ہے کہ تم سب سے زیادہ مجھ پر بار گراں ڈال دیا گیا ہے۔ سید امیر علی کا بیان ہے۔

"بنی عباسیہ میں ہارون رشید کے عہد تک نظامِ حکومت استبدادی رہا۔ خلیفہ مطلق فرمانروا تھا، اور حکومت کے چھوٹے بڑے تمام امور میں آخری فیصلہ کرنے کا اسی کو حق حاصل تھا۔ نجی طور سے محکمہ جات کے افسروں اور شاہی گھرانے کے ممتاز افراد سے کبھی کبھی مشورہ ضرور لے لیا جاتا تھا مگر اس کی حیثیت سرکاری نہ تھی۔"

خلیفہ عباسیہ کے ایرانیوں کی طرف رجحان اور ان سے اختلاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظامِ حکومت آلِ ساسان کے دستورِ حکومت میں ڈھل گیا۔ پامر (Palmer) عباسیوں کے نظامِ حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے بیان کرتا ہے "عباسی فرمانرواؤں نے اپنی حکومت کے استحکام کے لئے ایرانیوں کا اثر و اقتدار بڑھا دیا، اس لئے طبعی طور سے حکومت کے نظم و نسق پر ایرانی نظریے کارفرما تھے۔ چنانچہ ایک ایرانی النسل وزیر حکومت کے نظم و نسق میں پورے طور پر دخیل ہوتا تھا اور نظامِ حکومت وہی تھا جو آلِ ساسان نے اپنے دورِ شہنشاہیت میں قائم کیا تھا۔" ؎۱

؎۱ Palmer, Haroun al-Raschid (London) 1981, P. 37.38.

اس ایرانی اثر و نفوذ کا یہ نتیجہ تھا کہ یہ خلفا مطلق العنان فرمانروا بن گئے تھے۔ رعایا کے قلب و دماغ پران کی حکومت تھی۔ خلیفہ عام رعایا کی نظروں سے اوجھل رہتا تھا، وزیروں کے تقرر کی رسم اسی دور میں پڑی۔ دربار میں ہیبت و جلال کے لئے ننگی شمشیریں لئے ہوئے باڈی گارڈ آس پاس کھڑے رہتے تھے۔ امرائے دولت نے ایرانی لباس اور رسم و رواج اختیار کرلئے تھے، نوروز مرجانی وغیرہ کے موقعوں پر شاہانہ جشن مسرت منائے جاتے تھے۔ غرض عباسی خلفا نے اپنی زندگی اور اپنے ماحول کو بالکل ساسانی فرمانرواؤں کی زندگی اور ماحول میں تبدیل کردیا تھا۔ ان کے گرد و پیش جاہ و جبروت کے وہ تمام لوازم موجود تھے جو ساسانیوں کے طغرۂ امتیاز تھے۔ ان کے دربار میں باریاب ہونے والوں کا فرض تھا کہ جھک جائیں، زمین بوس ہوں، اور جب پاس پہنچیں تو خلیفہ کی چادر کو بوسہ دیں، مگر یہ شرف صرف حکومت کے ممتاز اشخاص کو حاصل تھا۔

دوسری طرف خلافت کی تاج پوشی یا مذہبی مجالس میں شرکت کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ردائے اقدس کو خلیفہ زیبِ تن کیا کرتا تھا۔ . . . . . اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام کی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لئے خلیفہ عباسی کو "امام" کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا تھا۔ حالانکہ خلفائے راشدین کے عہد اور بنی امیہ کے دور میں اس لقب کا اطلاق صرف اس شخص پر ہوتا تھا جو نماز میں لوگوں کی امامت کرتا تھا، شیعہ البتہ اہل بیت کو جن کو وہ خلافت کا سب سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے امام کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ عباسیوں نے اپنے نظریۂ حکومت، فرمانروائی کے خداداد حق کی نشر و تبلیغ کے لئے علما اور ممتاز مذہبی افراد کو مقرب بارگاہ بنالیا تھا، ان کی جد و جہد سے اس دور کی سیاسی زندگی میں یہ نظریہ غیر متزلزل طور سے کارفرما رہا۔

ولی عہدی | عہدِ عباسیہ میں ایک سے زیادہ ولی عہد بنانے کی رسم نہ صرف جاری رہی بلکہ اس سلسلہ میں وہ بنی امیہ سے بھی چند قدم آگے تھے۔ سفاح (۱۳۲-۱۳۶ھ) نے اپنے بھائی۔

منصور (۱۳۶ھ-۱۵۸ھ) اور اپنے بھتیجے عیسیٰ بن موسیٰ کو یکے بعد دیگرے ولی عہد مقرر کیا تھا، جب منصور خلیفہ ہوا تو اس نے اس خیال سے کہ میرا بیٹا مہدی بوڑھا ہوا جا رہا ہے، عیسیٰ بن موسیٰ کی جگہ مہدی کے لئے بیعت لے لی اور عیسیٰ بن موسیٰ کو اس کے بعد ولی عہد مقرر کر دیا۔ جب مہدی (۱۵۸-۱۶۹ھ) خلیفہ ہوا تو اس نے عیسیٰ بن موسیٰ کو ولی عہدی سے معزول کر کے اپنے بیٹوں ہادی اور ہارون کو یکے بعد دیگرے ولی عہدی کے لئے نامزد کیا۔

جب ہادی (۱۶۹-۱۷۰ھ) خلیفہ ہوا تو اس نے ہارون کو ولی عہدی سے برطرف کر کے اپنے فرزند جعفر کے لئے بیعت لینا چاہی اور ہارون پر امراء حکومت کے ذریعہ خلافت سے دستبردار ہونے کے لئے طرح طرح سے دباؤ ڈالا اور اس کی زندگی اجیرن کر دی۔ ہارون ان روحانی اذیتوں سے گھبرا کر بڑی حد تک دست بردار ہونے کے لئے رضامند بھی ہو گیا تھا۔ مگر ہادی کی ناگہانی موت نے اس کی خلافت بال بال بچالی۔

ہارون رشید (۱۷۰-۱۹۳ھ) نے اپنے تینوں لڑکوں، امین، مامون اور قاسم کو ولی عہد مقرر کیا تھا اور اپنی زندگی میں عباسی ریاست (State) کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ایک ایک کا ہر بیٹے کو حاکم مقرر کر دیا تھا، ہارون نے مامون کو مشرقی علاقہ دیا جس کا مرکز حکومت مرو تھا، امین کو عراق دیا گیا اور قاسم کے حصے میں مغربی علاقہ آیا۔ ہارون نے یہ انتظام اس خیال سے کیا تھا کہ اگر کوئی بھائی ولی عہدی کا حق چھیننے کا ارادہ کرے تو اسے محفوظ رکھنے کے لئے اس کے پاس طاقت ہو۔

ہارون کے مرنے کے بعد اسی تقسیم مملکت کی وجہ سے باہمی جنگوں، پارٹی بندیوں اور داخلی فتنوں کا دروازہ کھل گیا، امین (۱۹۳-۱۹۸ھ) نے ارادہ کیا کہ مامون کو معزول کر کے اس کی جگہ اپنے بیٹے کو ولی عہد مقرر کرے اس کا انجام جو ہوا اس سے دنیا واقف ہے۔ واثق باللہ (۲۲۷-۲۳۲ھ) نے ولی عہدی کے نظام کا خاتمہ کر دیا، اور اپنے بیٹے محمد کو ولی عہد نہیں بنایا۔ مرض الموت میں جب بیٹے کی جانشینی کے بارے میں درخواست کی گئی تو اس نے کہا:۔

"خلافت کے بارِ گراں کو اپنی زندگی میں میں نے سنبھالا، اب اس کی ذمہ داریاں مرنے کے بعد بھی اپنے سر لینا نہیں چاہتا۔"

اس سلسلہ میں اس نے حضرت عمرؓ اور معاویہ ثانی کی تقلید کی۔

واقعات شاہد ہیں کہ ولی عہدی کے اس نظام نے خاندانِ شاہی میں رقیبانہ کشمکش اور باہمی بغض و عداوت پیدا کر دی تھی اور کامیاب رقیب اپنے حریف کے حامیوں کو نہایت عبرت انگیز سزائیں دیتا تھا، رفتہ رفتہ ان رقابتوں نے خاندانِ خلافت کا شیرازہ پراگندہ کر دیا اور وہ دولتِ عباسیہ کے زوال کا پیش خیمہ بن گئیں۔

سر ٹامس آرنلڈ نے ۱۸۴ھ / ۸۰۰ء کو دولتِ اسلامیہ کے انتہائی عروج کا زمانہ بتایا ہے اس وقت عباسیہ کا جاہ و جلال، اندلس میں امویوں (۱۳۸ھ / ۷۵۶ء) کی شان و شوکت مغربِ اقصیٰ میں ادارسہ (۱۷۲ھ / ۷۸۸ء) کا جاہ و شکوہ اور تونس میں اغالبہ (۱۸۴ھ / ۸۰۰ء) دبدبہ حکومت اپنے آخری نقطہ پر تھا، اسی زمانہ میں شارلمان (Charleman) تختِ حکومت پر جلوہ فرما ہوا تھا، اور اس نے مقدس رومی سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی، اس زمانہ کے بعد دولتِ عباسیہ کی طاقت منتشر ہونی شروع ہوئی اور نہایت تیزی سے بربادی کی طرف قدم بڑھاتی چلی گئی۔

خلافتِ عباسیہ کا عہدِ زوال (۲۳۲ھ تا ۶۵۶ھ)

اس عہد کو تین دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ۲۳۲ھ تا ۳۳۴ھ، واثق باللہ کی وفات سے آلِ بویہ کے تسلط تک

(۲) ۳۳۴ھ تا ۴۴۷ھ، آلِ بویہ کے تسلط سے سلجوقیوں کے اقتدار تک

(۳) ۴۴۷ھ تا ۶۵۶ھ، سلجوقیوں کے اقتدار سے سقوطِ بغداد تک

دَورِ اوّل

واثق باللہ کی وفات سے آلِ بویہ کے تسلط تک

۲۳۲ھ سے ۳۳۴ھ

متوکل واثق باللہ کی وفات (۲۳۲ھ) کے بعد عباسی خلیفہ کے وقار و احترام کا جنازہ بھی اُٹھ گیا تھا، یہ متوکل (۲۳۲ھ-۲۴۷ھ) کی عیش کوشی کا نتیجہ تھا، عباسیہ میں یہ سب سے پہلا عیش پرست خلیفہ تھا۔

متوکل نے اپنی وفات سے کچھ مدت پہلے اپنے بیٹوں منتصر، معتز اور موید کو یکے بعد دیگرے ولی عہد مقرر کردیا تھا۔ پھر خیال پیدا ہوا کہ معتز کا نام منتصر سے پہلے کردیا جائے، یہ خیال معتز کی ماں سے غیر معمولی محبت کا نتیجہ تھا۔ منتصر کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے ترکوں سے سازباز کی، اور انھیں باپ کے قتل پر آمادہ کرلیا اور ایک شب موقع پاکر متوکل اور اس کے وزیرِ اعظم فتح بن خاقان کا خاتمہ کردیا، یہ ۵ شوال ۲۴۷ھ کا واقعہ ہے۔

منتصر اور معتز منتصر (۲۴۷ھ-۲۴۸ھ) جب خلیفہ ہوا تو اس نے اپنے دونوں بھائیوں معتز اور موید کو ولی عہدی سے معزول کردیا، لیکن وہ تھوڑی ہی مدت میں مرگیا۔ اس کا جانشین احمد بن محمد بن معتصم ہوا جو مستعین باللہ (۲۴۸ھ-۲۵۱ھ) کے لقب سے تختِ خلافت پر بیٹھا، اس کا دورِ حکومت پُرآشوب اور اضطراب انگیز رہا، یہ فہم و شعور اور عقل و دانش کے لحاظ سے نہایت معمولی خلیفہ تھا"[1] ترکوں نے تھوڑے عرصے کے بعد ہی اسے معزول کردیا اور معتز باللہ (۲۵۲ھ-۲۵۵ھ) کی بیعت کرلی اور مستعین کو واسط میں نظر بند کردیا گیا۔ احمد بن طولون کو اس کا نگراں مقرر کیا گیا، اس نے معزول خلیفہ کے ساتھ اچھا برتاؤ روا رکھا اور اس کو سیر و شکار کی اجازت دیدی۔ کچھ عرصہ بعد بابِ خلافت کے ایک حاجب سعید کی سرکردگی میں ایک فوجی دستہ واسط بھیجا، جس نے اس مجبور خلیفہ کی روح کو قیدِ ہستی سے آزاد کردیا۔

[1] الفخری، ص ۲۴۰

اس وقت خلیفہ ترکوں کے ہاتھ میں ایک کھلونہ تھا، اس کی زندگی، اس کی موت اور اس کی خلافت انھیں کے اختیار میں تھی، امورِ سلطنت میں ان کے اثر و نفوذ اور خود خلفاء کی حیات و ممات پر ان کے اقتدار کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے:۔

"جب معتز تختِ خلافت پر جلوہ افروز ہوا تو امراء دربار نے نجومیوں سے دریافت کیا خلیفہ کی عمر اور خلافت کی مدت کیا ہے؟ دربار میں ایک مسخرہ بول اٹھا "یہ ترکوں سے پوچھئے" اس پر دربار میں ایک فرمائشی قہقہہ لگا۔" [1]

معتز کے عہدِ خلافت میں ترکوں، مغاربہ، اور فراغنہ کی شورشیں اٹھیں اور "معتز کو باغیوں نے چند سنگ دلوں کے حوالہ کر دیا، ان بے دردوں نے اُسے طرح طرح کی تکلیفیں دیں، تین روز تک کھانے پینے کو کچھ نہیں دیا۔ تیسرے روز بڑی لجاجت سے اس نے ایک گھونٹ پانی مانگا، ظالموں نے اس سے بھی انکار کر دیا، تین دن کی ستم ظریفیوں کے بعد ایک تہ خانہ میں بند کر دیا گیا اور اس نے وہیں تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔ [2]

مہتدی معتز کی موت کے بعد مہتدی بن واثق (سنہ ۲۵۵-۵۶ھ) خلیفہ ہوا، یہ پاکیزہ سیرت، زہد و تقوٰی اور عبادت گزاری کے لحاظ سے نہایت ممتاز خلیفہ تھا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے اس کی سیرت بہت ملتی جلتی تھی، اس کا قول تھا "مجھے یہ خیال کر کے شرم آتی ہے کہ بنی امیہ میں عمر بن عبدالعزیزؒ جیسا موجود ہے، مگر بنی عباسیہ میں ان جیسا ایک بھی دکھائی نہیں دیتا ہے" یہ نہایت عادل تھا، عدالت کی کرسی پر بذاتِ خود بیٹھتا تھا اور عدل و انصاف کرتا تھا، بدقسمتی سے متوکل کے بعد ترک سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے تھے۔ اس لئے اس خلیفہ کی حیثیت بھی ایک عضوِ معطل سے زیادہ نہ تھی۔ [3] تھوڑی مدت بعد ترک اجتماعی طور پر اس کے قتل پر آمادہ ہو گئے۔ الزام یہ تھا کہ اس نے ان کے چند ہوا خواہوں کو قتل کر دیا ہے۔ اس "جرم" میں نہ صرف اس کو قید اور خلافت سے معزول کر دیا گیا بلکہ طرح طرح کی تکلیفیں

---

[1] الفخری ص ۲۲۱ - [2] ابن الاثیر ج ۷ ص ۶۸-۶۹ - [3] الفخری ص ۲۲۶ -

دے کر اسے مار ڈالا گیا۔[1]

معتمد اور معتضد

مہتدی کے بعد معتمد بن متوکل (۲۵۶ھ-۲۷۹ھ) خلیفہ ہوا اُس کے زمانے میں اس کے بھائی موفق کا اقتدار اتنا بڑھ گیا تھا کہ درحقیقت خلیفہ وہی تھا، معتمد کا نام ضرور تھا، معتمد کے نام کا صرف خطبہ اور سکّہ جاری تھا اور امیر المومنین کا لقب تھا، موفق کل سیاہ و سفید کا مالک تھا، فوجوں کی قیادت، دشمنوں سے لڑائیاں سرحدوں کا انتظام، وزارت کی ترتیب اور حکومت کے تمام دوسرے اہم منصب اس کے اختیار میں تھے، معتمد کو اپنی دلچسپیوں سے فرصت نہ تھی۔[2] اس کی بے چارگی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ اسے تین سو دینار کی ضرورت پڑی تو اُسے خزانے سے مل نہ سکے۔ یہ عباسیہ میں پہلا خلیفہ تھا جو اتنا مجبور و بے بس تھا۔[3]

موفق کی وفات کے بعد سپہ سالاروں نے جمع ہو کر مفوض بن معتمد کی بیعت کرلی، اور ابوالعباس بن موفق کو ولی عہد مقرر کردیا، مفوض بن معتمد، معتضد باللہ (۲۷۹ھ-۲۸۹ھ) کے لقب سے خلیفہ ہوا، یہ اپنے پیش رو خلفاء کے برعکس نہایت جاہ و جلال اور ہیبت و دبدبہ کا خلیفہ تھا، اس کے خوف و دہشت کی وجہ سے اس کے دور میں شورشوں اور فتنوں نے دم لیا اور کسی کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی، یہ دور عام فلاح و بہبودی، امن و امان اور عدل و انصاف کا دور تھا، معتضد باللہ نے خلافتِ عباسیہ کے بے روح جسم میں جان ڈال دی تھی، اس لئے اسے سفاح ثانی کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

مکتفی

معتضد باللہ نے ربیع الآخر ۲۸۹ھ میں وفات پائی۔ اس کی خلافت کی زندگی شرف و کامرانی سے معمور تھی، خلافت کی تمام کمزوریوں کو اس نے دور کیا اور دوبارہ اس کی ہیبت و قوت میں اتنا اضافہ ہوگیا کہ بڑی بڑی حکومتیں اس سے لرزنے لگیں۔ خلافتِ عباسیہ کو اس سے بڑی بڑی امیدیں تھیں مگر افسوس اس کی عمر نے وفا نہ کی، اور تھوڑی ہی مدت میں موت نے

---

[1] تاریخ الخلفاء ص ۔ ۲۴۳ [2] الفخری ص ۔ ۲۲۶ [3] ایضاً

خلافت کو اس کی شخصیت سے محروم کردیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مکتفی باللہ (۲۸۹-۹۵ھ) خلیفہ ہوا، یہ نہایت فضول خرچ فرمانروا تھا اُسے موت نے مہلت نہ دی اور عنفوانِ شباب ہی میں ذیقعدہ ۲۹۵ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

مقتدر | مکتفی کے بعد اس کا بھائی جعفر بن معتضد ۱۳ سال کی عمر میں مقتدر باللہ (۲۹۵-۳۲۰ھ) کے لقب سے اس کا جانشین ہوا، اس کا دورِ خلافت داخلی اور خارجی شورشوں سے معمور تھا بدقسمتی سے ابھی جشنِ خلافت کی گرمجوشیاں سرد نہ ہوئی تھیں کہ چند سیاسی خودغرضوں نے اسے محروم کرکے عبداللہ بن معتز کو خلیفہ بنانے کی سازش کی، مقتدر کو علم ہوا تو اس نے عبداللہ کو کچھ مال و دولت دے کر اس پر راضی کرلیا کہ وہ اس پر آمادگی ظاہر نہ کرے، ابنِ معتز نے اس کا وعدہ بھی کیا تھا لیکن اس کے ہواخواہوں نے سیاسی اغراض کو بروئے کار لانے کے لئے اُسے دوبارہ آمادہ کرلیا، اور مقتدر کو فرار ہونا پڑا۔ یہ ۲۰ ربیع الاول ۲۹۶ھ کا واقعہ ہے۔

مقتدر کی فراری کے بعد سپہ سالار، قضاۃ اور اعیانِ خلافت جمع ہوئے اور عبداللہ بن معتز کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ اور اسے غالب باللہ کا لقب دیا۔ تھوڑے عرصے بعد مقتدر باللہ نے اپنے حامیوں کے ساتھ بغداد پر چڑھائی کردی، اس وقت خلیفہ اور اس کے وزیر اور قاضی سب فرار ہوگئے اور مقتدر باللہ نے دوبارہ خلافت حاصل کرلی۔

مقتدر باللہ کا دورِ خلافت شورش اور اضطراب کا زمانہ تھا، عورتیں امورِ حکومت میں دخیل تھیں۔ ابنِ اثیر کے الفاظ میں

"یہ خلیفہ وزراء کے معزول کرنے، عورتوں اور خادموں کی باتوں کی طرف کان لگانے اور ان کی رائے پر عمل درآمد کرنے میں خاص طور پر مشہور تھا۔" لے

اس کے عہدِ خلافت میں حکومت کی مشینری پر اس کی ماں "سیدہ" کا قبضہ تھا۔ اس کے اقتدار کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس کا یا اس کی حرم سرا کی مہتمہ کا عتاب وزراء تک کو معزول

لے ابن اثیر ج ۸ ص ۲۵۔

کر سکتا تھا! یہ باقاعدہ جمعہ کے دن عدالت میں اجلاس کیا کرتی تھی، اس غرض کے لئے اس نے رصافہ میں ایک محل تعمیر کرایا تھا۔

خلافتِ عباسیہ مقتدر کے عہد میں فتنہ وشورش کا محور تھی، ایک خادم سپہ سالار مونس نے ۳۱۷ھ میں بغداد پر چڑھائی کردی اور خلیفہ بھاگنے پر مجبور ہوا، اس وقت اس نے اور دوسرے امرائِ خلافت نے محمد بن معتضد کو قاہر باللہ کے لقب سے خلیفہ بنا لیا۔ نئے خلیفہ کے جشن کی خاکستر ابھی بجھی نہ تھی کہ فوجوں نے تنخواہوں کا مطالبہ کردیا، ان کا مطالبہ درخورِ التفات نہیں خیال کیا گیا، نتیجہ یہ ہوا وہ مقتدر باللہ سے مل گئیں اور اُسے نہایت عزت واحترام سے دارالخلافت لائیں اور قاہر باللہ کو تخت سے اتار دیا۔ یہ مقتدر باللہ کی شرافت تھی کہ اس نے قاہر کو اپنے پاس بلاکر تسلی دی اور کہا تم میری طرف سے مطمئن رہو، تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔

مقتدر باللہ کا عہدِ حکومت باوجود اندرونی شورشوں اور بیرونی فتنوں کے شان و شکوہ اور عظمت وجلال کا دور تھا، اس کے زمانہ میں جب شہنشاہِ روم کا سفیر مصالحت اور قیدیوں کے باہمی تبادلہ کی غرض سے بغداد آیا تو خلافت کے ہیبت اور دبدبہ کا مظاہرہ کرنے کے لئے ایک نو تعمیر محل میں اس کا وسیع پیمانہ پر خیر مقدم کیا گیا یہ محل "دارالشجرہ" نہایت بیش قیمت فرنیچر سے سجایا گیا تھا، مجلس میں قرینہ سے دروازوں، دہلیزوں، صحنوں اور راستوں پر حاجب اور خادم مامور تھے، دو رویہ قطاروں میں سپاہی صف بستہ کھڑے تھے، ان کا لباس نہایت موزوں اور وقت کے مناسب تھا، ان کے گھوڑوں پر زربفت اور دوسری اعلیٰ قسم کی جھولیں پڑی تھیں۔[1]

علامہ سیوطیؒ نے اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

"۳۰۵ھ میں شہنشاہِ روم کا سفیر مصالحت کی غرض سے بغداد آیا تھا۔ مقتدر نے بڑے وسیع پیمانے پر اس کے استقبال کی تیاریاں کی تھیں، باب شماسیہ سے دارالخلافت

[1] تاریخ بغداد (الخطیب البغدادی) ص ۱۰۰-۱۰۲

تک ایک لاکھ ساٹھ ہزار مسلح فوج صف بستہ کھڑی تھی۔ فوج کے آگے سات ہزار خادم دست بستہ کھڑے تھے ان کے بعد سات سو حاجب کھڑے تھے، دارالخلافت کی دیواروں پر اٹھائیس ہزار ریشمی پردے پڑے تھے اور بائیس ہزار دوسرے بیش قیمت اور اعلیٰ قسم کے پردے پڑے تھے ....

مقتدر باللہ دجلہ کے کنارے آبنوس کے تخت پر تاج پہنے جلوہ فرما تھا۔ بدن پر سفید ریشمی لباس تھا جس پر سونے کا کام بنا تھا، تخت پر منقش سنہرا فرش بچھا تھا۔ جس کی جھالر میں تسبیح کے دانوں کے برابر نہایت بیش قیمت جواہرات لٹک رہے تھے سامنے پانچ شہزادے، تین دائیں جانب، دو بائیں جانب بیٹھے تھے۔ اس وقت قاصد اور ترجمان سامنے کھڑے ہوئے اور قاصد نے سجدہ کیا اور مونس خادم اور نصر قشوری کے واسطے سے جو مقتدر کے ترجمان تھے گفتگو کی۔"

مقتدر باللہ کے عہدِ خلافت میں داخلی اور خارجی دونوں قسم کی فضا اضطراب انگیز تھی، اس کی سب سے بڑی وجہ ترکوں کا حکومت کی مشینری پر غلبہ تھا۔ اس زمانہ میں فوج کے جنرلوں کا عمل دخل اتنا بڑھ گیا تھا کہ خلیفہ کا تقرر اور عزل ان کے اختیار میں تھا، اس وقت وزراء کی کوئی حیثیت نہ رہی تھی، یہ سب خلیفہ کی صغرسنی اور نا اہلی کا نتیجہ تھا۔ خلیفہ عیش وعشرت اور لطف اندوزیوں میں غرق تھا۔ حکومت کے نظم ونسق میں حرم دخیل تھیں، ان کمزوریوں کی وجہ سے اس کے ممتاز امیر، مونس خادم کو اتنی جرأت ہوئی تھی کہ اس نے دارالخلافت پر چڑھائی کر دی اور خلیفہ کو معزول کر دیا۔ دوسری دفعہ خلیفہ کو منصبِ خلافت حاصل کئے ہوئے ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ ۳۲۰ھ میں اس نے دوبارہ بربری فوجوں کی امداد سے بغاوت کی، اس میں خلیفہ کسی بربری کے ہاتھ سے مارا گیا۔ بدبخت قاتل نے خلیفہ کا لباس اور سر اتار لیا اور اس کی عریاں لاش چند روز تک میدان میں اسی حالت میں پڑی رہی۔ یہ چہار شنبہ ۲۷ شوال ۳۲۰ھ کا واقعہ ہے۔ [۱]

[۱] تاریخ الخلفاء ۲۵۵۔

قاہر | مقتدر کی شہادت کے بعد محمد قاہر باللہ (۳۲۰۔۳۲۲ھ) کے لقب سے خلیفہ ہوا، اس کا عہد بھی شورش و فتنہ کا دور تھا۔ فوج بدستور خلیفہ کی مخالف رہی، کچھ عرصہ بعد اعیانِ خلافت سپہ سالار مونس اور وزیر اعظم ابنِ مقلہ نے اس خلیفہ کو بھی معزول کر دیا۔ چنانچہ اسے گرفتار کرکے اس کی آنکھوں میں سلائی پھروادی اور نظر بند کر دیا۔ ستم ظریفی کے لئے کبھی اُسے رہا کر دیا جاتا، کبھی اسے بند کر دیا جاتا۔ قاہر نے ایک دن جامع منصور بغداد میں کھڑے ہو کر لوگوں سے صدقہ کا سوال کیا۔ اس سے اس کا مقصد لوگوں پر مستکفی کے برے برتاؤ کو ظاہر کرنا تھا۔ ایک ہاشمی کو یہ دیکھکر غیرت آئی اور اس نے پانچ سو درہم فوراً دیدیئے اور پھر دستِ سوال دراز کرنے سے اس کو منع کیا۔[1] مستکفی کو اس کا علم ہوا تو باہر نکلنے کی ممانعت کردی اور آخر عمر تک اسی طرح نظر بند رہا۔ جمادی الاول ۳۳۹ھ میں اس نے زندگی کی ان تلخیوں سے نجات پائی۔ یہ خلیفہ طائع کے عہد کا واقعہ ہے۔

"امارتِ عظمیٰ" کا دور

(۳۲۴ھ۔۳۳۴ھ)

خلیفۂ عباسی کے اقتدار کا چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) سے قریباً بالکل خاتمہ ہوگیا تھا اور مرکزِ خلافت میں ترک جنرلوں کا اثر و نفوذ بہت بڑھ گیا تھا، دوسری طرف خود مختار مملکتیں خلافت کے لئے مستقل خطرہ بن رہی تھیں۔ اس وقت فارس میں علی بن بویہ کا جاہ و اقبال نصف النہار پر تھا۔ رَی، اصفہان اور بلاد الجبل اس کے بھائی حسن بن بویہ کے زیرنگیں تھے۔ بنو حمدان کی موصل، دیار بکر، دیار ربیعہ اور مضر میں خود مختار حکومتیں قائم تھیں۔ مصر اور شام میں محمد بن طغج اخشید کی آزاد مملکت قائم تھی، خراسان میں نصر بن احمد سامانی کی خود مختار سلطنت تھی۔[2]

---

[1] الفخری ص ۲۴۹۔ [2] ایضاً ص ۲۵۲۔

مغرب کی حالت بھی مشرق سے کچھ زیادہ بہتر نہ تھی، عبدالرحمٰن ثالث اموی (۳۰۰ھ۔۳۵۰ھ) اندلس میں خلیفہ بن بیٹھا تھا اور "امیرالمومنین ناصر الدین اللہ" کا لقب اختیار کیا تھا۔[1] اس زمانہ میں عالمِ اسلامی میں تین خلافتیں قائم تھیں، بغداد میں خلافتِ عباسیہ، بلادِ مغرب میں خلافتِ فاطمیہ اور اندلس میں خلافتِ امویہ!

راضی (۳۲۲ھ۔۳۲۹ھ) کے ابتدائی دَورِ خلافت میں حکومت کا نظم ونسق انتہائی پراگندگی کی حالت میں تھا۔ راضی نے اسے اعتدال پر لانے کے لئے ایک جدید عہدہ "امیرالامراء" قائم کیا اور اسے حکومت کے نظم ونسق کے پورے اختیارات دیدیئے گئے۔ راضی کا مقصد اس نئے عہدہ کے قیام سے ان بڑے بڑے جنرلوں کے اقتدار کا خاتمہ کرنا تھا جو وزراء کے راستہ میں مفادِ عامہ اور مملکت کی اصلاحات کے کاموں میں روڑے اٹکاتے تھے، اس منصب پر فائز ہونے والا سب سے پہلا شخص، بصرہ اور واسط کا گورنر ابن رائق تھا۔ راضی نے اسے بلا کر نظمِ مملکت، فوج، اور مالیات پر پورا اختیار دیدیا اور تمام عالمِ اسلامی میں فرمان جاری کردیا کہ خطبوں میں اس کا نام بھی لیا جائے، اس دن سے وزراء کے عمل دخل کا بالکل خاتمہ ہوگیا اور خلافت "امیرالامراء" اور اس کے فارن سکرٹری کا نام تھا۔ ابنِ رائق کے بعد جتنے بھی امیرالامراء اس عہدہ پر فائز ہوئے سب کی یہی آمرانہ حیثیت تھی۔[2]

ابنِ رائق کی حیثیت اس وقت ایک ڈکٹیٹر کی تھی اور خلیفہ اس کے سامنے ایک عضوِ معطل سے زیادہ نہ تھا رفتہ رفتہ یہ بات خلیفہ کو گراں گزری اور اس نے ابنِ رائق کے مقابلہ میں ایک طاقتور حریف بجکم کھڑا کردیا جس نے اسے اس عہدہ سے ہٹادیا اور خود اس کی جگہ لے لی۔ اس کا دورِ "امیرالامرائی" بھی ابنِ رائق سے کچھ کم اضطراب انگیز نہ تھا۔ ابنِ رائق نے صفر ۳۲۷ھ میں بغداد پر چڑھائی کردی اور بجکم سے "امیرالامراء" کا عہدہ چھین لیا۔ اس وقت اس نے خلیفہ اور اپنے حریفوں سے جو سلوک کیا ہوگا اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں

[1] تاریخ الخلفاء ص ۲۶۰ - [2] تجارب الامم (ابن مسکویہ ج ۱ ص ۳۵۱ - ۳۵۲

منتقی | راضی نے "امیر الامراء" کا عہدہ مملکت کی اصلاح کے لئے قائم کیا تھا لیکن نتیجہ امید کے خلاف نکلا اور اس کی وجہ سے مملکت کا شیرازہ اور پراگندہ ہوگیا۔ راضی اور متقی (۳۲۹ھ-۳۳۳ھ) کے ایامِ خلافت کا جائزہ لیجئے تو شورش، فتنوں اور باہمی رقابتوں سے معمور نظر آئے گا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب بنی بویہ بغداد میں داخل ہوئے تھے اور خلیفہ اور امیر الامراء کے علی الرغم امور نظم و نسق مملکت پر بلا شرکتِ غیرے قابض ہوگئے تھے۔ سب سے پہلے حصولِ اقتدار اور منصب امیر الامراء کے لئے ابن رائق اور ابو عبداللہ بریدی صاحبِ اہواز میں رسہ کشی ہوئی، اس میں ابن رائق کامیاب رہا۔ اس کے بعد بجکم نے ابن رائق کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور ۳۲۷ھ میں اس منصب کو چھین لیا۔ لیکن ۳۲۹ھ میں ابن رائق نے پھر بغداد پر چڑھائی کردی اور بجکم کو قتل کرکے اس عہدہ پر دوبارہ متمکن ہوگیا۔ اب بریدی دوبارہ حریف بن کر ابن رائق کے مقابلہ میں آیا اور بغداد پر چڑھائی کردی، اس وقت ابن رائق اور خلیفہ متقی دونوں . . . . کو موصل میں ناصر الدولہ بن حمدانی کے پاس پناہ لینا پڑی۔ ناصر الدولہ نے ابن رائق کو . . . .
. . قتل کرادیا اور فوراً اس کے بعد ہی خلیفہ کو ساتھ لیکر بغداد پر چڑھائی کردی اور بریدی کی جگہ خود امیر الامراء بن بیٹھا۔ یہ اوائل شعبان ۳۳۰ھ کا ذکر ہے۔ لیکن حمدانیوں کا دور بھی (۳۳۰-۳۳۱ھ) زیادہ دنوں تک بغداد میں قائم نہ رہا اور ان کا عہد بھی پچھلے زمانہ سے کچھ زیادہ بہتر نہ تھا۔ رمضان ۳۳۱ھ میں ایک پولیس افسر توزون ترکی نے ان کو بغداد سے نکال باہر کیا، اور موصل تک ان کا پیچھا کیا اور خود "امیر الامراء" کے منصب پر فائز ہوگیا۔

توزون کا اقتدار خلیفہ متقی کو گراں تھا اور اس نے اس کے خلاف سازشیں کرنا شروع کیں۔ توزون کو اس کا علم ہوگیا اور اس نے خلیفہ کو حراست میں لے لیا اور اسے معزول کرکے اس کی جگہ عبداللہ بن مکتفی کو خلیفہ مقرر کردیا اور متقی سے خاتم خلافت لے کر عبداللہ بن مکتفی کے سپرد کردی۔ اس کے بعد متقی باللہ کی آنکھوں میں سلائی پھروادی گئی۔ متقی کی چیخیں سن کر حرم کی عورتوں اور خادموں نے شور مچایا تو توزون نے ڈھول بجانے کا اشارہ کردیا، ان

ہنگامہ میں کوئی اس کی چیخ نہ سن سکا، مجبوراً اُسے اپنے آپ کو عبداللہ بن مکتفی کے رحم وکرم پر چھوڑنا پڑا، یہ صفر ۳۳۳ھ کا واقعہ ہے۔ متقی ۲۵ برس تک نظر بند رہا اور شعبان ۳۵۷ھ میں وفات پائی

مستکفی | متقی کی معزولی کے بعد صفر ۳۳۳ھ میں عبداللہ بن مکتفی کی بیعت لی گئی اور وہ مستکفی (۳۳۳ھ ۳۳۴ھ) کے لقب سے تخت خلافت پر جلوہ فرما ہوا۔ اس وقت خلافتِ عباسیہ کے داخلی اور خارجی دونوں حالات نہایت ناگفتہ بہ تھے، حکومت کی پوری طاقت امیرالامراء توزون کے ہاتھ میں تھی اور خلیفہ بالکل بے بس تھا، مستکفی کے ابتدائی عہد میں توزون مرگیا اور اس کی جگہ ابوجعفر بن شیرزاد اس عہدہ پر مامور ہوا۔ یہ بھی اپنے پیشرو امیرالامراء سے کچھ کم نہ تھا۔

کشمکش کا اثر | امیرالامراء کے عہدہ کی کشمکش اور حریفانہ مقابلہ ۳۲۴ھ سے ۳۳۴ھ تک جاری رہا، اس باہمی کشاکش کا بغداد کی رعایا اور ان کی معاشی حالت پر نہایت برا اثر پڑا اور وہ کتے بلی اور مردار تک کھانے پر مجبور ہوگئے۔ اس کی وجہ سے جرائم پیشگی میں ترقی ہوگئی اور لوٹ مار اور غارت گری کا بازار گرم ہوگیا، بھوک پیاس سے مجبور ہوکر بہت سے لوگ بصرہ وغیرہ کی طرف نکل کھڑے ہوئے مگر ان میں سے اکثر فقروفاقہ اور ضعف ونقاہت کی وجہ سے راستہ ہی میں ختم ہوگئے ۵۱

اس حریفانہ کشمکش کا لازمی نتیجہ، پارٹی بندی تھا، یہ پارٹیاں اپنے اپنے نمائندے کے لئے جان توڑ کوششیں کرتی تھیں، چنانچہ ابوعبداللہ بریدی نے علی بن بویہ سے مدد طلب کی تھی جو اس وقت فارس میں نہایت طاقتور فرمانروا تھا۔ دوسرے حریف ابن رائق نے اپنے دفاع اور حفاظت کے لئے موصل کے فرماں روا، ناصرالدولہ سے امداد مانگی تھی، یہ اس وقت کا ذکر ہے جب ابن رائق نے ۳۲۹ھ میں بجکم کو قتل کرکے دوبارہ امیرالامراء کا منصب حاصل کیا تھا، مستقبل میں اس کشمکش، بدنظمی اور اضطراب انگیز ماحول کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہایت آسانی کے ساتھ معزالدولہ بن بویہ بغداد پر مسلط ہوگیا!۔

---

۵۱ Mair P573

اس سیاسی ماحول سے عباسیہ کے ضعف وانحطاط کا اندازہ کرنا دشوار نہیں، مرکز کی اس پراگندگی کی وجہ سے قرامطہ اور بیزنطینوں کی طاقتور حکومتوں کی طرف سے اس وقت شدید خطرہ لاحق ہوگیا تھا، خلافت کی یہ بے بسی دیکھکر اکثر گورنروں نے نہ صرف خودمختاری کا اعلان کردیا تھا، بلکہ خلافت کی ہوس تک ان کے دلوں میں پیدا ہوگئی تھی، خلفار کی بدقسمتی سے وہ ترک، جنھیں انھوں نے اپنی حفاظت کے لئے خادموں کی حیثیت سے مامور کیا تھا، وہی اُن کے آقا بن بیٹھے تھے، اور صرف ایک غلام (ابن رائق) کے ہاتھ میں حکومت کی پوری مشینری تھی جو امیرالامرار کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، ابتدار میں خلیفہ نے اُسے صرف حکومت کی بدنظمی دور کرنے کے لئے مامور کیا تھا مگر بدقسمتی سے اس کا اقتدار اتنا بڑھ گیا کہ خلیفہ کی سیاسی حیثیت کا اس کے مقابلہ میں بالکل خاتمہ ہوگیا اور وہ صرف مذہبی اجارہ دار یا دوسرے الفاظ میں امیرالامرار کی سیاسی اغراض کا ایک آلۂ کار بن کررہ گیا، خطبہ میں اس کا نام ضرور لیا جاتا تھا اور سکہ بھی اس کے نام سے جاری ہوتا تھا مگر یہ سب کچھ محض سیاسی اغراض کے لئے روا رکھا جاتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ گورنر اپنے مرکزوں میں رائے عامہ کو قابو میں رکھیں اور ان باتوں سے ان کی طفل تسلیاں کرتے رہیں!

مشہور مورخ گبن (Gibbon) نے عباسیہ کے اس دور کی سیاسی حالت کا خاکہ ان الفاظ میں کھینچا ہے "اس وقت خلافتِ عباسیہ کی سیاسی حالت ہی ابتر نہ تھی بلکہ مذہبی حالت بھی ردی تھی، شیعوں میں امتداد زمانہ سے متعدد فرقے پیدا ہوگئے تھے ان میں اہم فاطمی فرقہ تھا لبنان میں ایک نیا مذہب دروزی وجود میں آیا تھا، ایران کے اندر بہائی مذہب نے جنم لیا تھا، بغداد میں مذہبی اختلافات بے حد تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ کے حامی اٹھے اور عیش پرست امرار کے گھروں پر ٹوٹ پڑے، شراب کے برتن توڑ دیئے۔ موسیقی کے آلات ریزہ ریزہ کردیئے مغنیوں کو مارا پیٹا گانے والے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو ذلیل کیا انھیں شرم وغیرت دلائی۔ اس جماعت کے استیصال کرنے کی صرف ایک صورت تھی اور وہ فوجی طاقت تھی مگر اس کی ضرورت محسوس کون کرتا؟ دوسری طرف اہل افریقہ اور ترک، دونوں نے ایک دوسرے کے اقتدار گھٹانے میں اپنی پوری فوجی قوتیں

اور صلاحیتیں صرف کر رکھی تھیں، امیر الامراء کے اختیار میں خلیفہ کی موت و زندگی اور اس کا عزل و نصب تھا اس کی یہ قوت دراصل خلیفہ کے دینی اقتدار اور اس کی عام عظمت و احترام پر ایک ضرب کاری تھی، خلیفہ کے لئے اپنی جان بچانے کے لئے عموماً کسی دوسرے خود مختار فرماں روا کی پناہ لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہوتا تھا۔ اس طرح گو اس کی زندگی خطرہ سے محفوظ ہو جاتی تھی مگر وہ ایک ذلت کے بعد دوسری ذلت کا شکار ہو جاتا تھا۔ اسی بے بسی نے خلیفہ کو مجبور کیا کہ وہ بنی بویہ سے اپنی اعانت اور اس مصیبت سے نجات دلانے کی التجا کرے، لیکن ان کے زیر سایہ آنے کے بعد بھی چین نہ ملا اور ان کے ہاتھوں میں کھلونہ بن گیا۔

احمد بن بویہ جب بغداد میں داخل ہوا تو امیر الامراء ابن شیرزاد روپوش ہو گیا، اس وقت سے خلافت عباسیہ کا ایک جدید عہد شروع ہوا، اور وہ بنی بویہ کا دور تھا!

خلافت عباسیہ عہد بنی بویہ میں

۳۳۴ھ ۔ ۴۴۷ھ

سلاطین بنی بویہ، عراق میں

- بویہ
  - رکن الدولہ
    - فخر الدولہ
      - شمس الدولہ
        - سماء الدولہ
      - مجد الدولہ
    - مؤید الدولہ
    - (۳) عضد الدولہ
      - بہاء الدولہ
        - (۹) جلال الدولہ
        - قوام الدولہ
        - (۸) مشرف الدولہ
        - (۷) سلطان الدولہ
          - (۱۰) عماد الدین ابو کالیجار
            - ابو علی خسرو
            - فلاد ستون
            - (۱۱) خسرو فیروز
      - (۴) صمصام الدولہ
      - (۵) شرف الدولہ
  - عماد الدولہ
  - (۱) معز الدولہ
    - (۲) عز الدولہ

۳۳۰ھ	معزالدولہ ابوالحسین احمد	۹۳۲ء
۳۵۶ھ	عزالدولہ بختیار	۹۶۷ء
۳۶۷ھ	عضدالدولہ (فارس میں)	۹۷۷ء
۳۷۲ھ	شرف الدولہ "	۹۸۲ء
۳۷۹ھ	بہاءالدولہ ابونصر فیروز	۹۸۹ء
۴۰۳ھ	سلطان الدولہ (فارس میں)	۱۰۱۲ء

آلِ بویہ کا سلسلہ نسب بہرام بن یزدجرد تک پہنچتا ہے جو ملوکِ ساسان سے تعلق رکھتا تھا ان کا مورثِ اعلیٰ ابوشجاع بویہ، بلاد دیلم کا ایک مفلس اور قلاش آدمی تھا جو ماہی گیری کی زندگی بسر کرتا تھا۔ مصنف "الفخری" نے لکھا ہے کہ بغداد پر اپنا تسلط قائم ہو جانے کے بعد معزالدولہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا برابر اعتراف کیا کرتا تھا اور کہتا تھا "میں اپنے سر پر لکڑیوں کا گٹھر لاد کر لیجایا کرتا تھا" علی بن بویہ نے بہت جلد ترقی کی یہاں تک کہ ۳۳۴ھ میں عراق کا فرماں روا ہو گیا۔ خلیفہ عباسی نے اسے معزالدولہ کا خطاب دیا، اسی نے ۳۳۴ھ میں بنو بویہ کی حکومت کا عراق میں سنگِ بنیاد رکھا جو ۴۴۷ھ تک قائم رہی۔

مطیع اور طائع | آلِ بویہ کا سب سے پہلا فرمانروا معزالدولہ احمد تھا۔ یہ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا خلافت کے نظم و نسق پر اس نے اپنا پورا اقتدار جما لیا تھا، اس کے سامنے خلیفہ بے بس تھا اور اسے کوئی اختیار حاصل نہ تھا، گذارے کے لئے صرف پانچ ہزار درہم روزانہ اس کو دیئے جاتے تھے[1] لیکن یہ حالت بھی زیادہ دن تک قائم نہ رہ سکی، خلیفہ معزول کر دیا گیا اور اس کی آنکھوں میں سلائی پھروا دی گئی۔

علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے[2] کہ معزالدولہ خلیفہ سے بدظن ہو گیا اور ایک دن (جمادی الاخری ۳۳۴ھ) بھرے دربار میں داخل ہوا، اہلِ دربار اپنے مراتب کے لحاظ سے

---

[1] السیوطی ص ۳۶۳ - ۳۶۴ - [2] ایضاً ص ۳۶۴ -

اپنی اپنی جگہ کھڑے تھے یہ بھی اپنی جگہ جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ دو دیلمی تھے جو خلیفہ کی طرف بڑھے۔ خلیفہ نے خیال کیا۔ یہ اس کے ہاتھوں کو بوسہ دینا چاہتے ہیں اس لئے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیا۔ ان دونوں بدبختوں نے خلیفہ کو تخت سے کھینچ کر زمین پر دے مارا اور صافہ سے باندھ کر گھسیٹنا شروع کیا اتنے میں اور صدہا دیلمی ٹوٹ پڑے اور ان یزیدیوں نے نہ صرف دار الخلافت بلکہ حرم تک کو خوب لوٹا اور ایک چیز بھی نہیں چھوڑی، اس غارت گری کے بعد معز الدولہ اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوا خلیفہ مستکفی اس کے ہمراہ پیدل جا رہا تھا، وہاں خلیفہ کو خلافت سے باقاعدہ معزول کیا گیا اور اس کی آنکھوں میں اسی دن سلائی پھروا دی گئی اس کی جگہ فضل بن مقتدر کو مطیع باللہ (۳۳۴ھ تا ۳۶۳ھ) کے نام سے خلیفہ بنایا اور اس سے بیعت کر لی، ازاں بعد جدید خلیفہ کے سامنے اس کے چچازاد بھائی خلیفہ مستکفی کو حاضر کیا گیا جس نے خلافت کی ذمہ داریوں کو جدید خلیفہ کے حوالہ کیا اور اپنی معزولی کا سب کے سامنے اقرار کیا، اس کارروائی کے بعد اسے قید کر دیا گیا اور قید خانہ ہی میں ۳۳۸ھ میں اس نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔[1] جدید خلیفہ کو المطیع کا لقب دیا گیا اور ایک سو دینار روزانہ مقرر کر دیا گیا۔

آلِ بویہ نے عباسی خلفاء کے ساتھ نہایت ناروا سلوک جائز رکھا۔ ان کی سیاست تمام تر خود غرضی اور انانیت پر مبنی تھی، علاوہ ازیں یہ غالی شیعہ تھے اسی لئے سر ٹامس آرنلڈ کے الفاظ میں

> "سنی عباسی خلیفہ کے تمام عالمِ اسلامی پر حقِ سیادت کو تسلیم نہیں کرتے تھے وہ عباسیوں کی خلافت کے منکر تھے۔"[2]

سلاطین بویہ عراق میں مطلق العنان فرمانروا کی حیثیت سے حکومت کرتے تھے، عباسی خلفاء کا ان کی نگاہوں میں کوئی احترام نہ تھا ان پر جبر و استبداد اور ان کے حقوق غصب کرنے میں بھی کوئی تامل نہ ہوتا تھا معز الدولہ کے دل میں خیال پیدا ہوا تھا کہ

۱؎ الفخری ص ۲۵۷ ۲؎ The Caliphate. P. 61.

خلافتِ عباسیہ کا خاتمہ کرکے اس کی جگہ خلافتِ علویہ کی تاسیس عمل میں لائی جائے لیکن اس نے اپنی اس سیاست کو عملی جامہ پہنانے سے گریز کیا اس صورت میں اس کو اپنا اقتدار محفوظ نظر آیا۔ اس نے سوچا، علوی خلافت کے قیام کے بعد فوج اس کی مطیع ہوگی، اہلِ دیلم پورے طور پر اس کے طرفدار ہوں گے اور خلیفہ کے ہاتھ میں . . . . ہوں گے۔ خلیفہ اپنی مصلحت کے مطابق حسب منشا ان کو استعمال کرسکے گا۔ ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ جب معزالدولہ نے بغداد میں عباسی خلافت کو فنا کرکے علوی خلافت کو قائم کرنا چاہا تو اس کے ایک درباری نے اس اقدام سے اس کو روکا، اس کے الفاظ یہ تھے :۔

"تمہارا گروہ عباسی خلیفہ کو اس منصب کا مستحق نہیں سمجھتا، اگر خلیفہ کے قتل کا حکم دو تو انھیں تعمیل میں تامل نہ ہوگا وہ اس کے خون کو حلال سمجھیں گے۔ لیکن علوی خلیفہ ہوگا تو یہی جماعت اس کو خلافت کا صحیح حقدار تصور کرے گی اور اس کے حکم پر تمہیں قتل کرنے سے بھی گریز نہ کرے گی۔" [۵۲]

معزالدولہ کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور اس نے یہ خیال چھوڑ دیا اُسے خطرہ تھا کہ کہیں یہ اپنی قبر آپ کھودنے کے مترادف نہ ہو۔[۵۳]

۳۶۷ھ میں عزالدولہ بختیار، حاکمِ عراق اور عضدالدولہ فرمانروا ایران میں جنگ ہوئی۔ اس میں عزالدولہ مارا گیا اور طائع باللہ نے مذہبی فرمانروا ہونے کی حیثیت سے عضدالدولہ کا قبضہ عزالدولہ کی مملکت پر تسلیم کرلیا اور جواہرات سے جڑا ہوا تاج بھیجا، طوق اور کنگن پہنائے اور عضدالدولہ کے لئے ایک ہدایت نامہ تحریر کیا گیا جو خلیفہ کے سامنے پڑھا گیا . . . . . . یہ معمول کے خلاف تھا، معمول یہ تھا کہ گورنروں کو لائحہ عمل امیرالمومنین کے دربار سے لکھ کر بھیج دیا جاتا تھا۔ جب عضدالدولہ نے یہ ہدایت نامہ لیا تو امیرالمومنین نے فرمایا تو اس کا

Noeldalle Sketches from Eastern History. [۵۱]

[۵۲] ابن اثیر ج ۸ ص ۱۶۲۔ [۵۳] الفاطمیون فی مصر۔ از ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

ذمہ دار ہے، اس پر عمل کرنا۔ ۔

۔ جب خلیفہ طائع باللہ نے عضد الدولہ کو سات خلعتیں، سیاہ عمامہ، کنگن اور ایک تاج اور دوسرے اعزازات سے سرفراز فرمایا تو اس نے یہ موقع غنیمت جانا اور خلیفہ پر زور ڈالا کہ میرے لئے اسی طرح سے تفویض و قائم مقامی کی رسم ادا کی جائے، جس طرح خود مختار گورنروں کے لئے خلفاء کا معمول تھا، اس نے خلافت کی روایات کے خلاف تفویض کی تحریر کو لوگوں کے سامنے سنانے کے لئے خلیفہ کو آمادہ کر لیا ورنہ خلیفہ کا قاعدہ تھا کہ اپنے خود مختار گورنروں کے لئے ایک تحریر لکھتا تھا اور بغیر دکھائے ہوئے سر بمہر کر دیتا تھا اور اس سے کہتا تھا یہ "تفویض" ہے جو کچھ اس میں ہے اس پر تمہیں عمل کرنا چاہیئے، عضد الدولہ نے خلیفہ سے جو کچھ کرایا وہ اس کا فرض نہ تھا مگر وہ مجبور تھا اس کی مجبوری کا اندازہ اس سے کیجئے کہ جب کسی سفر سے عضد الدولہ بغداد لوٹتا تھا تو اس کے استقبال کے لئے خلیفہ کا باہر آنا ضروری تھا۔ [1]

عضد الدولہ اور طائع باللہ کے تعلقات جب خراب ہو گئے تو اس نے دو ماہ کے لئے بغداد اور دوسرے بڑے بڑے شہروں میں طائع باللہ کے نام کو خطبہ سے خارج کرا دیا اور خلیفہ کو مجبور کر کے اپنی ڈیوڑھی پر فجر، مغرب اور عشاء کے وقت تین مرتبہ نوبت بجنے کا حکم صادر کرا لیا، اس سے قبل یہ امتیاز صرف قصر خلافت کے ساتھ خاص تھا۔

عضد الدولہ نے اختلافات کی ایک وسیع خلیج حائل ہونے کے باوجود انھیں عام مجلسوں میں کبھی محسوس نہ ہونے دیا، ان اوقات میں وہ نیازمندانہ حیثیت سے پیش آتا تھا۔ اس پالیسی کا عوام اور خلوت کے معاملات سے ناواقف نفوس پر نہایت اچھا اثر پڑتا تھا۔

سیوطی [2] نے ۳۶۹ھ کے حوادثات کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ عضد الدولہ عام مجلسوں میں خلیفہ کے ساتھ نہایت عزت اور احترام سے پیش آتا تھا اور عوام کو یہ باور کرانے کی ہمیشہ کوشش کرتا

---

[1] ابن الاثیر ج ۸ ص ۲۷۴ [2] تاریخ الخلفاء ص ۲۷۰

کہ میرا اثر و اقتدار خلیفہ کی جوتیوں کا صدقہ ہے، اس میں سیاسی غرض یہ پنہاں تھی کہ رائے عامہ قابو میں رہے۔ عوام خلیفہ کی اس بے بسی کے دور میں بھی اسے سب سے بڑا مذہبی اور سیاسی فرمانروا خیال کرتے تھے اور اس کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت سمجھتے تھے۔

۳۷۲ھ میں عضد الدولہ کا انتقال ہوگیا اور اس کا لڑکا صمصام الدولہ اس کا جانشین ہوا، دربارِ خلافت سے اسے شمس الملت کا خطاب اور دوسرے اعزازات مرحمت فرمائے گئے۔ تھوڑے عرصہ بعد اس کے بھائی شرف الدولہ نے اس پر چڑھائی کردی اور گرفتار کرکے اس کی آنکھوں میں سلائی پھروادی اور اس کے حامیوں کو سخت سزائیں دیں۔ اس کامیابی کے بعد بغداد آیا، جہاں خلیفہ نے اُسے فتح و کامیابی پر تہنیت پیش کی اور دربارِ خلافت سے اس کا قبضہ صحیح تسلیم کرلیا گیا، اس وقت ایک معاہدہ لکھا گیا جو خلیفہ کے سامنے پڑھا گیا۔[۵۱]

شرف الدولہ کی وفات (۳۷۹ھ) کے بعد اس کا بھائی ابو نصر جانشین مقرر کیا گیا اسے دربارِ خلافت سے بہاؤ الدولہ اور ضیاء الملۃ کے خطابات عطا ہوئے۔ جب یہ دربارِ خلافت گیا تو طائع نے اعیانِ خلافت کے سامنے اُسے سات خلعتیں مرحمت فرمائیں، ان میں سیاہ خلعت جو غیر معمولی اعزاز کی حامل تھی، نیز ایک سیاہ عمامہ، ایک بڑا سا طوق اور دو کنگن عنایت کیے گئے اور دربار میں حاجبوں کی تلواروں کے سایہ میں خلیفہ کے حضور میں لایا گیا اور زمین بوس ہوکر کرسی پر اسی کے پاس بیٹھ گیا اس وقت "تفویض" کی تحریر کو سنایا گیا۔

۳۸۱ھ میں بہار الدولہ نے طائع باللہ کو معزول کردیا، الزام یہ لگایا گیا کہ اس نے بہاؤ الدولہ کے ایک خاص آدمی کو محبوس کردیا تھا۔ اس واقعہ کی خبر سن کر بہاؤ الدولہ خلیفہ کے پاس پہنچا اس وقت وہ صحن میں تلوار ڈالے بیٹھا تھا، بہاؤ الدولہ نے زمین بوسی کی رسم ادا کی اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں بہار الدولہ کے آدمی خلیفہ پر ٹوٹ پڑے اور اسے تخت سے گھسیٹ کر ایک کٹھری میں باندھ لیا اور اپنے دار الحکومت لے گئے۔ جہاں بہاؤ الدولہ نے خلیفہ سے دست برداری کا

۵۱؎ سیوطی ص ۲۷۱۔ ۵۲؎ ص ۲۷۲۔

اقرار نامہ لکھوایا اور ممتاز افراد کی شہادت اس پر ثبت کرائی اور اس کی جگہ اس نے قادر باللہ کو خلیفہ مقرر کر دیا۔ یہ ۱۹ رشعبان ۳۸۱ھ کا واقعہ ہے۔ معزول خلیفہ اپنی موت ۳۹۳ھ تک نہایت عزت و احترام کے ساتھ قادر باللہ کے محل میں نظر بند رہا۔

قادر اور قائم قادر باللہ، خطیب بغدادی کے الفاظ میں "حکومت کی صلاحیت رکھتا تھا، تہجد گذار تھا، خیرات و صدقات کا خوگر تھا، حسنِ سیرت اور حُسنِ اطوار میں ممتاز تھا، سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مذہبی عقائد نہایت اچھے تھے"۔ ؎۱

بہاء الدولہ کا اقتدار قادر باللہ کے عہد میں اور بھی بڑھ گیا، خلیفہ کو کوئی قوت حاصل نہ رہی اور سارا اقتدار اس کے ہاتھ میں آگیا۔ بہاء الدولہ نہایت متعصب شیعہ تھا اور ہمیشہ فاطمیوں کی حمایت کرتا تھا۔ ان حالات نے دونوں کے اندر طبعی طور سے اختلافات پیدا کر دیئے تھے۔ ذہبی کی روایت کے مطابق ان دونوں میں صفائی کرانے کے لئے چند با اثر امراء درمیان میں پڑے تھے اور اس مقصد کے لئے ایک عظیم الشان دربار خلیفہ القادر کے سال جلوس ماہِ شوال ۳۸۱ھ میں منعقد ہوا تھا جس میں ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا عہد کیا گیا تھا۔

بہاء الدولہ کے زمانہ میں عراق میں بنی بویہ کی حکومت پر خطرات نے یورش شروع کی ۔ سنہ۴۰۱ھ میں قرواش بن مقلد، موصل، انبار، مدائن اور کوفہ کے فرماں روا نے اپنے حدودِ مملکت میں فاطمی خلیفہ کا خطبہ پڑھا۔ بہاء الدولہ نے یہ سنا تو ایک فوج اس غرض سے بھیجی کہ وہ خلیفہ عباسی کا خطبہ پڑھنے کے لئے اس پر دباؤ ڈالے۔ ؎۲ اس کارروائی سے سیاسی غرض عراق میں بنو بویہ کے اقتدار کا استحکام تھا، عراق میں سنیوں کی اکثریت تھی اور ان پر اس قسم کی باتوں کا نہایت اچھا اثر پڑتا تھا۔

قادر باللہ کے بعد اس کا بیٹا قائم بامر اللہ (۴۲۲-۴۶۷ھ = ۱۰۳۱-۱۰۷۵ء) خلیفہ ہوا۔ بنی بویہ کا تسلط اور استبدادِ حکومت اس کے زمانہ میں بھی بدستور قائم رہا۔ سرٹامس آرنلڈ کے

؎۱ تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۷۔ ؎۲ حاشیہ کتاب تجارب الامم لابی شجاع ص ۵۴ و ابن اثیر ج ۶ ص ۲۷۔

الفاظ میں "اس وقت عباسی خلیفہ کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی، ان کی سیاسی حیثیت کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ وہ عالمِ اسلامی پر حکومت ضرور کرتے تھے مگر نظم و نسق میں دخل تو بڑی بات ہے، اُن سے کبھی کوئی مشورہ تک نہیں لیا جاتا تھا۔ وہ سلاطین بنی بویہ کے ہاتھوں میں ایک کھلونا تھے جب جی چاہتا تخت پر بٹھا دیتے اور جب جی اکتا جاتا اُتار دیتے"۔[1] اس سیاسی ماحول میں بساسیری[2] نے بغداد پر (۴۵۰ھ) چڑھائی کر دی اور وہاں سے آلِ بویہ کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا، اب بساسیری نے خلیفہ کو نظر بند کر دیا اور اس پر ظلم و ستم ڈھانے شروع کر دیئے، ان مصائب سے تنگ آکر خلیفہ نے طغرل بک سے امداد کی درخواست کی جس نے ۴۵۱ھ میں بساسیری کو نکال باہر کیا۔

آلِ بویہ کے زمانہ میں خلافتِ عباسیہ کا نظم و نسق ایک اجنبی طاقت کے اشارہ سے گردش کرتا تھا اس وقت خلیفہ کو حکومت میں کوئی دخل نہ تھا، وہ صرف مذہبی اجارہ دار تھا۔ خطبہ میں اس کا نام لیا جاتا اور سکہ اس کے نام سے جاری تھا۔ یہ سب سیاسی اغراض بروئے کار لانے کے لئے کیا جاتا، ان نمائشی باتوں سے رائے عامہ کو قابو میں رکھنا . . . . مدنظر تھا، خلفاء کی اس انتہائی بے چارگی کے باوجود آلِ بویہ کی یہ شاطرانہ پالیسی تھی کہ وہ محفلوں اور اجتماعی مجلسوں میں ان کے آداب و احترام کا بے حد خیال رکھتے تھے اور عوام کو یہ محسوس کرانے کی کوشش کرتے کہ وہ خلیفہ کو مسلمانوں کا سب سے بڑا فرماں روا سمجھتے ہیں، خلیفہ ان مجلسوں میں سفیروں کا استقبال کرتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ردائے اقدس اوڑھتا اپنے سامنے مصحفِ عثمانؓ رکھتا، یہ سب مذہبی اقتدار کی نمود و نمائش کے لئے کیا جاتا، عضد الدولہ کا عہد آلِ بویہ کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے اس کا دائرہ حکومت ان ممالک تک وسیع تھا جو بحرِ قزوین، خلیج فارس اور اصفہان سے حدود سوریہ تک پھیلے ہوئے ہیں ان ملکوں میں خطبہ اور سکہ بھی اسی کے نام کا جاری تھا!

---

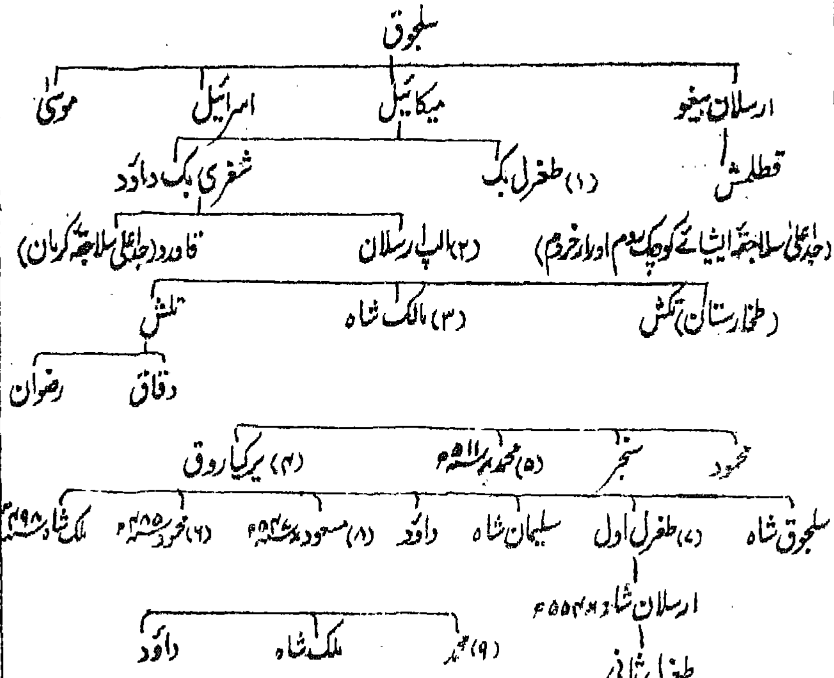
[1] The Caliphate. P. 68.

[2] ابو الحارث ارسلان بن عبد اللہ، بسا، فارس میں ایک شہر ہے اسی کی طرف انتساب ہے۔ بہاء الدولہ کا غلام تھا۔

خلافتِ عباسیہ سلاطینِ سلجوق کے عہد میں

(۴۴۷ھ-۶۵۶ھ=۱۰۵۵ء-۱۲۵۸ء)

عراق میں سلاطینِ سلجوق



سلاطینِ سلاجقہ کا مورثِ اعلیٰ سلجوق بن تقاق، ترکمان کا ایک رئیس تھا، اس کا اصلی وطن بلاد ماوراء النہر تھا، عراق میں سلجوقیوں کی حکومت کا مؤسس طغرل بک سلجوقی تھا، اس نے بلادِ خراساں پر حملہ کیا اور حکومتِ غزنی کے مغربی ممالک پر قبضہ کرلیا، اسی زمانہ میں طغرل نے آلِ بویہ کی سلطنت کا جنازہ عراق میں دفنا دیا اور وہاں سلجوقیوں کی حکومت کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اس کے بعد ۴۴۷ھ میں بغداد میں داخل ہوا اور تاتاریوں کی یورش ۶۵۶ھ ۱۲۵۸ء تک وہ اور اس کے جانشین وہاں کے سیاسی فرمانروا رہے۔

بساسیری کی شورش سنہ ۴۵۰ھ میں ارسلان ترکی نے جو بساسیری کے نام سے معروف تھا، بغداد پر ترکوں اور مصریوں کی امداد سے تسلط قائم کرلیا، اور تقریباً ایک سال تک بغداد کے ممبروں پر مستنصر فاطمی کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور اذان میں "حی علیٰ خیر العمل" کا فقرہ بڑھا دیا گیا۔ بساسیری نے خلیفہ کو نظر بند کر دیا تھا، خلیفہ نے طغرل بک سے امداد کی درخواست کی طغرل بک نے خلیفہ کو اس کی قید سے رہائی دلائی اور نہایت عزت واحترام کے ساتھ بغداد روانہ کر دیا، یہ سنہ ۴۵۱ھ کا واقعہ ہے، طغرل بک نے بساسیری کو شکست فاش دی اور اس کا سر بغداد بھیج دیا۔

خلیفہ رہائی کے بعد زندگی بھر جا نماز پر سوتا رہا اور ہمیشہ روزہ و نماز سے شغل رکھتا تھا کہتے ہیں نظر بندی کی حالت میں اس نے اپنی مظلومی اور بساسیری کے ظلم واستبداد کی تفصیل لکھ کر مکہ معظمہ بھجوا دی تھی جہاں اسے کعبہ میں لٹکا دیا گیا تھا، اس میں خدا سے بساسیری کے ظلم وستم کی شکایت کی تھی اور دعا کی تھی کہ وہ اپنے کیفر کردار تک پہنچے۔

خلفاءِ عباسیہ کی حالت سلجوقیوں کے دورِ اقتدار میں بھی خلفاءِ عباسیہ کی بیچارگی آلِ بویہ کے دور سے کچھ کم نہ تھی، فرق اتنا تھا کہ امرائے بنی بویہ خود بغداد میں رہتے اور فرمان روائی کرتے تھے لیکن سلجوقی فرمانروا خود دارالخلافت میں نہیں رہتے تھے بلکہ ان کے بجائے ان کے سپہ سالار ان کے نائب کی حیثیت سے عراق پر حکومت کرتے اور وہاں کی سیاسی مشینری پر قابض تھے۔

اس دور میں عباسی خلفاء کی بے بسی کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو قائم باللہ (۴۲۲ھ - ۴۶۷ھ) کے عہد میں پیش آیا تھا، واقعہ یہ تھا بغداد کے شہری شراب نوشی اور ناچ گانے والی عورتوں کی کثرت سے جب پریشان ہو گئے تو ان کے خلاف احتجاج کیا۔ اس دوران میں کسی شہری نے ایک سپاہی کی داشتہ مغنیہ کے عود کے تار توڑ دیئے۔ داشتہ نے سپاہی سے شکایت کر دی سپاہی نے اس شہری کو زدوکوب کیا، اہلِ شہر خلیفہ کے پاس پہنچے ان میں بہت سے جلیل القدر ائمہ بھی شامل تھے، ان لوگوں نے خلیفہ سے اس واقعہ کی تحقیق اور مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانے کی التجا کی اور درخواست کی کہ تمام شراب خانے منہدم کر دیئے جائیں اور آئندہ کے لئے

ان کے رواج کو ممنوع قرار دیا جائے۔ خلیفہ نے ان سے وعدہ کرتے ہوئے کہا بہت اچھا! اس واقعہ کے متعلق میں سلطان (سلجوق) کو لکھوں گا۔ [1]

آلِ بویہ کی طرح سلجوقیوں نے بھی خلفاء عباسیہ کی معیشت اور گزر اوقات کے لئے جاگیریں مقرر کردی تھیں، ان کا انتظام ایک وزیر اور اس کے پرائیویٹ سکرٹری کے سپرد ہوتا تھا [2]۔ خلفاء کو حکومت کے نظم ونسق میں دخل دینے کا کوئی مجاز نہ تھا، خطبہ ان کے نام کا ضرور پڑھا جاتا تھا، یہ اپنے اوقات محلات کی تعمیر اور مرمت میں صرف کرتے تھے [3]

خلفاء عباسیہ کے ساتھ سلجوقیوں کا برتاؤ

عباسی خلفاء کے ساتھ سلجوقی فرمانرواؤں کا برتاؤ آلِ بویہ سے بہت بہتر تھا، وہ خلفاء کا بے حد پاس اور لحاظ کرتے تھے، ان کے ادب اور احترام پر طغرل بک کی قائم باللہ سے وہ ملاقات بخوبی روشنی ڈالتی ہے جو ۴۴۹ھ میں دونوں میں ہوئی تھی، جب وہ موصل پر قبضہ کرنے اور دبیس بن فرید اور قریش بن بدران کی شورشوں کو دبانے کے بعد بغداد آیا تھا۔ [4]

طغرل بک نے یہاں سے واپس جانے کے بعد بہت سے ہدایا خلیفہ کی خدمت میں بھیجے تھے جن میں پچاس ہزار دینار (۲½ لاکھ روپیہ) پچاس ہزار ترک غلام اور بہت سے گھوڑے اور اسلحہ وغیرہ شامل تھے۔

آلِ بویہ میں عضد الدولہ نے بھی خلیفہ طائع باللہ کے ساتھ ایک عام دربار میں بے حد عقیدت اور نیازمندی کا اظہار کیا تھا لیکن اس کی اس پردہ زنگاری میں سیاسی غرض پنہاں تھی اور وہ خلیفہ فاطمی عزیز کے قاصد کے سامنے جو اس وقت دربار میں موجود تھا اپنے اثر و اقتدار کا مظاہرہ کرتا تھا۔

شاہانہ تقریبات کے موقعوں پر خلفاء عباسیہ اور سلاطین سلاجقہ ایک دوسرے کو

---

[1] ابن اثیر ج ۱۰ ص ۳۸۔ [2] بغدادی زبدۃ الفکر ص ۱۹۴ [3] Le-Strange. P.327.
[4] تفصیل دیکھئے ابن اثیر ج ۹ ص ۲۶۴ و ۲۶۵۔

خلعت بھیجتے تھے یہ ان کے خوش گوار مراسم کا آئینہ دار ہے۔ جب کوئی خلیفہ عباسی تخت پر بیٹھتا تو وہ سلجوقی فرمانروا سے اپنی بیعت کے لئے نمائندہ روانہ کرتا اور خلعت اور ہدایا سے اُسے نوازتا تھا، اور سلجوقی فرمانروا اپنی رسم مسند نشینی کے بعد خلیفہ سے اس کا نمایندہ ہونے کی حیثیت سے حکومت کرنے کی اجازت حاصل کرتا تھا[۱]۔ مورخین ان خوش گوار تعلقات کی حقیقی وجہ مذہبی عقائد اور خیالات کی وحدت قرار دیتے ہیں۔ عباسی خلفاء کی طرح ان کا مذہب بھی سُنی تھا۔ سر ٹامس آرنلڈ کے الفاظ میں

"سلجوقی فرمانروا خلیفہ عباسی کا اس لئے احترام نہیں کرتے تھے کہ انھیں وہ عالم اسلامی کا سیاسی مرکز خیال کرتے تھے بلکہ اس لئے کہ وہ ان کے نقطۂ نظر سے خدا کے نائب تھے[۲]۔"

یہ تعلقات باہمی شادی بیاہ کے مراسم سے اور زیادہ مستحکم ہو گئے تھے، سنہ ۴۵۴ھ میں طغرل بک نے خلیفہ قائم باللہ کی بیٹی سے شادی کی تھی قائم باللہ کے بیٹے مقتدی باللہ کی شادی الپ ارسلان کی بیٹی سے سنہ ۴۶۴ھ میں ہوئی تھی، خلیفہ مستظہر باللہ (سنہ ۴۸۷ھ۔ سنہ ۵۱۲ھ) نے سنہ ۵۰۲ھ میں سلطان ملک شاہ سلجوقی کی بیٹی سے شادی کی تھی، خلیفہ مقتفی (سنہ ۵۳۰ھ۔ سنہ ۵۵۵ھ) نے سلطان محمود کی بہن فاطمہ بنت محمد بن ملک شاہ سے شادی کی تھی[۳]۔ ان شادیوں نے باہمی تعلقات پر نہایت اچھا اثر ڈالا تھا۔

ان مستحکم مراسم کے باوجود عباسی خلفاء اور سلجوقی سلاطین میں باہم تصادم ہوتا رہا۔ سلطان ملک شاہ سلجوقی کا عتاب خلیفہ مقتدی باللہ پر نازل ہوا تھا اور اس نے بغداد سے اُسے بصرہ جلاوطن کر دیا تھا، اسباب مختلف بیان کئے جاتے ہیں، سر ولیم میور کا خیال ہے "حکومت کے نظم و نسق میں خلیفہ نے دخل دیا تھا[۴]۔" ابن خلکان کی رائے ہے "ملک شاہ جعفر بن مقتدی کو ولی عہد خلافت بنانا چاہتا تھا، خلیفہ نے اس کی خواہش کو ٹھکرا دیا تھا۔"[۵]

---

[۱] ابن اثیر ج ۱۰ ص ۴۰ و ۶۴۔ [۲] The Caliphate. P. 80. [۳] ابن اثیر ج ۱۰ ص ۸، ۲۹، ۱۱۹، ابن خلکان ج ۲ ص ۱۶۲، ۱۶۳ [۴] Sir William Muir. P.577. [۵] ابن خلکان ج ۲ ص ۱۶۴۔

سر ٹامس آرنلڈ کی تحقیق ہے۔

"سلجوقیوں نے اپنے لئے "ظل اللہ" کا لقب اختیار کیا تھا جو خلفاء عباسیہ کے لئے مخصوص تھا اور خلیفہ مسترشد (۵۱۲ھ ۵۲۹ھ) سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ردائے اقدس لے لی تھی جسے خلفاء عباسیہ خلافت کی بیعت کے وقت اور مذہبی مجالس میں شرکت کے وقت زیب تن فرماتے تھے [1]

اسی طرح ملک شاہ سلجوقی نے اپنے لئے "امیر المومنین" کا لقب اختیار کر لیا تھا، جو صرف خلفاء عباسیہ کے لئے خاص تھا" [2]

مگر حقیقت یہ ہے کہ آل بویہ کے مقابلہ میں سلجوقی فرمانرواؤں سے اس قسم کی بہت کم حرکتیں سرزد ہوتی تھیں۔

خلفاء عباسیہ کے اقتدار کا احیاء

سلجوقی فرمانرواؤں کے حسن سلوک نے عباسی خلفاء کے دل میں اپنے کھوئے ہوئے اقتدار و نفوذ کے احیاء کی خواہش پیدا کر دی تھی اور انھوں نے اس کے لئے عملی جدوجہد بھی شروع کر دی تھی، سلجوقیوں کے آخری عہد میں عباسی خلفاء اپنے مقصد میں کسی قدر کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ اس وقت ان کے داخلی اختلافات نے ان کی قوت کو منتشر کر دیا تھا اور عباسی خلفاء نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔

مقتدی اور مسترشد

خلیفہ مقتدی (۴۶۷ھ۔ ۴۸۷ھ) نے حکومت کے نظم و نسق میں ملک شاہ سلجوقی کے عہد میں دخل دیا تھا جس کی پاداش میں .... اسے دار الخلافت سے ..... نکل جانے کا حکم صادر ہوا تھا ابن خلکان نے لکھا ہے کہ ملک شاہ جب آخری مرتبہ بغداد آیا تو اس نے خلیفہ کے بصرہ چلے جانے پر اصرار کیا۔ اس نے بیان کیا ہے کہ خلیفہ کے دو لڑکے تھے مستظہر باللہ اور ابو الفضل جعفر ابن بنت ملک شاہ، خلیفہ نے مستظہر باللہ کو ولی عہد مقرر کیا تھا کیونکہ وہ سب سے بڑا لڑکا تھا، لیکن ملک شاہ نے خلیفہ کو مجبور کیا کہ وہ مستظہر کے نام کو قلمزد کر دے اور اس کی جگہ پر جعفر کو ولی عہد مقرر کرے

---

[1] The Caliphate. P 60
[2] Cambridge Medeual History. Vol-IV. P 302.

اور بغداد جعفر کو سونپ کر خود بصرہ چلا جائے، یہ خلیفہ پر گراں گذرا، خلیفہ نے بہت کوشش کی کہ سلطان اپنے اس حکم کو واپس لے لے، مگر وہ نہ مانا، خلیفہ نے دس روز کی مہلت مانگی کہ وہ اپنی روانگی کے انتظامات کرلے، یہ مہلت دیدی گئی۔ بیان کیا گیا ہے، خلیفہ ان دنوں میں برابر روزہ رکھتا تھا اور افطار کے وقت خاکستر پر بیٹھ کر سلطان کے لئے بددعائیں کرتا تھا غالباً انھیں بددعاؤں کا اثر تھا کہ سلطان انھیں ایام میں بیمار پڑا اور مرگیا۔ اور خلیفہ اس کے فرعونی حکم سے مامون رہا۔

ملک شاہ کا جب انتقال ہوگیا تو اس کی بیوی ترکان خاتون نے اس کی موت کو پوشیدہ رکھا اور امراء کو مخفی طور سے جمع کیا اور اپنے بیٹے محمود کے بارے میں جو صرف ۵ برس کا تھا۔ حلفِ وفاداری لے لیا، زاں بعد مقتدی کے پاس اپنے نمائندوں کے ذریعہ جدید فرمانروا کی حکومت تسلیم کرنے کی درخواست کی، خلیفہ نے اسے شرفِ قبول بخشا۔ اور جدید سلطان کو "ناصر الدین والدنیا" کا لقب دیا۔ . . . . . دوسرے روز اچانک اس خلیفہ کا انتقال ہوگیا اور خلیفہ مقتدی کے بیٹے مستظہر کی بیعت کرلی گئی"۔ ۵۲

ملک شاہ کے عہد میں . . . . خلیفہ مقتدی نے جو پالیسی اختیار کی تھی، اس کے جانشینوں نے بھی اسی پر عمل کیا، خصوصیت کے ساتھ مسترشد باللہ (۵۱۲ھ ۵۲۹ھ = ۱۱۱۸ء - ۱۱۳۵ء) کے عہد میں یہ پالیسی کھل کر سامنے آئی، اس کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ عباسیہ کے دورِ عروج کا احیاء کیا جائے، مگر وہ اپنے اس ارادہ میں کامیاب نہ ہوسکا، اگرچہ نہایت ہی متقی، پرہیزگار اور بلند ہمت خلیفہ تھا۔

سیوطیؒ نے اس کی تعریف میں لکھا ہے کہ "وہ بلند ہمت، نہایت ہی بہادر، جری، مدبر اور بڑا باہیبت خلیفہ تھا، اس نے خلافت کے نظم و نسق کو درست کیا اور اس میں صحیح اور بہتر تنظیم و ترتیب قائم کی، خلافت کے امتیازات کو زندہ کیا اور اس کی عظمت کو بڑھایا، ارکانِ شریعت کو مستحکم کیا، یہ خلیفہ بذاتِ خود جنگوں میں شریک ہوتا تھا"۔ ۵۳

---

۵۱ ابن خلکان ج ۲، ص ۱۶۴ - ۵۲ تاریخ الخلفاء ص ۲۸۱ و ۲۸۲ - ۵۳ ایضاً ص ۲۸۶ -

۵۲۰ھ میں مسترشد باللہ نے سلطان محمود بن محمد بن ملک شاہ سلجوقی پر چڑھائی کر دی اور اسے شکست دی، ممکن تھا، اس وقت وہ سلجوقیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا، لیکن بدقسمتی سے محمود کو حاکم بصرہ، زنگی کی کمک پہنچ گئی اور وہ سنبھل گیا۔ جب سلطان محمود کا انتقال ہو گیا تو مسترشد نے خاندانِ سلجوقی کے بعض امراء کو جدید سلجوقی سلطان کے خلاف ابھار دیا، یہ باہم دست و گریباں ہو گئے تو اس نے زنگی کی بری طرح خبر لی اور موصل تک اسے بھگا دیا، جہاں تین ماہ تک محاصرہ رہا۔ یہ ۵۲۷ھ کا واقعہ ہے اس کے بعد ہمدان کے قریب مسعود کے لشکر سے اس کا مقابلہ ہوا۔[۵] اس حملہ میں سلجوقی خاندان کا ایک امیر سلجوق نامی خلیفہ کا ہمرکاب تھا۔ اس میں مسترشد باللہ کو شکست ہوئی اور وہ اسیر ہوا اور اسے ایک خیمہ میں محبوس کر دیا گیا۔ جہاں فرقۂ باطنیہ کے ایک گروہ نے اسے قتل کر دیا۔

اب سلطان مسعود کے راستہ سے اگرچہ ایک بہت بڑا روڑا ہٹ گیا تھا لیکن اُسے مسرت کی جگہ انتہائی افسوس ہوا۔ اور ایک وسیع پیمانہ پر مجلسِ عزا منعقد کی جس میں اپنے شدید رنج و الم کا اظہار کیا۔ بغداد یہ خبر پہنچی تو وہ ماتم کدہ بن گیا۔ شہری بڑے بڑے جلوسوں کی شکل میں چاک گریباں، ماتم کناں باہر نکلے، عورتوں کا یہ حال تھا کہ بال بکھرے ہوئے تھے اور سر پیٹتی ہوئی مرثیے پڑھ رہی تھیں، وجہ یہ تھی کہ مسترشد عالمگیر مقبولیت رکھتا تھا اور نیک سلوکی، شجاعت، عدل و انصاف، رواداری اور نرم خوئی نے اسے غیر معمولی طور پر ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔

راشد اور مقتفی | مسترشد کے بعد اس کا بیٹا راشد (۵۲۹ھ ۔ ۵۳۰ھ = ۱۱۳۵ء-۱۱۳۶ء) خلیفہ ہوا، اس نے اپنے باپ کی پالیسی اختیار کی، یہ باپ کی موت سے بے حد متاثر تھا، اسی تاثر کا نتیجہ تھا کہ انتقام کے جوش میں اس نے سلطان مسعود کے قاصد کی بے حرمتی کی تھی اور رائے عامہ کو مسعود کی بربادی کے لئے بھڑکایا تھا، مسعود کو جب ان باتوں کی خبر ہوئی تو اس نے بغداد کا محاصرہ کر لیا، اس وقت خلیفہ موصل بھاگ گیا اور زنگی کی پناہ لینے پر مجبور ہوا، مسعود نے بغداد میں قاضیوں اور

[۵] ابن اثیر ج ۱۰ ص ۲۴۷، ۲۶۲، ۲۸۹ ج ۱۱ ص ۲ و ابن خلکان ج ۲ ص ۱۶۴۔

ممتاز اشخاص کو جمع کر کے راشد کی مذمت کی اور برطرفی کی تحریر لکھوالی، وزیر اعظم زینبی نے اس کی تصدیق کردی اور اسی کے مشورہ سے راشد کے چچا محمد مقتفی کو سلطان مسعود نے خلیفہ مقرر کردیا۔[۱] معزولی کے چند روز بعد اصبہان کے پھاٹک پر راشد قتل کر دیا گیا، یہ ۵۳۲ھ کا سانحہ ہے سرولیم میور کی تحقیق ہے "اسے بھی باپ کی طرح فرقۂ باطنیہ کے کسی فرد نے قتل کیا تھا"۔[۲]

راشد کے بعد مقتفی باللہ (۵۳۰ھ ۵۵۵ھ = ۱۱۳۶ء / ۱۱۶۰ء) خلیفہ ہوا، اس کی سیاسی پالیسی بھی وہی رہی جو مسترشد کی تھی اور اس میں بڑی حد تک وہ کامیاب بھی ہوا تھا۔

سلطان مسعود کا ۵۴۶ھ میں انتقال ہو گیا اور اس کا جانشین اس کا بھتیجا ملک شاہ بن محمد ہوا، اس کا وقت لہو و لعب، عیش و عشرت اور سرخوشی کے عالم میں بسر ہوتا تھا حکومت کے نظم و نسق کی اسے فرصت نہ تھی، اس کی جگہ خاصبک بن بلنکری فرمانروائی کرتا تھا۔

خاصبک نے جب اس عیاش سلطان کو حکومت کا نااہل دیکھا تو اس کے بھائی محمد بن محمود سے نظم و نسق سنبھالنے کی درخواست کی اور امراء دولت نے محمود کو اپنا سلطان منتخب کر لیا۔ محمد بن محمود کی تخت نشینی کے بعد خلیفہ عباسی اور سلجوقی فرمانروا میں پھر کشمکش شروع ہو گئی۔

سیوطیؒ نے ذہبی کے حوالے سے لکھا ہے کہ

"مقتفی اعاظم خلفاء میں سے تھا وہ عالم اور ادیب تھا، شجاع اور بردبار تھا، وہ خوش خلق تھا اور سیادت و سروری کے تمام اوصاف اس میں پائے جاتے تھے اس میں امامت کی پوری صلاحیت تھی، ائمہ میں ایسی مثالیں کم ..... ہیں، اس کی حکومت میں کوئی حکم خواہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو بغیر اس کے دستخط کے جاری نہ ہوتا تھا۔ اس نے امامت کی تمام خصوصیات کی تجدید کی اور خلافت کے امتیازات کے ابھرنے کے لئے راہ کو ہموار کیا وہ حکومت کا تمام نظم و نسق اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا اور ایک سے زائد بار فوج کی کامیاب قیادت کر چکا تھا۔ مستعصم کے عہد کے بعد اب تک کوئی

[۱] الفخری ص ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۴، ۶۶۔ [۲] Muir P 580. [۳] ابن اثیر ج ۱۱ ص ۶۲، ۶۳

ایسا خلیفہ نہیں ہوا تھا جو باوجود چشم پوشی، نرم خوئی اور رحمت و رافت کے اس قدر صاحبِ جاہ وجلال، طبیعت کا صاف اور شجاع ہو، یہ نہایت عابد زاہد اور پرہیزگار خلیفہ تھا، آخر دم تک اس کی فوجوں کو کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑا۔"[1]

مورخین نے خلیفہ مقتفی کے اتقا، جرات و عظمت اور خلافت کی رفتہ شان و شوکت کے از سر نو احیاء کے لئے اس کی آرزو کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ مصنف الفخری کے بیان سے وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔ مصنف مذکور نے لکھا ہے کہ

"مقتفی نہایت بلند مرتبہ خلیفہ تھا اس نے عباسیہ کے دورِ عروج کی تجدید میں سعی و عمل کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ سلطان مسعود نے اسے تختِ خلافت پر متمکن کرنے کے بعد خلافت کا تمام سیم و زر اور مال و اسباب سمیٹنے اور عراق کے نظم و نسق کے تمام اختیارات اپنے نائبین کے تصرف میں دینے کے بعد جب خلیفہ مقتفی کی خدمت میں اپنا قاصد بھیجکر دریافت کیا کہ آپ اور آپ کے متعلقین کے مصارف کے لئے کتنی رقم درکار ہوگی لکھیئے تاکہ میں جاگیر مقرر کردوں تو مقتفی نے جواب میں لکھ بھیجا "میرے اور میرے متعلقین کے روزانہ پینے کے لئے اسّی خچر دجلہ سے پانی لادکر لاتے ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مصارف کے لئے کیا درکار ہوگا؟" مسعود نے یہ جواب سن کر کہا تھا "خدا خیر کرے بڑے بے ڈھب آدمی کا میں نے انتخاب کیا ہے۔"[2]

۵۵۱ھ میں سلطان مسعود نے بغداد کا محاصرہ کرلیا لیکن اسے بری طرح ناکامی ہوئی اس ناکامی کے بعد عراق سے سلجوقی حکومت کا گویا جنازہ اٹھ گیا تھا۔

خلفاء عباسیہ کا مذہبی اقتدار ایک مدت تک خلافتِ عباسیہ موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہی، خلفاء کبھی امراء ترک کے بازیچۂ اطفال بنے، کبھی بنی بویہ اور سلاجقہ کے کھلونے بنے مگر ان کا مذہبی اقتدار اور حیثیت سرپرستانہ ہر زمانہ میں قائم رہی۔ سلجوقیوں کے عہد میں ان کا یہ اقتدار

---

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۹۳۔ [2] الفخری، ص ۲۷۴۔

ان امراء کے اوپر بھی تھا جنھوں نے تلوار کے زور سے ممالک پر تسلط قائم کیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ یہ چیز ذہنوں میں جاگزیں تھی کہ خلافت ایک ایسا نظام ہے جو اصلاحِ عالم اور دنیا کے نظام کو صحیح حالت میں رکھنے کے لئے ناگزیر ہے اور خلیفہ اس نظامِ خلافت اور اس اقتدار کا مرکز اور سرچشمہ ہے جب خلیفہ عباسی سے دنیاوی اقتدار سلب ہوچکا تھا اور طاقت ور امراء نے جب جی چاہا قید کردیا، جب جی چاہا معزول کردیا اور جی میں آیا تو قتل کردیا، اس وقت بھی یہ عالمگیر ذہنیت فنا نہیں ہوئی تھی اور خلیفہ کا مذہبی اقتدار اپنی جگہ پر تھا۔ ایک زمانہ خلفاء پر وہ بھی گذرا تھا جب فقیروں کی طرح اس کی زندگی بھی صدقات پر قائم تھی، اس وقت بھی ان کی مذہبی فرمانروائی پر کوئی اثر نہ پڑا تھا۔ مسلمانوں کے بہت سے حکمراں اس زبوں حالی میں بھی اس کے اقتدار کے معترف اور اس سے تفویض (نیابت) کی التجا کرتے تھے کہ ان کے عقیدہ میں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین اور مسلمانوں کی قوت کا سرچشمہ تھا۔ ان امراء کی حکمت عملی اس "تفویض" سے یہ ہوتی تھی کہ وہ اپنی بزورِ شمشیر حکومت کو مذہبی حیثیت دیدیں۔ اسی پالیسی کے ماتحت سلطان محمود غزنوی (۳۸۸ھ - ۴۲۱ھ = ۹۹۸ء - ۱۰۳۰ء) نے خلیفہ مقتدی باللہ (۵۳۰ - ۵۵۵ھ) کی خلافت کے سامنے سر جھکایا تھا اور یوسف بن تاشفین شاہ "مرابطین" نے اس کی خلافت کو تسلیم کیا تھا اور اس سے شرعی "تفویض" کی التجا کی تھی، خلیفہ مقتدی نے اسے "تفویض" عنایت کی اور اس کے اختیار کردہ لقب "امیر المسلمین" کو برقرار رکھا، سیوطیؒ نے لکھا ہے

> "سنہ ۴۷۹ھ میں یوسف بن تاشفین نے سبتہ و مراکش کے حاکم کو مقتدی کی خدمت میں بھیجا تاکہ جن ممالک پر اس نے قبضہ کیا ہے ان پر حکومت کرنے کی اجازت اس کے لئے خلیفہ سے حاصل کرے اور اس کے سلطان ہونے کا اعلان کرائے، خلیفہ نے اس کی اس فرمائش کو شرف قبول بخشا اور اس کے پاس خلعت، نشان اور فرمان بھیجا اور اس کو امیر المسلمین کا لقب عطا فرمایا اس سے اسے انتہائی خوشی ہوئی اور فقہاء مغرب بھی بے حد مسرور ہوئے "مراکش" کی بنیاد اسی ابن تاشفین نے رکھی تھی" [۱]

[۱] تاریخ الخلفاء ص ۲۸۱۔

۔ عباسی خلفاء کے مذہبی اقتدار کا جائزہ لینے کے بعد یہ یقین کرتے ہیں تامل نہیں ہوتا کہ عباسی خلیفہ عالمگیر مذہبی احترام کا مرکز تھا۔ سر ٹامس آرنلڈ کا بیان ہے "خلیفہ اگرچہ عضو معطل کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن اس کے نظری اقتدار کا سب کو اعتراف تھا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب خلافتِ فاطمیہ اپنے پورے عروج پر تھی اور خلافتِ عباسیہ انحطاط کے آخری نقطہ پر تھی، تھوڑی مدت میں فاطمیوں کا آفتاب دجلہ و فرات کے کنارہ ۵۶۷ھ ۱۱۷۱ء میں غروب ہوگیا اور سیاست کی دنیا میں صلاح الدین ایوبی نمودار ہوا، جس نے عباسی خلیفہ مستضئی (۵۶۶ھ - ۵۷۵ھ = ۱۱۷۰ء - ۱۱۸۰ء) کے نام کا خطبہ مصر، بلاد مغرب یمن اور سوریہ (شام) کے منبروں پر پڑھا اور خلیفہ نے بطور اظہار خوشنودی اسے ان ممالک کی "نیابت" کا شرف بخشا تھا خلیفہ مستنصر (۶۲۳ھ - ۶۴۰ھ = ۱۲۲۶ء ۱۲۴۳ء) نے نورالدین عمر (۱۲۲۹ء ۱۲۴۹ء) کو بلادِ یمن کی "نیابت" عنایت فرمائی تھی، اسی خلیفہ نے شمس الدین التمش کو ہندوستان کی "نیابت" اور سلطان کا خطاب عطا فرمایا تھا، التمش نے بھی اپنی سلطنت میں سکہ خلیفہ کے نام سے جاری کیا تھا[ل]۔ اس بحث و نظر کے بعد عباسی خلفاء کے عالمگیر مذہبی اقتدار کا اندازہ دشوار نہیں رہتا

خلافتِ عباسیہ کا آخری دور

عالمِ اسلامی کی حالت سلطان مسعود کی موت ۵۴۷ھ کے بعد سلجوقیوں کی حکومت کا شیرازہ پراگندہ ہوگیا اور ان کی سلطنت مختلف حکومتوں میں تقسیم ہوگئی جو اتابک کی حکومت کے نام سے موسوم تھیں،

ساتویں صدی ہجری یا تیرہویں صدی عیسوی کے اوائل میں چھوٹی چھوٹی اسلامی حکومتیں مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں قائم تھیں، یہ ایک دوسرے کی حریف تھیں اور ہمیشہ

ل The Caliphate. P. 83.

آمادہ پیکار رہتی تھیں۔ مصر، فلسطین اور بلادِ شام کا بڑا حصہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے زیرِ نگیں تھا۔ سلجوقیوں کا ایشیائے کوچک پر تسلط تھا جو خلافتِ عباسیہ کے خاتمہ تک قائم رہا۔

مشرق میں خوارزم کی بہت بڑی سلطنت موجود تھی، یہ ان امرائے ترک کی حکومت تھی جو خیوہ (Khiwe) سے (نواح خوارزم میں ایک مقام جہاں کے باشندے شافعی تھے) آئے تھے اور دولتِ سلجوقیہ کے صوبوں پر تسلط جمالیا تھا۔ ان کا دائرہ حکومت دریائے گنج اور دجلہ کے درمیانی علاقہ تک وسیع تھا، اگرچہ خوارزم شاہ ہندوایران کے شہریوں میں مستحکم رشتہ قائم نہ کرسکا تھا۔

دولتِ خوارزم اس زمانہ میں اسلامی دنیا چند چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں منقسم تھی، یہ حکومتیں ہمیشہ ایک دوسرے سے نبرد آزما رہتی تھیں، ان میں دولتِ خوارزم جو اتابکہ[1] کی ایک سلطنت تھی سرخاص طور سے سلجوقیوں سے برسرپیکار رہتی تھی!

اس سلطنت کی بنیاد محمد بن انوشتگین نے ڈالی تھی۔ اس کا باپ کسی سلجوقی امیر کا غلام تھا، محمد کی نشوونما اور تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی تھی، یہ بلند پایہ ادیب اور فاضل تھا، عالی ہمت اور بلند حوصلہ تھا اسے ایک حبشی جنرل برکیاروق نے بلاد خوارزم پر حاکم مقرر کیا تھا اور "خوارزم شاہ" کا لقب دیا تھا، جب سلطان سنجر بلادِ خراسان کا فرمانروا ہوا تو اس نے محمد کی فرمانروائی خوارزم اور اس کے صوبوں پر برقرار رکھی۔ یہ سلطان سنجر کا اپنی موت ۵۲۱ھ تک معتمد رہا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اتسیز جانشین ہوا۔ یہ بھی باپ کی طرح سلطان کی

---

[1] ان کا موروثِ اعلیٰ "تابک" عساکر کہا جاتا ہے اس کی اصل اتابک ہے اور اس کے معنی "ولد امیر" کے ہیں، سب سے پہلے یہ لقب نظام الدولہ وزیر ملک شاہ سلجوقی کو دیا گیا تھا، جب اسے وزیرِ اعظم ۴۶۲ھ میں مقرر کیا گیا تھا۔ اطابک کے معنی "امیراب" کے بھی بتائے گئے ہیں۔ اس سے مراد ابوالامراء سے ہے۔ وزیرِ اعظم کے بعد اس کا درجہ ہوتا تھا یہ مرتبہ اعزازی تھا۔ نظم و نسق میں اس کا دخل نہ ہوتا تھا۔
قلقشندی ج ۴ ص ۱۸ و تاریخ سلطان عماد الدین۔

نظروں میں وقیع تھا، سلطان کی اس پر بے حد شفقت تھی، یہ گھرانا ۶۲۸ھ تک حکمراں رہا، اس کے بعد تاتاریوں نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

مستضیٔ بامر اللہ (۵۶۶ھ ۵۷۵ھ = ۱۱۷۰ء ۱۱۸۰ء) کے عہد میں خوارزم شاہ ایل ارسلان بن اتسز نے وفات پائی اور اس کا چھوٹا بیٹا سلطان شاہ ابن ایل ارسلان اپنی ماں کی زیر نگرانی فرمانروا ہوا، چند روز بعد اس کے بڑے بھائی علاؤالدین تکش نے اس پر چڑھائی کر دی، اور بلادِ خوارزم پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں کا خود مختار حاکم بن بیٹھا، اسی نے ۵۹۶ھ میں سلجوقیوں کی حکومت کا جنازہ عراق میں دفنا دیا، اس کے بعد عراق سے ان کی فرمانروائی کا خاتمہ ہو گیا ۵۹۶ھ میں علاؤالدین تکش نے وفات پائی اور اس کا بیٹا قطب الدین محمد اس کا جانشین ہوا جو ۶۱۷ھ تک فرمانروا رہا (اسی سنہ سے مغلوں کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا ہے) اس کی موت کے بعد جلال الدین منکبرتی تخت نشین ہوا جو ۶۲۸ھ تک حکومت کرتا رہا، یہ اس خاندان کا آخری فرمانروا تھا۔

عباسی خلیفہ ناصر لدین اللہ (۵۷۵ھ ۶۲۲ھ = ۱۱۸۰ء ۱۲۲۵ء) کے عہد حکومت میں طغرل بن الپ ارسلان سلجوقی، علاؤالدین تکش کے ہاتھ سے مارا گیا، سلجوقیوں کی حکومت سے لئے یہ زبردست دھچکا تھا اور مستقبل میں انھیں پھر کبھی پنپنے کا موقع نہ ملا۔

علاؤالدین تکش کی حکومت کا دائرہ عمل مشرقی بلاد ماوراء النہر سے بلادِ ری تک وسیع تھا بلادِ ری کا الحاق سلجوقیوں کی شکست کے بعد ہوا تھا، پہلی دفعہ یہاں اس کا اقتدار زیادہ مدت تک قائم نہ رہ سکا تھا اور علاؤالدین کی وہاں سے روانگی کے بعد ہی خلیفہ ناصر کی فوجوں نے اس کے گورنر سے بلادِ ری خالی کرا لئے تھے۔ علاؤالدین نے یہ خبر سنی تو بلادِ ری واپس آیا اور خلیفہ کی فوجوں سے انھیں واپس لے لیا۔

علاؤالدین تکش کی وفات (۵۹۶ھ) کے بعد اس کا بیٹا قطب الدین محمد خوارزم شاہ جانشین ہوا، اس نے خلیفہ سے درخواست کی کہ عراق کے ممالک محروسہ میں میرا نام سلجوقیوں کی جگہ خطبہ میں

لیا جائے۔ خلیفہ نے اس سے انکار کر دیا، قطب الدین کو یہ چیز سخت ناگوار گزری اور اس نے بھی اپنی قلمرو میں خلیفہ کا نام خطبوں سے خارج کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں شدید کشمکش پیدا ہوگئی

تاتار | خلیفہ عباسی اور قطب الدین خوارزم شاہ کی شدید دشمنی کی وجہ سے بعض مورخین کا خیال ہے کہ خلیفہ ناصر نے جب شاہ خوارزم کی بے پناہ فوج کے اجتماع کی خبر سنی تو اپنے لئے شدید خطرہ محسوس کیا اور تاتاریوں سے ساز باز...... کی۔ مقصد یہ تھا کہ ان دو "موذیوں" میں تصادم کرادے اور خود اس شر سے مامون رہے۔

ممکن ہے یہ غلط نہو، خلفاء عباسیہ کی یہ سیاست کاری ایک مدت سے چلی آتی تھی چنانچہ انھوں نے بنی بویہ سے خط و کتابت کی تھی کہ ترک امراء کے چنگل سے بچائیں، طغرل بک سلجوقی سے درخواست کی تھی کہ بساسیری کے شر سے نجات دلائے، جس نے خلافت عباسیہ کو خلافت فاطمیہ میں تبدیل کر دینے کی ٹھان لی تھی۔ خوارزم شاہ کے پاس ڈیپوٹیشن اس غرض سے گئے تھے کہ سلجوقیوں کے اقتدار سے چھٹکارا دلائے جن اسباب کی بنا پر خلفاء عباسیہ نے بنی بویہ، سلاجقہ اور خوارزم شاہ سے امداد مانگی تھی۔ وہی اسباب تاتاریوں سے امداد مانگنے میں کارفرما ہو سکتے تھے۔

یہ شبہ سادہ لوحی پر مبنی ہے کہ بنی بویہ، سلاجقہ اور خوارزم شاہ مسلمان تھے اس لئے خلیفہ عباسی نے ان سے امداد مانگنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی تھی لیکن تاتاری بت پرست تھے، ان سے ایک خلیفہ کا مدد مانگنا قرین قیاس نہیں ہے۔ اہل بصیرت جانتے ہیں کہ سیاست کی دنیا میں مذہبی وحدت خلیفہ ناصر کے راستہ میں کبھی حائل نہیں ہوئی۔ اس کی سیاسی زندگی اس کی گواہ ہے سلطنت کی فلاح و بہبود کے لئے وہ کسی چیز کی بھی پرواہ نہیں کرتا تھا، عباسی مملکت کے تحفظ کے خیال سے خوارزم شاہ اور تاتاریوں میں تصادم کی پالیسی اس کے نزدیک ایک معمولی بات تھی، وہ جانتا تھا، تاتاریوں سے عباسی خلافت کو اس وقت کوئی خطرہ نہیں ہے وہ جغرافیائی لحاظ سے عباسی حدود مملکت سے بہت دور ہیں، دوسرے درمیان میں خوارزم شاہ کی بے پناہ فوج حائل ہے۔

ابن الاثیر[1] کے نزدیک خوارزم شاہی ممالک پر تاتاریوں کے حملہ اور بلاد اسلامیہ پر

[1] الکامل ابن اثیر ج ۱۲ ص ۲۳۶

ان کی للچائی ہوئی نگاہ کا سبب دوسرا ہے اور وہ یہ کہ ۶۱۲ھ میں چنگیز خاں نے اپنی مملکت کے چند ممتاز مسلمانوں کو خوارزم شاہ کے پاس باہمی معاہدہ کے لئے روانہ کیا تھا، ان کے ساتھ بیش قیمت ہدایا بھی بھیجے تھے، خوارزم شاہ نے اس کے شرائط معاہدہ مان لئے اور دونوں حکومتوں میں ایک معاہدہ ہو گیا اس کے بعد دونوں ملکوں کے تاجر امن و آزادی سے آنے جانے لگے۔ اربابِ سیاست کا خیال ہے کہ یہ چنگیز خاں کی سیاسی حکمتِ عملی تھی، اس نے ان تاجروں کے ذریعہ خوارزم شاہ کی فوجی طاقت کا جائزہ لیا تھا۔

اس معاہدہ کو زیادہ مدت نہیں گذری کہ تاتاریوں نے بخارا اور سمرقند پر یورش کر دی اُس وقت سمرقند اور بخارا، بلاد ماوراء النہر میں علماء کا مرکز، اور دولت و ثروت کے منبع تھے۔ اس تاتاری سیلاب نے سمرقند و بخارا کے بعد نیشاپور، مازندران، رَیّ، ہمدان اور آذربائیجان کا رخ کیا، اور انھیں بہالے گیا، اس سے فرصت ہوئی تو جرجان اور آرمینہ کبریٰ کی طرف بڑھا اور وہاں انتہائی بربریت اور بہیمیت کا مظاہرہ کیا۔ رفتہ رفتہ ان کی فتوحات کا دائرہ یورپ تک وسیع ہو گیا یہانتک کہ کوبلا خاں (۶۵۵ھ - ۶۹۳ھ = ۱۲۵۷ء - ۱۲۹۴ء) کے زمانہ میں ان کا اقبال انتہائی عروج پر تھا اسی کے دور میں خلافتِ عباسیہ کا خاتمہ ہوا تھا۔

بغداد میں خلافتِ عباسیہ کا زوال

مستعصم اور ہلاکو خاں بغداد، پانچ سو برس تک عباسیہ کا دار الخلافت اور علم و فن اور عالم اسلامی کا مرکز رہا۔ مستعصم کے عہد میں مغل تاتاریوں کے ہاتھوں سے اس کی بربادی کی رسم ادا ہوئی بربادی کا اہم سبب، مستعصم کے اردگرد نااہلوں کا حلقہ، حکومت کی صلاحیت سے عاری ہونا اور لہو و لعب میں اس کا انہماک تھا۔ وزیر اعظم موید الدین بن علقمی تاتاریوں کے بڑھتے ہوئے خطرہ سے مستعصم کو برابر آگاہ کرتا رہا مگر اس نے مطلق توجہ نہ کی۔ اس کی غفلت سے دشمن نے

فائدہ اٹھایا اور برابر اپنی قوت کو مجتمع کرتا رہا، اور مستقبل میں ایک کوہِ آتش فشاں بن کر بغداد پر ٹوٹ پڑا۔

یہ صحیح ہے کہ مستعصم نیک سیرت، متدین، نرم خو، نیک طبیعت، گفتگو میں محتاط، خوش اخلاق اور مرنج مرنجان انسان تھا، مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ فہم و فراست سے بڑی حد تک بے بہرہ، فوجی صلاحیتوں سے عاری، امورِ سلطنت سے بے خبر، لاابالی کی امید گاہ اور بے رعب و دبدبہ کا خلیفہ تھا اور معاملات کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا اس کا زیادہ وقت نغمہ و سرود اور مسخروں کی صحبت میں گذرتا تھا، اس کے خود غرض اور نمک حرام مصاحب اس پر حاوی تھے اور بدقسمتی سے سب کے سب جاہل اور نیچ ذات تھے صرف ایک وزیرِ اعظم مؤید الدین بن علقمی ضرور صاحب علم اور دانشمند تھا اور اس کا تعلق ممتاز خاندان سے تھا مگر وہ بے بس اور مجبور تھا اور صبح و شام اپنی معزولی و گرفتاری کا منتظر رہتا تھا، آخر زمانہ میں جب ہلاکو خاں کے حملہ کی افواہیں ہر طرف پھیل گئی تھیں، اس وقت بھی مستعصم نہایت مطمئن تھا اور اسے ذرہ بھر تشویش نہ تھی۔ جتنی یہ افواہیں خوفناک ہوتی جاتی تھیں اتنی ہی خلیفہ کی طرف سے سہل انکاری ظاہر ہوتی تھی۔

مؤید الدین بن علقمی اصل حالات کو خوب جانتا تھا اور اسی لئے نہایت دلسوزی سے مستعصم کو فوجی استحکامات، بیدار مغزی اور احتیاط کا مشورہ دیتا تھا، مگر اس کی باتوں کو ایک مجذوب کی بڑ سے زیادہ حیثیت نہ دی جاتی تھی، خلیفہ کے نااہل مصاحب اسے یقین دلاتے تھے کہ تاتاریوں کا کوئی خطرہ نہیں ہے وزیرِ اعظم اسے صرف اس لئے اہمیت دے رہا ہے کہ اپنی ذات نمایاں کرے اور جنگی تیاریوں کے نام سے خزانہ سے دولت لے کر اسے اپنے گھر میں سمیٹ کر رکھ لے"۔ [1]

یہ خلیفہ اور اس کے ماحول کا یہ ایک سرسری جائزہ تھا۔ اب ہلاکو خاں اور اس کے ساتھیوں

---

[1] الفخری فی آداب السلطانیہ ص ۲۶۴ و ۲۶۷۔

پر بھی ایک نظر ڈالیے۔

پروفیسر براؤن کا بیان ہے "ہلاکو خاں نے باطنیہ اور حشاشیوں کا بلادِ فارس میں سنیوں کی خوشنودی کے لئے استیصال کیا تھا۔ حشاشیوں کا صفحۂ ہستی سے خاتمہ کرنے کے بعد اس نے خلیفہ مستعصم باللہ کے پاس ہمدان سے جو اس کا فوجی مرکز تھا الٹی میٹم بھیجا کہ اگر خلیفہ نے اپنے آپ کو اور اپنے دارالسلطنت کو مغلوں کے حوالہ نہ کر دیا تو طاقت سے کام لیا جائے گا۔ اس الٹی میٹم کے جواب میں شرف الدین عبداللہ بن جوزی کو قاصد کی حیثیت سے ہلاکو خاں کے دربار میں ہمدان روانہ کیا گیا، ہلاکو نے جب اس سے تبادلہ خیالات کیا اور خلیفہ کا جواب سنا تو فوراً سمجھ گیا کہ یہ دفع الوقتی کی چال ہے۔ اس کے بعد اس نے بغداد پر حملہ کے انتظامات شروع کر دیئے اور فوجوں کو تیاری کا حکم دیدیا۔ یہ ستمبر ۱۲۵۷ء مطابق ۶۵۵ھ کا ذکر ہے۔[۵۲]

سقوطِ بغداد | نومبر ۱۲۵۷ء مطابق ۶۵۵ھ میں ہلاکو خاں بغداد پر حملہ کے ارادہ سے روانہ ہوا، اس کے ہمراہ بہت سے مسلمان امرا بھی تھے۔ ابو سعد زنگی، اتابک شیراز (حضرت شیخ سعدی کا ممدوح) بدرالدین لؤلؤ اتابک موصل (جس کی طرف مصنف "الفخری" اکثر اپنی تصنیف میں اشارہ کرتا ہے) اور اس کے پرائیویٹ سکریٹری، عطا ملک جوینی، مصنف تاریخ "گوہان گوشا" Gohan Gusha. اور مشہور فلسفی اور ماہر فلکیات نصیر الدین طوسی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔[۵۳]

مغلوں کا لشکرِ عظیم باجو خاں کی قیادت میں دجلہ کی طرف بڑھا اور تکریت پہنچا جہاں دجلہ کی مغربی جانب عبور کر کے شہر انبار پر جو فرات کے ساحل پر واقع ہے تسلط قائم کیا اس کے بعد دریائے عیسیٰ کے راستے سے ہو کر فرات کے مغربی جانب بڑھا اور فوج کے بیسرہ نے "باب کلواذی" کے قریب ڈیرے ڈال دیئے، یہ بغداد کا مشرقی پھاٹک تھا۔ مغلوں کی فوجوں کا کمانڈر انچیف چنگیز خاں کا پوتا، ہلاکو خاں تھا، یہ قلب لشکر کی کمان خود کر رہا تھا۔

---

۵۲ Broune, Literery History of Persia Vol, II. P. 440.

۵۳ الفخری ص ۲۹۶ ، Broune, Vol, II. P. 460.

اس نے وسط محرم ۶۵۶ھ ۔ ۱۲۵۸ء میں بغداد کی مشرقی سمت اپنی فوجیں اتار دیں اس وقت مغلوں کے لئے شیعوں کی ان ریشہ دوانیوں نے آسانیاں پیدا کر دیں جو سنیوں کے خلاف اس وقت اندرونِ بغداد کی جا رہی تھیں ان سازشوں کا مرکز خاص طور سے محلہ کرخ اور محلہ حی الکاظمیہ تھا جہاں فرقہ اثنا عشری کے امام سابع موسیٰ کاظم کا مشہد ہے ان دونوں محلوں کی اکثریت شیعوں پر مشتمل تھی جو سنیوں سے انتہائی بغض و عداوت اور تعصب رکھتے تھے۔ آخر میں یہ کھلم کھلا غنیم سے مل گئے اور ان کی خود اپنے ہم مذہب بھائیوں کے خلاف عملی امداد کی۔

غنیم کی ہیبت سے بغداد کے باشندے انتہائی سراسیمہ تھے، دجیل، اسحاقی، رود بار ملک اور رود بار عیسیٰ کی آبادیاں پریشانی کے عالم میں معہ اپنے اہل و عیال کے بغداد میں پناہ لینے کے لئے بھاگ کر آ رہی تھیں، اس گھبراہٹ میں مرد و عورتیں اپنے آپ کو موجوں کے حوالہ کر دیتے تھے اور پار جانے کی کوشش کرتے تھے۔ ملاح ایک جانب سے دوسری جانب پہنچانے کے عوض ایک ایک شخص سے سونے کا کنگن، منقش سنہری چادر، یا دیناروں کی معتد بہ رقم وصول کرتے تھے، جب ہلاکو خاں کا ایک جرار لشکر تیس ہزار سواروں کا دجیل پہنچا ہے، اس وقت خلیفہ کی فوج کا ایک ہراول دستہ مجاہد الدین ایبک دوبیدار کی قیادت میں نکلا۔ یہ بہت قلیل تعداد میں تھا۔ ان دونوں کا بغداد کی مغربی جانب، شہر سے قریب تصادم ہوا۔ شروع میں خلیفہ کا لشکر غالب رہا اور ہلاکو خاں کے لشکر کو سخت ہزیمت اٹھانا پڑی، کثرت سے ان کے سپاہی ہلاک اور اسیر ہوئے، اس وقت غنیم کے لئے وہ رود بار ایک مصیبت ثابت ہوئی جسے اس نے شب میں فتح کر لیا تھا۔ کیچڑ کی زیادتی نے بھاگنے والوں کے راستے مسدود کر دیئے صرف وہی لوگ جانبر ہو سکے جنھوں نے اپنے آپ کو پانی میں ڈال دیا یا وہ لوگ بچ گئے جو خشکی کے راستہ شام کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے لیکن دوبیدار صحیح سالم اپنے دستہ کے ساتھ بغداد پہنچا، اس کے بعد باجو ایک عظیم الشان فوج لے کر مغربی جانب سے بغداد میں داخل ہوا اور چند روز تاج کے سامنے

فروکش رہا اور اپنے جاسوسوں کے ذریعہ حالات کا جائزہ لیا اور اپنے موافق فضا پیدا کی چند روز میں ہلاکو خاں کا لشکر ۱۲ محرم ۶۵۶ھ میں سیلاب کی طرح بغداد کی مشرقی طرف یعقوبی درب سوامنڈ پڑا اور پورے شہر پر چھا گیا، اس وقت لوگ گھبرا کر چھتوں اور مناروں پر چڑھ گئے، ہلاکو کے لشکر نے بغداد کا چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا...... اور سامان رسد وغیرہ بند کر دیا۔ خلیفہ کا لشکر ۱۹ محرم ۶۵۶ھ تک مدافعت کرتا رہا۔

۱۹ محرم ۶۵۶ھ کا آفتاب بغداد کی تباہی لے کر طلوع ہوا اور "برج عظمی" پر جو "باب کلواذی" کی جانب واقع تھا مغلوں کا پرچم لہرانے لگا۔ یہ برج فصیل شہر کا سب سے چھوٹا دروازہ تھا، اس روز ہلاکو کی فوجیں بغداد میں داخل ہوئیں اور جس بربریت کا مظاہرہ کیا، اس کی نظیر تاریخ کے خونیں صفحات میں نہیں ملتی ہے۔

وکان ماکان مما لست اذکرہ فظن خیرا ولا تسال عن الخبر (الفخری ۲۹۷)

اس دن جو کچھ ہوا، میں اس کا ذکر کرنا نہیں چاہتا تم گمان اچھا ہی رکھو اور حالات کو نہ پوچھو

خلافتِ عباسیہ کا خاتمہ

تسخیر بغداد کے بعد عباسیوں کا آخری فرمانروا مستعصم اور تمام شاہی خاندان کے افراد گرفتار کر لئے گئے اور انھیں فوجوں کی حراست میں دیدیا گیا۔ ہلاکو خاں قصر یاموٹیہ میں جو مشرقی بغداد میں تھا ٹھہرا اور تاتاریوں نے اس کے اشارہ سے سواد اعظم کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیا، اور شہر میں آگ لگا دی، اس آگ نے خلیفہ کی مسجد، امام موسیٰ کاظم کا مشہد رصافہ کا شاہی قبرستان اور بڑی بڑی سڑکوں اور عمارتوں کو خاکستر دیا اور چند روز میں "بہشت ارضی" (بغداد) کھنڈر نظر آنے لگی۔

اس خونی ڈرامہ کا خاتمہ مستعصم اور شاہی خاندان کے سفاکانہ قتل پر ہوا۔ بغداد سے یہ تاتاری بھیڑیے دوسری حکومتوں کی گھات میں روانہ ہوئے۔ روانگی سے قبل ہلاکو خاں نے مسجد خلیفہ اور امام موسیٰ کاظم کے مقبرہ کی از سر نو تعمیر کی ہدایت کردی تھی۔ ۵

۵ حاشیہ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

بغداد، تاتاریوں کے حملہ کے بعد

تاتاری سیلاب (۶۵۶ھ) کے بعد بغداد مسلمانوں کا دارالسلطنت پھر کبھی نہ بن سکا، اگرچہ عراقِ عرب کا ایک اہم شہر ہمیشہ رہا، ہلاکو خاں کی اولاد کی حکومت فارس اور بلادِ جزیرہ پر زیادہ دن تک قائم نہ رہ سکی، ان کی حکومت کی مدت اتنی بھی نہ تھی جتنی کہ جلائیری خاندان کے سردار شیخ حسن بوزرگ (Buzurg) کی تھی جس نے ۱۳۴۰ء میں بغداد پر قبضہ کیا تھا۔ اس کے بعد ۱۳۹۳ء میں تیمور نے تسلط قائم کر لیا، اور دو ماہ وہاں مقیم رہا۔ روانگی کے وقت اپنے گورنر میرزا ابوبکر کو حکم دیا کہ بغداد کی از سرِ نو تعمیر کرائی جائے۔

اس وقت پیہم یورشوں کی وجہ سے اس کا اکثر حصہ برباد اور ویران ہو چکا تھا۔ تھوڑی مدت کے بعد سلطان احمد جلائیری نے بغداد پر پھر تسلط جما لیا اور ۱۴۱۱ء تک وہاں حکومت کرتا رہا اسی سال قرہ کیونلی (Qura Kuyunli) یا ترکمان شاہ سودا نے بغداد پر قبضہ کر لیا۔ ۱۴۶۹ء تک اس کے خاندان کی فرمانروائی رہی، ۱۴۶۹ء میں اس خاندان کے رقیب اق کیونلی (Aq. Kuyunli) یا ترکمان شاہ بیضا نے بغداد کو اس سے چھین لیا۔

۱۵۰۸ء میں اسماعیل صفوی شاہِ ایران کی فوجیں بغداد میں داخل ہو گئیں، ۱۵۲۴ء میں سلطان سلیمان قانونی کے دورِ حکومت میں ایک ترکی جنرل نے اس پر قبضہ کر لیا اور عثمانیوں کی حکومت بغداد پر قائم ہو گئی۔ لیکن شاہ عباس کے زمانہ میں ترکوں سے صفویوں نے اسے پھر چھین لیا۔ یہ بکر آغا انکشاری کی غداری کا نتیجہ تھا، ۱۶۳۸ء میں ترکوں نے ایرانیوں سے اسے دوبارہ۔

لہ Le. Strauge, Bagdad during the Abbasid Caliphate. P. 343.

لہ بغداد کی بربادی پر عبدالمومن (+ ۷۳۹ م) نے اپنی کتاب مراصد الاطلاع میں جو یاقوت کی کتاب "اسماء الاماکن والبقاع" کی شرح ہے۔ نہایت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب ۷۰۰ھ ۱۳۰۰ء کی تصنیف ہے۔ اس میں سلسلہ وار ان بربادیوں کا نہایت وضاحت سے ذکر کیا ہے جو ایرانی، ترکی اور تاتاریوں کے ہاتھوں عمل میں آئیں ان میں ہر ایک نے اپنے پیشرو کی تعمیر کو تباہ و برباد کیا۔

واپس لے لیا۔

بغداد کا سقوط اور قونیہ میں سلجوقیوں کی خود مختاری کا خاتمہ ساتھ ساتھ ہوا۔ مغلوں کی یورش سے یہ ممالک شدید قحط میں مبتلا ہو گئے تھے عراق عرب، بلاد جزیرہ، سوریہ اور بلاد ارض روم میں خاک اڑنے لگی لیکن مغلوں کے پاس اتنا کافی سامان اور دیگر ضروری اشیا تھیں کہ وہ سوریہ بآسانی پہنچ گئے اور حلب کو لوٹا اور ۱۲۶۰ء میں دمشق پر قبضہ کر لیا، ان غارت گریوں کی وجہ سے وہاں کے باشندوں پر . . . فقر و فاقہ اور صدہا مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

مستعصم کے قتل کے بعد مسلمانوں کے دلوں میں خیال قائم ہو گیا کہ اب قیامت قریب آ گئی ہے اور دنیا صرف چند دن کی ہے۔ اس وقت ہر واقعہ کی تعبیر خدا کے قہر و غضب سے کی جانے لگی اور ان حادثات سے یہ استدلال کیا جانے لگا کہ اب دنیا خلیفہ نہ ہونے سے زیر و زبر ہونے والی ہے[۱] کیونکہ عوام کا عقیدہ تھا کہ نظم کائنات کے لئے . . . خلیفہ کا ہونا ضروری ہے۔ اسی مذہبی جذبہ، یا دینی ذہنیت کا یہ اثر تھا کہ ہندوستان کے ایک بادشاہ (محمد تغلق (۱۳۲۵ء ۱۳۵۱ء) کی قلمرو میں مقتول خلیفہ مستعصم باللہ کے بعد ۳۰ برس تک اسی کے نام سے سکہ جاری رہا۔ تاتاریوں نے بغداد پر یورش کے دوران میں یہاں کے سنہرے قبوں کا سونا علیحدہ کر لیا اور قصروں کے ایرانی تحائف اور چینی نوادرات لوٹنے کے بعد انھیں منہدم کر دیا، مکاتب و مدارس کو تباہ و برباد کیا اور ان کی لائبریریوں کی کتابیں نذر آتش کر دیں یا انھیں دجلہ میں پھینک دیا۔ شہریوں کی اکثریت کو موت کے گھاٹ اتار دیا اس میں بچہ، بوڑھے، عورت مرد، بیمار اور تندرست اور عالم و جاہل کا کوئی امتیاز نہ تھا۔[۲]

متعدد خلافتیں علماء کی زبانوں پر عام طور سے جاری تھا کہ خلیفہ صرف ایک ہی شخص ہو سکتا ہے اگر ایک سے زیادہ ہوں تو ان کی حکومت غیر شرعی ہو گی اور ان سے جنگ اور ان کا استیصال ضروری ہے اس عالمگیر ذہنیت کے باوجود خلافت عباسیہ کے ضعف اور خلیفہ کے اقتدار کے خاتمہ کے بعد متعدد خلافتیں قائم ہو گئی تھیں یہ حسب ذیل تھیں۔

---

[۱] تاریخ الخلفاء ص ۳۰۹۔ [۲] تفصیل دیکھئے صبح الاعشیٰ ج ۱ ص ۴۶۶ و المختصر فی اخبار البشر ج ۳ ص ۲۰۳۔

(۱) خلافت فاطمیہ۔ ۲۹۷ھ میں بلادِ مغرب میں اس کی تاسیس عمل میں آئی اور ۳۶۲ھ میں مصر کے اندر اس کی نشاۃ ثانیہ ہوئی، تفصیل آئندہ آئے گی۔

(۲) اندلس میں اموی فرمانروا عبدالرحمٰن ثالث (۳۰۰ھ ۔ ۳۵۰ھ) کے عہد میں اموی خلافت کا سنگ بنیاد رکھا گیا، یہ بلادِ اندلس کے اموی حکمرانوں میں سب سے اولوالعزم فرمانروا تھا۔ بلادِ اندلس کے فرمانروا خلافتِ عباسیہ کو صحیح خلافت خیال کرتے تھے — کیونکہ عباسی خلیفہ کا حجاز پر تسلط تھا جو اسلام کا گہوارہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مولد اور وحی کا مہبط تھا۔ مسلمانوں کا اعتقاد تھا کہ خلافت اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتی جب تک خلیفہ کی حرمین (مکہ و مدینہ) پر حکومت نہ ہو۔[۱]

مگر جب خلفاء عباسیہ کی حیثیت کا خاتمہ ہو گیا اور وہ ترک امراء کے کھلونہ بن گئے، دوسری طرف بنی فاطمیہ کی خلافت بلادِ مغرب میں قائم ہو گئی اور وہاں کے حکمراں اپنے آپ کو "امیر المومنین" کہنے لگے تو عبدالرحمٰن ثالث نے اپنی سیاست کو عمل میں لانے کے لئے حالات کو سازگار پایا اور "امیر المومنین الناصر" کا لقب اختیار کیا۔ اس سے قبل اموی فرماں روا "بنی الخلفاء" کے لقب پر اکتفا کرتے تھے۔[۲] عبدالرحمٰن نے فرمان جاری کر دیا تھا کہ اسے اس جدید لقب سے مخاطب کیا جائے اور منبروں پر خطبہ میں اس کا ذکر کیا جائے۔ اس طرح اس وقت تین خلافتیں قائم تھیں، مشرق میں خلافتِ عباسیہ، بلادِ مغرب میں خلافتِ فاطمیہ اور اندلس میں خلافتِ امویہ۔

خلافتِ عباسیہ "فرماں روائی کے خداداد نظریہ" پر قائم تھی، خلافتِ فاطمیہ کی اساس ساسانیوں کے موروثی نظامِ مملکت اور معاہدۂ اجتماعی کے نظریہ پر تھی لیکن خلافتِ امویہ نے نہ "نظریہ خداداد حق فرمانروائی" کی پناہ لی اور نہ اپنے اقتدار کو جمہور کا عطیہ سمجھا بلکہ وہ فرمانروائی کا حق اپنی قوت اور جدوجہد کا نتیجہ خیال کرتی تھی۔

---

[۱] Adam Mez, The Peniussance of Islam I P.3

[۲] " " " " P.2

(۳) سنہ ۳۴۲ھ / ۹۵۳ء میں سجلماسہ (جبل اطلس کے جنوب میں) کے حاکم نے اپنے لئے امیر المومنین کا لقب اختیار کیا۔ [1]

(۴) خلافتِ عباسیہ کے دورِ انحطاط میں عبد الرحمٰن بن علی دولت موحدین (۵۲۴ھ – ۶۲۷ھ) کے موسس نے اپنے لئے خلیفہ اور امیر المومنین کا لقب اختیار کیا تھا اور تمام لوازم خلافت کا بلادِ مغرب میں احیاء کیا تھا۔

سنہ ۶۵۶ھ میں خلافتِ عباسیہ کا لاشہ تڑپ کر سرد ہوگیا اور اس کے ساتھ خلافت کے قدیم نظام کا بھی خاتمہ ہوگیا، اب ہر طاقتور حاکم خود خلیفہ بن بیٹھا تھا اور اپنی حکومت کے شرعی جواز کے لئے خلفاء سے فرمان یا سندِ حکومت حاصل کرنا ضروری نہ سمجھتا تھا، یہی وجہ ہے کہ مغلوں نے مسلمان ہونے کے بعد قاہرہ میں خلفاءِ عباسیہ کی کوئی پرواہ نہ کی۔ فارس میں غازان (۱۲۹۵ء – ۱۳۰۴ء) مسلمان ہونے کے بعد "سلطان اعظم سلطان الاسلام والمسلمین" بن گیا تھا۔ شاہ رخ اور تونس کا حاکم ابو عبد اللہ محمد حفصی (۱۲۴۹ء – ۱۲۷۷ء) نے بھی خلیفہ کا لقب اختیار کیا۔ ابو عنان فارس (۱۳۴۹ء – ۱۳۵۸ء) مراکش کے خانوادہ مرینیہ کے ایک فرد نے اپنے لئے خلیفہ امیر المومنین اور امام کا لقب اختیار کیا تھا، سلطان علاؤ الدین خلجی (۱۲۹۶ء – ۱۳۱۶ء) اور اوزن حسن ترکمانی (۱۴۵۳ء – ۱۴۷۷ء) بھی خلافت کے مدعی تھے۔ بلاد ماوراء النہر میں دولت ازبک (Uzbeck) کے بانی، محمد شیبانی (۱۵۰۰ء – ۱۵۱۰ء) اور مصر کے بعض مملوک سلاطین قایتبائی اور قانصوہ غوری نے بھی اپنے لئے امامت کا دعوی کیا تھا"۔ [2]

غرض متعدد خلافتوں کے قیام خصوصاً سقوطِ بغداد کے بعد خلیفہ کے مفہوم کا دائرہ عالم اسلامی کے روحانی اور مذہبی فرمانروا تک محدود نہ رہا تھا بلکہ اب اس کا اطلاق ہر طاقتور فرمانروا پر کیا جانے لگا تھا۔

---

[1] کتاب المغرب فی ذکر بلاد افریقہ والمغرب ص ۱۵۱۔

[2] The Caliphate. P.P.101-102

خلافت فاطمیہ

(۲۹۷ھ تا ۵۶۷ھ ؍ ۹۰۹ء تا ۱۱۷۱ء)

خلفاء فاطمیہ

(۱)	۲۹۷ھ	مہدی	۹۰۹ء
(۲)	۳۲۲ھ	قائم	۹۳۴ء
(۳)	۳۳۴ھ	منصور	۹۴۵ء
(۴)	۳۴۱ھ	معز	۹۵۲ء
(۵)	۳۶۵ھ	عزیز	۹۷۵ء
(۶)	۳۸۶ھ	حاکم	۹۹۶ء
(۷)	۴۱۱ھ	ظاہر	۱۰۲۰ء
(۸)	۴۲۷ھ	مستنصر	۱۰۳۵ء
(۹)	۴۸۷ھ	مستعلی	۱۰۹۴ء
(۱۰)	۴۹۵ھ	آمر	۱۱۰۱ء
(۱۱)	۵۲۴ھ	حافظ	۱۱۳۰ء
(۱۲)	۵۴۴ھ	ظافر	۱۱۴۹ء
(۱۳)	۵۴۹ھ	فائز	۱۱۵۴ء
(۱۴)	۵۵۵ھ - ۵۶۷ھ	عاضد	۱۱۶۰ء - ۱۱۷۱ء

خلافتِ فاطمیہ کی تاسیس خلافت فاطمیہ کی تاسیس ۲۹۷ھ میں بلادِ مغرب میں ہوئی اور ۳۶۲ھ میں معزلدین اللہ فاطمی کے دورِ خلافت میں اس کا مرکز مصر قرار پایا۔ فاطمی، حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہ زہراؓ کی اولاد میں تھے یہ "شیعہ" تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ خلافت کا حق خانوادۂ علیؓ تک محدود ہے۔ ابوبکرؓ، عمرؓ

عثمانؓ اور بنی امیہ اور بنی عباسیہ کی خلافت ان کے عقیدہ میں غاصبانہ قبضہ سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی

شیعی ذہنیت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی پیدا ہو گئی تھی حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں یہ ذہنیت اوجِ کمال کو پہنچ گئی تھی۔ لیکن اس وقت تک اس کی حیثیت ایک نظری عقیدہ کی تھی۔ اس نظریہ نے عملی شکل واقعۂ کربلا (۶۱ھ) کے بعد اختیار کی، اس الم انگیز سانحہ سے شیعوں کی سیاسی زندگی کی ابتدا ہوئی۔ اور وہ اپنے نظریہ خلافت کو عملی شکل دینے میں منہمک ہو گئے، اس وقت ان میں دو طبقہ پیدا ہو گئے تھے، ایک کیسانیہ جو حضرت محمد بن حنفیہ بن علیؓ کی جانشینی کا حامی تھا۔ دوسرا امامیہ تھا۔ امامیہ کے اندر چند اور فرقے پیدا ہو گئے تھے ان میں دو فرقے امتیازی درجہ رکھتے تھے ایک اثنا عشری جو حضرت حسین علیہ السلام کے بعد حضرت امام زین العابدینؓ کی امامت کا قائل تھا اور ان کے بعد ان کی اولاد کو سلسلہ بہ سلسلہ حضرت موسیٰ کاظم تک اس منصب کا مستحق سمجھتا تھا، حضرت موسیٰ کاظم کے بعد، ان کا عقیدہ تھا کہ یہ مرتبہ ان کے بارہویں امام کو ملنا چاہیئے اور وہ ان کے امام "منتظر" محمد ہیں۔

دوسرا فرقہ امامیہ اسماعیلیہ کے نام سے موسوم تھا، یہ فرقہ امام جعفر صادقؒ تک اثنا عشریہ کا ہم آہنگ تھا، امام موسیٰ کاظمؒ کے بارے میں اسے اختلاف تھا۔ وہ امام جعفرؒ کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیلؒ کو امامت کا مستحق خیال کرتا اور ان کے بعد ان کی اولاد کو نسلاً بعد نسلٍ اس منصب کا حقدار سمجھتا، اور حضرت "الحبیب" کی ذات پر اس سلسلہ کو ختم کر دیتا فاطمی خلفاء اسی اسماعیلیہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے ان کو اسماعیلیہ بھی کہا جاتا ہے۔

سنہ ۲۶۰ھ ۸۷۳ء میں امامیہ کے گیارہویں امام کی وفات کے بعد ان کی کھلی جدوجہد کا آغاز ہوا اس لئے خلفاء عباسیہ نے ان کی سخت دارو گیر اور کڑی نگرانی شروع کر دی مجبوراً اس فرقہ نے بلادِ شام میں اپنی دعوت وعمل کے مرکز مقام "سلمیہ" کو خیر باد کہا اور شمالی افریقہ کے ان علاقوں میں اپنی جدوجہد کا سلسلہ شروع کیا جو اس تحریک کو قبول کرنے کی کافی صلاحیت رکھتے تھے۔

شیعوں نے اس سرزمین کو اپنی دعوت و تبلیغ کے لئے کافی زرخیز سمجھا اور اسی لئے اس کا

انتخاب کیا، ایک تو یہ مقام بغداد کی مرکزی حکومت سے دور تھا دوسرے یہاں کے "بربر" باشندے جاہل اور اَن پڑھ تھے۔ اسلامی تہذیب و تمدن کا رنگ ان پر نہ جم سکا تھا، مزید برآں اپنے ۔ ۔ ۔ عرب حاکموں کے بھاری بھاری ٹیکس سے نالاں اور بے حد بیزار تھے۔

شمالی افریقہ کے سیاسی حالات اور بنی کتامہ کے مذہبی رجحانات نے جن پر شیعہ مبلغین کی تعلیم نے اپنا گہرا نقش قائم کر دیا تھا، مہدی کے لئے راستہ کو ہموار بنا دیا، اور وہ اس قابل ہو گیا کہ بحیثیت امام منتظر اور اولاد آل علی کے لوگوں کے سامنے آئے چنانچہ ۲۹۷ھ میں رؤسا کتامہ نے عبید اللہ مہدی کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اس کو امیر المومنین کا لقب دیا۔

خلافت فاطمیہ اور امویہ اندلس کے تعلقات کبھی خوشگوار نہ رہے، وجہ یہ تھی کہ دونوں حکومتیں اپنی مذہبی تحریک و ترغیب میں ایک دوسرے کی مخالف تھیں اور بلادِ مغرب میں اپنے اپنے دائرہ عمل کو وسیع کرنا چاہتی تھیں، اسی بنا پر اکثر اندلسی بیڑا فاطمیوں کی سرحدوں پہ یورش کرتا رہتا تھا

فتح مصر کا ارادہ مہدی (۲۹۷ھ-۳۲۲ھ) نے بلادِ مغرب میں اپنی حکومت کی بنیادیں مستحکم کرنے کے بعد مصر پر چڑھائی کر دی، لیکن ناکام رہا۔ اس کا بیٹا قائم (۳۲۲ھ-۳۳۴ھ) اور پوتا منصور (۳۳۴ھ-۳۴۱ھ) بھی اس مہم میں ناکام رہا تھا اور ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا تھا۔ درحقیقت مصر میں خلافت عباسیہ کی طاقت ابھی اتنی مضمحل نہ تھی کہ غنیم کو دریائے نیل میں ڈبو دینے کی استطاعت بھی کھو بیٹھی ہو۔

تسخیر مصر کی مہم میں فاطمی خلفا اگرچہ اس زمانہ میں ناکام رہے تھے لیکن ان کے ان حملوں کا اثر شیعیت کی نشر و اشاعت پر نہایت گہرا پڑا تھا۔ فاطمیوں کی فوجوں کے ساتھ ساتھ ان کے مبلغین بھی ہوتے تھے جو اپنا فرض نہایت تندہی سے ادا کرتے تھے۔ اسی جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ مصر فتح کرنے سے قبل یہاں شیعوں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود تھی۔

فاطمی خلفاء نے تسخیر مصر کی طرف اپنی توجہ خاص طور سے مبذول کی وجہ یہ تھی کہ مصر فوجی اور سیاسی دونوں لحاظ سے نہایت اہم مقام تھا مصر کے فرمانروا کا دائرۂ حکومت شام اور

حجاز تک وسیع تھا، اس لئے مصر پر تسلط قائم کرنے کا مفہوم شام و حجاز پر قبضہ تھا۔ حجاز و شام کی جو سیاسی اہمیت اس وقت تھی اسے بیان کرنے کی شاید ضرورت نہیں۔ مصر پر تسلط کا لازمی اثر پڑتا تھا کہ اس عہد کے تین عظیم الشان اسلامی مرکزوں فسطاط، مدینہ اور دمشق میں فاطمیوں کے مذہبی اور سیاسی اقتدار کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا۔ اسی لئے جب معز (۳۴۱ھ - ۳۶۵ھ) نے اپنے باپ منصور کی وفات کے بعد زمام خلافت سنبھالی تو اسے اپنے بزرگوں کی خواہش پورا کرنے کا خیال پیدا ہوا اس وقت خوش قسمتی سے حالات بھی سازگار تھے۔ اس طرف اندرون حکومت امن و امان تھا اور دوسری طرف کافور اخشیدی کی موت کے بعد مصر شورشوں اور بدامنیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ خلافت عباسیہ مرد بیمار کی حیثیت رکھتی تھی۔ دوسرے بیزنطینوں کے مقابلہ کی وجہ سے اس وقت وہ دوسری طرف توجہ بھی نہیں کر سکتی تھی، معز الدین نے اس سیاسی ماحول سے پورا فائدہ اٹھایا۔

معز لدین اللہ معز لدین اللہ کے دور خلافت میں فاطمیوں کے سپہ سالار جوہر صقلی نے مصر پر قبضہ کر لیا۔ جوہر نے شہر قاہرہ کی بنیاد رکھی اور شیعوں کو فاطمی مذہب کے عقائد کی تعلیم دینے کے لئے جامع ازہر کی تعمیر شروع کی، جب جوہر کو یقین ہو گیا کہ فضا پر سکون ہو گئی ہے اور خلیفہ معز بنفس نفیس زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے تو اس نے دربار خلافت کو خبر بھیجی کہ مصر، شام اور حجاز ظل ہمایونی کے ماتحت آ گئے ہیں اور دعوت فاطمی ملک کے تمام اطراف میں پھیل گئی ہے معز نے یہ خبر پا کر بلاد مغرب کے دار الخلافت منصوریہ کو خیر باد کہا اور اپنے ساتھ بیش بہا مال و دولت اور ممتاز ارکان حکومت اور اپنے تین پیش رو خلفاء کے جسموں کو لے کر مصر کا رخ کیا اور ۲۴ شعبان ۳۶۲ھ = ۳۰ مئی ۹۷۳ء کو اسکندریہ پہنچا۔ چند روز وہاں قیام کیا پھر قاہرہ آیا اور اس قصر میں فروکش ہوا جسے جوہر نے خاص اسی کے لئے تعمیر کرایا تھا، قصر میں داخل ہوتے ہی سجدہ میں گر پڑا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ دو رکعت شکرانہ نماز ادا کی،

مصر پہلے بلاد مغرب کے فاطمی خلفاء کے زیر نگیں صرف ایک دار الامارۃ تھا، لیکن اب یہ دار الخلافت میں تبدیل ہو گیا اور قاہرہ منصوریہ کے بجائے وسیع و عریض خلافت فاطمیہ کا مرکز

قرار پایا، بوسیدہ وضعیف العمر خلافت عباسیہ ختم ہوئی اور جوان شیعی فاطمی خلافت نے اس کی جگہ لی۔[۱] آدم متز (Adam Maz) کے الفاظ میں:۔

"خلیفہ فاطمی، خلیفہ عباسی کے مقابلہ میں ایک زبردست حریف ثابت ہوا۔ اس کا اثر و نفوذ عالمگیر ہوگیا اور بلادِ مغرب، مصر، بلادِ یمن اور شام میں خلیفہ عباسی کی جگہ اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔"[۲]

خلیفہ معز الدین اور اس کے جانشین نماز جمعہ ادا کرنے جس شان و شوکت سے جاتے تھے وہ ان کے جاہ و جلال اور شان و شکوہ کا آئینہ دار ہے، خلیفہ کے پہنچنے سے چند منٹ قبل قاضی القضاۃ جامع مسجد میں داخل ہوتا تھا اور منبر اور اس قبہ کو جس کے نیچے خلیفہ خطبہ دیتے وقت کھڑا ہوتا تھا، بخورات کی خوشبوؤں سے معطر کرتا تھا، خلیفہ اس روز سفید ریشمی لباس زیب تن کرتا تھا اور نہایت نفیس سفید ریشمی صافہ باندھتا تھا، شاہی عصا ہاتھ میں ہوتا تھا اور خاص محافظ پولیس افسروں اور ممتاز امراء کے جلوس میں جامع مسجد روانہ ہوتا تھا۔ پیچھے پیچھے عام لوگوں کا جم غفیر ساتھ ہوتا۔ شاہی جلوس کے ساتھ جھانجھ اور نقارہ بجتا ہوتا اور رقت انگیز آواز میں کلام پاک کی تلاوت ہوتی رہتی۔ یہاں تک کہ وہ ایک خاص نشستگاہ تک پہنچ جاتا تھا، جہاں کمانڈر انچیف، حاجب اور شاہی پولس کے افسر حفاظت کے لئے کھڑے رہتے، اذان کے بعد قاضی القضاۃ نکلتا اور بہ آواز بلند کہتا۔ "السلام علی امیر المومنین الشریف القاضی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ الصلوۃ یرحمک اللہ" یہ سن کر خلیفہ اپنے خاص حجرہ سے برآمد ہوتا، پیچھے پیچھے وزیر اعظم، اور مسلح شاہی باڈی گارڈ ہوتا تھا۔ خلیفہ منبر کے پاس اپنی خاص نشستگاہ تک اسی ہیئت میں پہنچتا اور منبر کے قریب بیٹھ جاتا۔ اس وقت مسلح شاہی باڈی گارڈ آس پاس منتشر ہو جاتا اور وزیر اعظم منبر کے پاس خلیفہ کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو جاتا، جب خلیفہ اشارہ کرتا تو وہ اس کے ہاتھ پیروں کو بوسہ دینے کے بعد منبر کے سامنے دو پردے

---

[۱] Stanley Lane pool the Story of Cairo. P. 119.120.

[۲] The Renaissance of Islam. P.2.

چھوڑ دیتا اور اس کی وجہ سے منبر کا قبہ، ہودج کی شکل کا نظر آنے لگتا۔ اب خلیفہ خطبہ شروع کرتا اور وزیرِ اعظم کھڑا رہتا، خلیفہ خطبہ کے خاتمہ پر وزیرِ اعظم اور مسلمان فوجوں کی کامیابی کے لئے دعا مانگتا اور خطبہ کے آخر میں کہتا "اذکر اللہ یذکرکم" (خدا کو یاد کرو وہ تم کو یاد کرے گا) خطبہ کے خاتمہ پر وزیرِ اعظم محراب کے پردوں کو چھوڑ دیتا اور وہ، اور قاضی القضاۃ محراب کے دروازوں پر کھڑے ہو جاتے کابینہ کے ممبر، ممتاز فوجی اور سویلین افسر بھی محراب کی حفاظت کے لئے آس پاس کھڑے ہو جاتے خلیفہ نماز شروع کرتا تو وزیرِ اعظم قاضی القضاۃ اور موذن حسب ترتیب تکبیر کا فرض انجام دیتے، نماز کے خاتمہ کے بعد جب جامع مسجد کا مجمع کم ہو جاتا تو خلیفہ اس شان سے نکلتا کہ دائیں جانب وزیرِ اعظم ہوتا اور بائیں جانب قاضی القضاۃ، داعی الدعاۃ اور شاہی باڈی گارڈ ساتھ ساتھ چلتا، اسی ہیبت و جلال سے جامع مسجد سے محل پہنچتا۔

عزیز باللہ | خلیفہ عزیز فاطمی (۳۶۵ھ - ۳۸۶ھ) کی حکومت اپنی وسعت کے لحاظ سے اس کے باپ کی حکومت پر فوقیت لے گئی تھی اور بلادِ عرب سے لے کر بحرِ اخضر تک اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ "قاعۃ الذہب" کی تعمیر نے اس کے دور کو خاص طور پر ممتاز بنا دیا ہے۔ اس عمارت کی تفصیلات سے... پتہ چلتا ہے کہ خلفاءِ فاطمیہ کی مجلسیں کس شان و شکوہ کی حامل ہوتی تھیں۔ یہ دیوان خانہ بہترین فرنیچر، قیمتی پردوں اور ریشمی، زریں حاشیہ کے قالینوں سے سجایا گیا تھا، ان پردوں اور قالینوں کے رنگ اور نقش و نگار ایک طرح کے تھے۔ "قاعۃ الذہب" کے وسط میں گدے دار فرش پر خلیفہ کا تخت بچھا تھا جو پردوں سے مستور رہتا تھا دربار کے وقت جب خلیفہ تخت پر بیٹھ جاتا تھا تو یہ پردے اٹھا دیئے جاتے تھے۔

شاہی عظمت و سطوت اس وقت قابلِ دید ہوتی تھی جب دو معتمد وزیران دونوں ریشمی پردوں کو "زمام المستنصر" کے اشارہ سے جو "زمام القصر" کے نام سے مشہور تھا الٹ دیتے تھے اور خلیفہ کی شخصیت یک بیک نمودار ہو جاتی تھی اور اس کے ارد گرد قاریوں کی ایک جماعت کلام پاک کی ترتیل کے ساتھ بلند آواز سے تلاوت کرتی ہوتی تھی۔

تلاوت کے بعد حاملِ دوات آتا اور گدے دار فرش کے ایک کنارے دوات لاکر رکھ دیتا جو خاص اسی کے لئے مخصوص ہوتا تھا، جب سب درباری اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ جاتے تو رئیسِ قصر افسر بیت المال، حاجب اور معتمد امراء دروازوں کے پاس اپنی اپنی جگہوں پر چلے جاتے۔ اس وقت ایک معتمد امیر مرتبہ کے لحاظ سے ایک ایک شخص کو خلیفہ کے سامنے باریابی کے لئے پیش کرتا۔

سب سے پہلے وزیر اعظم کی باری آتی، وہ خلیفہ کی طرف بڑھتا خلیفہ کو سلام کرتا، اس کے دست و پا کو چومتا پھر اپنی جگہ پر واپس آتا اور کھڑا ہو جاتا۔ پھر اس کے بعد اسے ایک گاؤ تکیہ کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا جاتا جو خلیفہ کے دائیں جانب ہوتا تھا۔ اس کے بعد قاضی القضاۃ کی باری آتی اور وہ خلیفہ کے قریب جاکر اپنا دایاں ہاتھ اٹھاتا اور سلام کرتا اور انگشتِ شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے کہتا "السلام علیک یا امیر المومنین ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" جب وزیر اعظم محسوس کرتا کہ خلیفہ سے کسی امر میں مشورہ کرنا چاہیے تو وہ اس سے قریب ہو جاتا اور تلوار پر سہارا لیکر نہایت ادب و توجہ سے گفتگو کرتا۔

خلیفہ کا دربار معمولاً تین گھنٹہ تک جاری رہتا، اس میں مہماتِ حکومت پر بحث مباحثہ ہوتا اور ان کے بارے میں خلیفہ کے احکام حاصل کئے جاتے اور وزیر اعظم ان لوگوں کے لئے عطائے خلعت و مناصب کی تجویز پیش کرتا جن کے نام زیرِ غور ہوتے۔ جب دربار ختم ہو جاتا تو حاضرین منتشر ہو جاتے، وزیر اعظم خلیفہ کے دست و پا کو دوبارہ بوسہ دینے کے بعد سب سے آخر میں دربار کو چھوڑتا اور تمام اعضائے مجلس کے جلو میں اپنے گھر کو لوٹ جاتا، اب خلیفہ اپنے تخت سے نزول فرماتا اور ایوان سے روانہ ہو جاتا اس روانگی کے بعد پردے چھوڑ دیئے جاتے اور دروازہ مقفل کر دیا جاتا۔

فاطمی دربار کے جاہ وجلال کا یہ ایک اجمالی جائزہ ہے۔

حاکم بامر اللہ | شعبان ۳۸۳ھ میں خلیفہ عزیز نے اپنے بیٹے منصور کو ولی عہد مقرر کیا۔ رمضان ۳۸۶ھ میں عزیز کا انتقال ہوا اور منصور حاکم بامر اللہ (۳۸۶ھ - ۴۱۱ھ) کے لقب سے تختِ خلافت پر متمکن ہوا۔ اس وقت اس کی عمر صرف ۱۱½ برس تھی۔ اس لئے اس کا اتالیق برجوان وکیلِ سلطنت مقرر ہوا حاکم کا سب سے بڑا کارنامہ دعوتِ فاطمی کے دونوں پہلوؤں ــــ سیاسی و دینی ــــ کی

تبلیغ واشاعت ہے اس نے اپنی حکمت عملی اور جابرانہ قوانین کے ذریعہ شیعیت کا دائرہ بہت وسیع کردیا اور رعایا کی بہت بڑی تعداد نے شیعہ مذہب قبول کر لیا تھا۔ اس کا حکم تھا کہ ہفتہ میں دوبار عام لوگ ان مجلسوں میں شریک ہوں جہاں شیعہ مذہب کی تبلیغ کی جاتی ہے۔ حاکم نے خدائی کا دعویٰ بھی کیا تھا اسے غلط فہمی تھی کہ میرے اندر تمام خدائی صفات موجود ہیں۔ عالم الغیب کا بھی اسے دعویٰ تھا۔ بعض لوگوں کی عقیدت کا تو یہ حال تھا کہ موت وزندگی کو بھی اس کے اختیار میں سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ سڑکوں سے گذرتا تو عوام شہری سجدے میں گر جاتے اور زمین کو بوسہ دیتے تھے۔

حاکم بامر اللہ خلفائے فاطمیہ میں سب سے زیادہ شان وشوکت اور نمائش کا جذبہ رکھتا تھا۔ ایک دفعہ جب اسے یہ خبر ملی کہ قیصر روم کا سفیر آرہا ہے تو اس کے دربار کو اس شان وشوکت سے سجایا گیا تھا کہ ساسانیوں کے دربار کی عظمت اس کے سامنے ہیچ نظر آنے لگی تھی۔[۱]

ظاہر اور مستنصر ۴۱۱ھ میں حاکم کی وفات ہوئی اور اس کا بیٹا ظاہر (۴۱۱ھ-۴۲۷ھ) جانشین ہوا، اس کی عمر اس وقت سولہ برس کی تھی، چار برس تک حکومت کا نظم ونسق اس کی پھوپھی کی زیر ہدایت چلتا رہا جس نے ریاست کا نظم ونسق نہایت قابلیت سے چلایا، نظام حکومت میں نہایت اچھی اصلاحیں کیں، فوجوں پر مال ودولت بے دریغ صرف کیا اس نے اپنی غیر معمولی انتظامی صلاحیت سے حکومت کے تمام شعبوں کی سطح بہت بلند کردی تھی۔ اس بیدار مغز خاتون نے ۴۱۵ھ میں وفات پائی۔

ظاہر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مستنصر (۴۲۷ھ-۴۸۷ھ) جانشین ہوا جس کی عمر صرف سات برس کی تھی، وہ ساٹھ سال تک تخت خلافت پر متمکن رہا۔ اس کا دور حکومت فاطمیوں کے لئے نہایت نامبارک ثابت ہوا، اس کے زمانہ میں مصر کا سکون واطمینان رخصت ہوگیا اور وہ مصائب کا آماجگاہ بن گیا۔ خلافت کا مرکز متزلزل تھا۔ ترکی فوجوں کا اقتدار قائم ہوگیا تھا انھوں نے

---

[۱] دیکھو تفصیل ابا المحاسن ج ۲ رقم اص ۷۷۔

اپنی شورشوں کے دوران میں انتہائی بربریت اور ظلم وستم کا مظاہرہ کیا اور خلفاء کے خوبصورت محلات، فنی نوادرات اور بے نظیر کتب خانوں کو تباہ وبرباد کر دیا، اس اضطراب انگیز ماحول میں دریائے نیل کا پانی گھٹ گیا، جس کی وجہ سے عالمگیر اور شدید قحط رونما ہوا۔ یہ صبر آزما عالمت سات برس تک قائم رہی، ۴۶۶ھ میں وزیر اعظم بدر جمالی اپنے عزم وہمت، سیاسی شعور اور غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے حالات پر قابو پاسکا اور نظم ونسق اور معاشی حالات کو اعتدال پر لے آیا اور نہایت سختی سے باغیوں کی سرکوبی کی اور ان کا استیصال کر دیا، ان خدمات کی وجہ سے وہ محبت اور عقیدت کا مرکز بن گیا اور حکومت کی مشینری پر چھا گیا، اور مستنصر اس کے سامنے ایک بے بس انسان سے زیادہ نہ تھا بدر جمالی نے ۴۸۷ھ میں دنیا کو خیر باد کہا اور اس کا بیٹا افضل شاہنشاہ وزیر اعظم ہوا۔ شوال ۴۸۷ھ میں قاہرہ کے اندر مستنصر نے بھی وفات پائی۔

نزاریہ اور مستعلیہ مستنصر نے اپنی وفات سے چند روز قبل اپنے بیٹے نزار کی بیعت لینا شروع کی تھی مگر وزیر اعظم افضل نے سہل انکاری برتنا شروع کی۔ اسی اثنا میں خلیفہ کی وفات ہوگئی اور بیعت پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکی۔ خلیفہ کی وفات کے بعد فوراً وزیر اعظم نے اس کے دوسرے لڑکے ابوالقاسم احمد مستعلی باللہ کے لقب سے خلیفہ مقرر کر دیا۔ مستعلی باللہ (۴۸۷ھ - ۴۹۵ھ) کی بیعت جب قاہرہ کے باشندوں نے کرلی تو وہ اسکندریہ گیا، وہاں کے شہریوں نے بھی اس کی بیعت کرلی۔ لیکن مستعلی چند سال کے بعد قتل کر دیا گیا۔ مستعلی کی تولیت کے سلسلہ میں وزیر اعظم کی اس دخل اندازی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسماعیلیہ فرقہ میں دو پارٹیاں قائم ہوگئیں، ایک مستعلی کی خلافت کی حامی تھی۔ دوسری نزار کی طرفدار تھی۔

مستعلی افضل کے ہاتھوں بے بس خلیفہ تھا، اسے حکومت میں مطلق کوئی دخل نہ تھا۔ اس کا نظم ونسق وزیر اعظم کے اشارہ سے گردش کرتا تھا۔

آمر باحکام اللہ مستعلی کا جانشین اس کا بیٹا آمر باحکام اللہ (۴۹۵ھ - ۵۲۴ھ) ہوا، اس وقت اس کی عمر پانچ برس ایک ماہ اور چند روز کی تھی۔ سیاسی شعور اور بیدار مغزی کے لحاظ سے خلفاء فاطمیہ[۱] میں آمر نہایت ممتاز خلیفہ تھا۔

[۱] تفصیل دیکھیے حسن المحاضرہ فی اخبار مصر والقاہرہ ج ۲ ص ۱۴ - ۱۶ -

آمر کے ابتدائی عہد میں وزیرِ اعظم افضل کی آمریت کا دور دورہ تھا، افضل نے امامیہ اثنا عشری مذہب قبول کرنے کے بعد جشنِ ولادت کی ان مجلسوں کو قانوناً بند کر دیا تھا جنھیں فاطمی ہر سال نہایت تزک و احتشام سے مناتے تھے، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت، حضرت علیؓ کی ولادت حضرت فاطمہؓ کی ولادت اور موجودہ خلیفہ (آمر) کی ولادت کے جشنِ مسرت تھے۔ آمر نے یہ تقریبیں دوبارہ جاری کر دی تھیں۔

حافظ | آمر باحکام اللہ کے بعد حافظ (۵۲۴ھ-۵۴۴ھ) خلیفہ ہوا، اس کے عہد میں وزیرِ اعظم ابو علی بن افضل حکومت پر چھایا ہوا تھا۔ اس نے خلیفہ کو گرفتار کر کے نظربند کر دیا اور قصر کے مال و دولت پر قبضہ کر لیا، باپ کی طرح ابو علی بھی امامیہ اثنا عشری فرقہ سے تعلق رکھتا تھا، اس نے خطبہ سے اسمٰعیل بن جعفر، فرقۂ اسماعیلیہ کے رکن رکین کا نام خارج کر دیا، یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ خلفاء فاطمیہ اسی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اس نے اپنے نام کے ساتھ چند جدید القاب کا اضافہ کر لیا۔ مثلاً "ناصر امام الحق و ہادی القضاۃ الی اتباع شرع الحق و اعتمادہ، مولی النعم و رافع الجور عن الامم و مالک فضیلتی السیف والقلم"[۱] وزیرِ اعظم کی سیاسی پالیسی سے فاطمیوں کے ممتاز افراد اور امراءِ خلافت برانگیختہ ہو گئے نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو دھوکے سے ۵۲۶ھ میں قتل کر دیا گیا،

وزیرِ اعظم کی موت کے ساتھ اثنا عشری فرقہ کے اقتدار کا جنازہ اٹھ گیا اور اسماعیلیہ فرقہ کے ہاتھ میں دوبارہ نظم و نسق آ گیا، اس فرقہ نے عصبیت کا ثبوت دیا اور اب خلیفہ حافظ کی حکومت کی بنیادیں نہایت مستحکم ہو گئیں، اس وقت منبروں پر ان الفاظ میں اس کا ذکر کیا جاتا۔

"خدا بھلا کرے اس خلیفہ کا جس نے اسلام کو بربادی سے بچا لیا اور اسے ابھرنے کا موقع ملا، وہ ہمارا آقا اور سردار امام العصر والزماں ابو المیمون عبد المجید الحافظ لدین اللہ" ہے"[۲]

---

[۱] تاریخ مصر لابن میسر، ص ۷۵۔

[۲] حسن المحاضرہ سیوطیؒ ج ۲ ص ۱۶

خلافتِ فاطمیہ کا زوال

مستنصر کے آخر عہد میں وزارتِ عظمیٰ کا اقتدار بہت بڑھ گیا اور تدریجاً بڑھتا ہی رہا تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ وزیر اعظم اپنے لئے "ملک" (بادشاہ) کا لقب اختیار کرنے لگے ان کے اقتدار کے بڑھنے کا سبب یہ تھا کہ امراءِ خلافت میں انتخاب کے وقت رسہ کشی ہوتی ایک کسی کا حامی ہے دوسرا کسی اور کا۔ دوسرا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ بچے خلیفہ ہونے لگے تھے جس کی وجہ سے وزراء اور حجاب کو اپنے اثر و اقتدار کو بڑھانے کا اچھا موقع ملتا اور وہ آسانی سے حکومت کے شعبوں پر چھا جاتے۔ ان حالات کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مناصب کے لئے شدید باہمی رقیبانہ کشمکش شروع ہو گئی۔ اگر ایک فریق نے اپنے حصولِ مقصد کے لئے صلیبیوں سے امداد کی درخواست کی تو دوسرے فریق نے صلاح الدین ایوبی کو دعوت دی۔ فاطمیوں کی بربادی میں ان فتنہ انگیز عناصر کا بہت بڑا دخل تھا۔

صلاح الدین ایوبی کی چشمِ بیدار نے مصر پر اثر و اقتدار قائم کرنے کے لئے یہ ماحول نہایت مناسب دیکھا اور فاطمی امراء کو اپنا آلۂ کار بنا لیا۔ اسی زمانہ میں خوش قسمتی سے فاطمی خلیفہ عاضد بیمار ہوا تو صلاح الدین نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور خلیفۂ عباسی مستضیٔ کے نام کا خطبہ محرم ۵۶۷ھ م ۱۱۷۱ء میں مصر میں پڑھوا دیا۔ اسی طرح اس نے خلافتِ فاطمیہ کے زیرِ نگیں ممالک، شام فلسطین اور بلادِ یمن کو حکم بھیجا کہ آئندہ سے منبروں پر خطبہ میں خلیفۂ عباسی کا نام لیا جائے۔ خلیفۂ عباسی نے اس کے صلہ میں اس کو ان محروسات کی حکومت تفویض کی اور اس طرح یہ انقلاب بغیر کسی خونریزی کے عمل میں آ گیا، اس کے متعلق ابن الاثیر نے لکھا ہے "اس بارہ میں ان دونوں مینڈھوں میں ٹکر کی نوبت نہ آئی"[1]

خلیفۂ فاطمی بھی جلد ہی ۱۰ محرم ۵۶۷ھ کو فوت ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی خلافتِ فاطمیہ کا جنازہ مصر سے اٹھ گیا، صلاح الدین ایوبی کا اب ان ممالک میں کوئی حریف نہ تھا۔ اس نے اپنی سیاسی حکمتِ عملی سے میدان اس سے قبل ہی ہموار کر لیا تھا۔ اس لئے آسانی سے اس کی حکومت

---

[1] ابن اثیر ج ۱۱ ص ۱۴۸ - ۱۴۹ -

مصر میں قائم ہوگئی، نام کو وہ خلافت عباسیہ کے ماتحت تھا اور منبروں پر نام بھی خلیفۂ عباسی کا لیا جاتا
لیکن دراصل صلاح الدین ان ممالک کا خود مختار فرمانروا تھا۔

خلافت فاطمیہ کا سرسری جائزہ

خلافت فاطمیہ، خلافت عباسیہ کی حریف بن کر عالم وجود میں آئی، اس کا دائرۂ عمل مغرب میں بحر اخضر، مشرق میں دریائے فرات، شمال میں ایشیائے کوچک، اور جنوب میں بلاد نوبہ تک وسیع تھا۔ دوسری طرف جزیرہ سسلی اور بلاد حجاز اس کی قلمرو میں داخل تھے، یمن، موصل اور بلاد ماوراء النہر میں فاطمی خلیفہ کے مذہبی اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کیا جاتا تھا، وہاں خطبہ بھی اسی کے نام کا جاری تھا۔

رینی ددسود (Rene Dussaud.) کے الفاظ میں " فاطمیوں کا عہد حکومت مصر کی عالمگیر فلاح و بہبودی کا زمانہ تھا، اس دور میں جو عام مذہبی آزادی حاصل تھی وہ تاریخ اسلام میں بہت کم نظر آتی ہے" [۵۱] فاطمیوں کا کتب خانہ قرطبہ، بغداد وغیرہ کے کتب خانوں کی نظیر تھا۔[۵۲] قاہرہ کی شان و شوکت اور عظمت و جلال سے دوسرے اسلامی مرکزوں کو کوئی نسبت نہ تھی، اس وقت مسلمان سب سے بڑا اسلامی مرکز اسی کو سمجھتے تھے۔ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے مصر جائے پناہ تھا اور مصیبت کے وقت اسی کی طرف ان کی نظریں اٹھتی تھیں " فاطمی خلفاء نے ایک عالمگیر اور وسیع سلطنت اور ایک اعلیٰ تہذیب کی بنیاد رکھی تھی، جس سے قریب قریب مشرق ناواقف تھا۔ یہ تہذیب اپنے بے مثل ادارتی نظام، اپنے فنون اور فوجی نظام زبردست بحری بیڑہ، اپنے محکمۂ عدلیہ اور اپنی مذہبی رواداری کی وجہ سے امتیازی درجہ رکھتی تھی، اس دور میں مصر کی سرزمین علم و فن اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھی۔[۵۳]

---

۵۱ History at Religion des No Sairis. P. 49.

۵۲ کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین ج ۱ ص ۲۰۰۔

۵۳ "الفاطمیون فی مصر" از ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ص ۳۱۵۔

مصر میں خلافتِ عباسیہ کی نشأۃ ثانیہ

مملوکوں کے عہد ۶۴۸ھ-۹۲۳ھ - ۱۲۵۰ء-۱۵۱۷ء میں

ظاہر بیبرس اور خلافت مستعصم باللہ کے قتل اور سقوط بغداد کے بعد مصر میں خلافتِ عباسیہ کا احیاء ہوا، یہ مملوک فرمانروا الظاہر بیبرس (۶۵۸ھ-۶۷۶ھ = ۱۲۶۰ء-۱۲۷۷ء) کے زمانہ کا واقعہ ہے ظاہر نے جب یہ دیکھا کہ اہلِ مصر مملوکوں کے استحقاقِ حکومت کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں تو اس نے استحکامِ حکومت کے لئے یہ حکمتِ عملی اختیار کی کہ عباسیہ خاندان کے ایک ممبر احمد بن امام ظاہر کو جو تاتاریوں کے پنجہ سے بچ گیا تھا مصر آنے کی دعوت دی۔

جب احمد بن امام ظاہر مصر کے قریب پہنچا تو اس کا نہایت شان وشوکت کے ساتھ استقبال کیا گیا ہے۔ احمد بن امام اس وقت عباسی خلفاء کے خاص لباس میں تھا۔ بیبرس نہایت عزت واحترام سے اپنے ہمراہ اسے قلعہ جبل میں لایا اور انتہائی پاس ادب سے اس سے پہلے قلعہ میں داخل ہونے اور اس کے برابر بیٹھنے اور ہمسری کی دوسری باتوں سے احتراز کیا۔ اس طرزِ عمل میں احترام سے، زیادہ سیاسی پالیسی کا دخل تھا۔

احمد کی آمد پر بیبرس نے ایک عظیم الشان دربار منعقد کیا جس میں قضاۃ، علماء، امرائے حکومت اور ملک کے ممتاز افراد مدعو تھے۔ اس دربار کا مقصد عباسی امیر کے نسب کی تحقیق تھا دربار میں لوگوں نے بیان کیا کہ آپ امام احمد بن الخلیفہ الظاہر بامر اللہ بن الخلیفہ الناصر لدین اللہ ہیں اور آپ خاندان عباس بن المطلب سے تعلق رکھتے ہیں۔ قاضی القضاۃ نے لوگوں کی شہادت قبول کی اور امام کے صحت نسب کی تصدیق کی۔ اس کے بعد سب سے پہلے قاضی القضاۃ اور دوسرے قاضیوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور مستنصر باللہ کا لقب دیا۔ آخر میں بیبرس نے "قرآن وحدیث، امر بالمعروف نہی عن المنکر، جہاد فی سبیل اللہ اور مالیات کے شرعی نظام کے قیام پر بیعت کی"۔ [۱]

---

[۱] نہایۃ الارب للنویری ج ۲۸ القسم الاول ص ۱۸ و ۱۹۔

اس کارروائی کے بعد ظاہر نے مختلف طبقوں سے خلیفہ کے لئے بیعت لی، اور مصر میں خلیفہ کے نام کا سکہ اور جمعہ کے خطبہ میں اپنے نام سے پہلے اس کے لئے دعا کئے جانے کا فرمان جاری کر دیا۔ یہ دربار جمعہ کے دن منعقد ہوا تھا۔ دربار کے خاتمہ پر خلیفہ پہلے جامع قلعہ میں آیا، وہاں اس سے خطبہ اور نماز پڑھانے کی درخواست کی گئی، خلیفہ نے اس وقت ایک بلند پایہ فصیح و بلیغ خطبہ دیا، جس میں خلافتِ عباسیہ کے دوبارہ احیاء پر بیبرس کی بے حد مدح و ستائش کی

۴ ہر شعبان ۶۵۹ھ میں ایک دوسرا عظیم الشان دربار ظاہر بیبرس کو خلیفہ کی طرف سے شرعی نیابت (تفویض) دینے کے لئے منعقد ہوا اس میں بیبرس کی سیاسی غرض یہ مضمر تھی کہ مملوکوں کی مصر پر فرمانروائی شرعی حیثیت اختیار کر لے، تاکہ رائے عامہ کی طرف سے اطمینان ہو جائے دربار میں خلیفہ کی طرف سے شرعی نیابت کی سند پڑھ کر سنائی گئی، اس میں حمد و ثنا کے بعد، ظاہر بیبرس کی خدمات کا اعتراف اور اس کے استحقاقِ خلافت اور صلاحیتوں کا ذکر کیا گیا، آخر میں طرزِ حکومت عدل و انصاف رعایا کی فلاح و بہبود اور نظم و نسق کے بارے میں دوسری ہدایات درج تھیں۔ [1]

سر ولیم میور کا بیان ہے "خلیفہ نے سندِ نیابت پڑھنے کے بعد سلطان ظاہر بیبرس کو خلعتِ حکومت عطا فرمایا، یہ بنفشی رنگ کے ایک جبہ، ایک سیاہ عمامہ، ایک سونے کے طوق اور ایک تلوار پر مشتمل تھا، بیبرس نے اس خلعت کو زیب تن کیا اور جلوس روانہ ہوا۔ راہ میں باب النصر سے قلعہ تک لمبے لمبے قالین بچھے ہوئے تھے۔ سلطان ظاہر جلوس کے آگے آگے تھا، اس کے پیچھے خلیفہ تھا۔ خلیفہ کے پیچھے بہاء الدین بن حنا اپنے سر پر سندِ حکومت لئے چل رہا تھا اور ان سب کے پیچھے عام مجمع تھا۔

تھوڑی مدت کے بعد بیبرس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ بغداد میں خلافتِ عباسیہ کی نشاۃ ثانیہ کی جائے اور زمامِ خلافت مستنصر باللہ کو سونپ دی جائے۔ اس خیال سے خلیفہ کے

[1] دیکھئے تفصیل کے لئے النجوم الزاہرۃ ج ۲ قسم ثانی ص ۱۸۸ (۱) ۱۸۸ (ب)

ساتھ بغداد کے ارادہ سے روانہ بھی ہوا تھا، مگر دمشق پہنچ کر اسے یہ خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں بغداد میں خلافت کی بنیادوں کا استحکام مستقبل میں ہماری حکومت کے لئے پیغام موت نہ ثابت ہو، اس اندیشہ سے وہ مصر واپس آگیا اور خلیفہ کو دمشق میں تنہا چھوڑ دیا۔ خلیفہ اپنے چند سواروں کے ساتھ یہاں سے بغداد روانہ ہوا۔ بدقسمتی سے تاتاریوں کو اس کی روانگی کی خبر ہوگئی اور راستہ میں وہ خلیفہ کی مختصر جمعیت پر ٹوٹ پڑے اور خلیفہ کو قتل کر دیا۔ بیبرس نے جب یہ سنا تو اسے بے حد صدمہ ہوا، لیکن اپنی سیاسی حکمت عملی کے پیش نظر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے دوسرے عباسی فرد کی تلاش میں قاصد روانہ کیا۔ اور ۶۶۱ھ میں[1] جب خانوادۂ عباسیہ کا ایک ممبر ابوالعباس احمد مصر پہنچا تو ظاہر بیبرس نے خلیفہ سابق کی طرح اس کا بھی نہایت شان و شوکت اور عزت و تکریم کے ساتھ خیر مقدم کیا، اور تحقیق نسب کے لئے دربار منعقد کیا گیا اس کے بعد اس نے اور تمام ارکان حکومت اور رعایا نے اس کی بیعت کر لی اور "حاکم بامر اللہ" لقب دیا گیا۔ لیکن اس دفعہ بیبرس کے دل میں بغداد میں خلافت عباسیہ کے قیام کا خیال پیدا نہیں ہوا اور اس نے عباسی خلیفہ کا دائرۂ عمل مذہبی اجارہ داری تک محدود رکھا، حکومت کے نظم و نسق میں اس کا مطلق دخل نہ تھا۔

حاکم بامر اللہ کی خلافت کو تین سال بھی نہیں گذرے تھے کہ بیبرس نے اپنے قفقہ کالم کے ذریعہ بغداد میں دو آدمیوں کو ورابھار دیا، ایک نے دعوی کیا میں مبارک بن خلیفہ مستعصم باللہ ہوں دوسرا بھی خلفاء عباسیہ کی اولاد میں ہونے کا مدعی تھا اس سلسلہ میں ایک وفد بھی آیا تھا، جس نے درخواست کی تھی خلیفہ مستعصم باللہ کا بیٹا خلافت کا زیادہ حقدار ہے۔"

اس پالیسی سے بیبرس کا مقصد یہ تھا کہ خلافت کا وجود برابر قائم رہے۔ اگر ایک خلیفہ مر جائے تو اتنا کبھی نہ ہو اور دوسرے کو اس کی جگہ فوراً مقرر کر دیا جائے اور تلاش کرنے

---

[1] المختصر فی اخبار البشر (ابوالفداء) ج ۳ ص ۲۱۵ - یہ وہی امیر ہے جو اپنے سات سو سپاہی لیکر خلیفہ مستنصر کی مدد کو تاتاریوں کے خلاف گیا تھا جب بیبرس نے شام میں اسے تنہا چھوڑ دیا تھا۔

کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ دوسرا مقصد خلیفہ کی تہدید اور اس کے اثر و اقتدار کو روکنا تھا، خلیفہ کو اندیشہ رہتا کہ اگر بیبرس نے ذرا بھی حکومت کے نظم و انتظام میں دخل دیا تو مجھے برطرف کر کے دوسرے کو خلیفہ بنا دیا جائے گا اس وقت خلیفہ کی حیثیت صرف ایک نظر بند قیدی کی تھی جو عزلت نشینی کی زندگی کا خوگر تھا۔ اور قلعہ میں نظر بند رہتا تھا[1]۔ بیبرس نے اپنی اس سیاسی روش سے خوب فائدہ اٹھایا، ملک کو وسعت دی اور اپنے دائرہ اقتدار کو "حامی دین" کے پردہ میں بہت وسیع کر لیا۔

مصر میں خلافت کا یہ نظام سلطان سلیم اول کی تسخیر تک قائم رہا تھا۔ سلطان سلیم مصر پر تسلط قائم کرنے کے بعد خلیفہ عباسی کو اپنے ساتھ لے گیا تھا اس کے بعد وہاں کسی کو یہ "شرف" نصیب نہ ہوا۔

بیبرس کے بعد مصر میں خلافت کی حالت

بیبرس کے بعد اس کے جانشینوں نے بھی اسی کی پالیسی پر عمل کیا، ان کے عہد میں بھی خلیفہ کو حکومت کے نظم و نسق میں مطلق دخل دینے کا مجاز نہ تھا وہ صرف ایک آلہ کار تھا جس کے ذریعہ سلاطین اپنی حکومت کو مذہبی رنگ دیکر اس کی حیثیت و قوت کو عوام میں وقیع و مستحکم بنا دیتے تھے۔ خلیفہ کی یہ بے بسی کوئی حیرتناک امر نہیں مذہب و سیاست کے جدا ہو جانے سے خلیفہ کا اقتدار گھٹ گیا اور سلاطین کا اثر و نفوذ اور جبر و استبداد ترقی کر گیا۔

خلافت راشدہ، خلافت بنی امیہ اور خلافت عباسیہ کے دور عروج میں مذہب اور سیاست جدا جدا نہ تھے، خلیفہ مذہبی اور سیاسی دونوں قسم کی فرمانروائی کا مظہر ہوتا تھا، لیکن قاہرہ میں خلیفہ عباسی کو حکومت کے معاملات میں ذرہ برابر بھی دخل نہ تھا اور اس کا تمام وقت عبادت، علماء اور باحیثیت لوگوں سے ملاقات میں گذرتا تھا اور سرکاری مجالس میں اس کو شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ خصوصاً جدید سلطان کی تاج پوشی کے موقعہ پر ضرور اس کو تکلیف دی جاتی تھی۔ غرض یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کے سب سے بڑے (مقتدر اعلیٰ) حاکم کی حیثیت سے

[1] السلوک (مقریزی) ج ۱ قسم ثانی ص ۴۵۵۔

جدید سلطان کو سندِ فرمانروائی عطا کرے۔ خلیفہ کا یہ بھی فرض تھا کہ جنگ پر روانگی کے وقت فوجوں کو خیر و برکت اور فتح و نصرت کی دعائیں دے اور جنگ میں سلطان کے ساتھ محاذ پر مع دیگر ممتاز اراکین قصر کے . . موجود رہے۔ مصر میں خلافتِ عباسیہ کا یہ بے روح ڈھانچہ قریباً ڈھائی سو برس تک باقی رہا۔

قاہرہ میں خلفائے عباسیہ کا سب سے اہم فرض یہ تھا کہ وہ سلاطین کو "سندِ نیابت" عطا کر دیتے اور بس! سلاطین کے دل میں خلیفہ کا کوئی ادب و احترام کم سے کم اس کی مذہبی حیثیت کی وجہ سے نہ تھا۔ بعض سلاطین نے تو یہاں تک بے نیازی کا ثبوت دیا کہ خلیفہ کو اس "سندِ نیابت" عطا کرنے کی زحمت دینے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔ چنانچہ سلطان قلاوون (۶۷۸ھ - ۶۸۹ھ ۱۲۷۹ء - ۱۲۹۰ء) نے خلیفہ سے "سندِ نیابت" حاصل کرنے کی حاجت نہیں سمجھی اور اس کے بیٹے ناصر محمد بن قلاوون نے ایک قدم اور بڑھایا اور خلیفہ مستکفی باللہ کو قلعۂ جبل میں نظر بند کر دیا اور اجتماعی مجلسوں میں شرکت کی ممانعت کر دی، ۷۳۸ھ میں اسے اور اس کے خاندان کے ایک ایک فرد کو قوص بھیج دیا گیا اور ان کے لئے معمولی وظائف مقرر کر دیئے گئے۔ اسی حالت میں شعبان ۷۴۰ھ میں اس نے قوص میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

اس عتاب کی وجہ[1] صرف یہ تھی کہ خلیفہ کا ایک خط پکڑا گیا تھا جس میں یہ تحریر تھا، شرعی لحاظ سے سلطان کو عام مجلسوں میں شرکت کرنا چاہیئے، سلطان کی جبینِ حکومت پر اس "جسارت" سے شکن پڑ گئی، اور اس نے اس "جرم" میں جلاوطن کر دیا۔ عام رعایا پر اس کا بہت برا اثر پڑا، اور سلطان کی اس حرکت سے ان میں جوش و ہیجان پیدا ہو گیا مگر دارالسلطنت سے خلیفہ کے دور ہونے کی وجہ سے یہ عملی شکل اختیار نہ کر سکا۔

خلیفہ مستکفی کی وفات کے بعد سلطان نے اس کے بیٹے احمد کی طرف جسے خلیفہ اپنی زندگی میں ولی عہد مقرر کر چکا تھا کوئی التفات نہ کیا اور واثق باللہ ابراہیم بن احمد کی بیعت کر لی۔

---

[1] تاریخ الخلفاء ج ۲ ص ۳۲۳۔

واثق باللہ سلطان کے مرض الموت تک اس منصب پر مامور رہا۔ مرض الموت میں سلطان کو اپنے فعل پر ندامت ہوئی اور اس نے ابراہیم کو معزول کرکے احمد کی بیعت کرلی اور "الحاکم باللہ" کا لقب دیا۔ یہ محرم ۸۴۲ھ کا ذکر ہے۔

مملوکوں کے دورِ حکومت میں خلیفۂ عباسی بے بال وپر پرندہ کی طرح بے بس تھا اور نظم ونسق میں دخل دینے کا مجاز نہ تھا، مصر کے ماسوا، بلادِ حجاز کے منبروں پر اس کا نام تک نہ لیا جاتا تھا۔ حالانکہ وہ مملوکوں کے قلمرو میں داخل تھے، خلیفہ مستعین باللہ ابوالفضل ضرور مستثنیٰ تھا جس کی خلافت اور بادشاہی دونوں کی بیعت کی گئی تھی۔ یہ واقعہ ناصر فرح کی موت کے بعد پیش آیا تھا۔ ابتدا میں خلیفہ مستعین باللہ نے اس منصب کے قبول کرنے میں تامل ہوگیا تھا۔ مگر جب اس کی یہ شرط مان لی گئی کہ حکومت کے اختیارات مستقبل میں اگر سلب کرلئے گئے تو کم سے کم خلافت کے منصب سے محروم نہ کیا جائے گا، اس وقت وہ رضامند ہوگیا ۔۔۔ دمشق کے اکناف میں مستعین کے منصبِ خلافت پر فائز ہونے کی خبر مسرت سے سنی گئی۔ سرولیم کے الفاظ میں:۔

"مسلمانوں کے خلیفہ نے ایک مدت کے بعد تاج شاہانہ سر پر رکھا تھا اگرچہ اس کی حیثیت صرف نام کی تھی۔ سادہ لوح مسلمانوں کو یہ مسرت تھی کہ خلافت نے اب نیا جنم لیا اور اسے گذشتہ اقتدار حاصل ہوگیا۔"

مصر واپس آنے کے بعد مستعین قلعۂ جبل میں قیام فرما ہوا، اور اس کے سامنے ایک فرمانروا کی حیثیت سے شاہی کاغذات دستخطوں کے لئے پیش ہونے لگے۔ سلطان ابوالنصر شیخ کو خلیفہ کا یہ اثر واقتدار ناگوار گذرا اور اس نے حکم دیدیا کہ خلیفہ کے دستخط شدہ کاغذات اس وقت تک ناقابل نفاذ ہیں، جب تک مجھے دکھا کر میری منظوری حاصل نہ کرلی جائے، خلیفہ کی خودداری کو اس سے ٹھیس لگی اور دونوں میں کشمکش شروع ہوگئی، نتیجہ یہ ہوا کہ خلیفہ کو دستبردار ہونا پڑا۔ ابوالنصر نے اب عنانِ حکومت خود سنبھال لی، ملک مؤید کے لقب سے فرمانروا ہوا، مؤید نے مستعین کی معزولی کے بعد اس کے بھائی داؤد سے بیعت کرلی اور معزول خلیفہ

کو قلعہ کے ایک مکان میں نظر بند کر دیا گیا اور اسے کسی شخص سے ملاقات کی اجازت نہ تھی۔
اس معزولی کا علم جب نوروز، گورنر شام کو ہوا، تو اس نے علماء اور مفتیوں کو جمع کیا اور خلیفہ مستعین کے مقابلہ میں ابوالنصر شیخ کی شرعی حیثیت کے متعلق فتویٰ دریافت کیا، سب نے ہمنوا ہو کر خلیفہ کی معزولی کو ناجائز قرار دیا، اس کے بعد گورنر شام نے مؤید پر چڑھائی کا فیصلہ کر لیا۔

مؤید کو نوروز کے ارادوں کی اطلاع ہوئی تو ایک بے پناہ فوج لے کر مقابلہ کے لئے نکلا اور بطور پیش بینی یہ کی کہ مستعین باللہ کو قاہرہ سے اسکندریہ روانہ کر دیا تاکہ رائے عامہ نہ بھڑک اٹھے۔ مؤید کو اس مہم میں کامیابی ہوئی۔ اور نوروز کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ پھر چند روز بعد اسے قتل کر دیا گیا اور اس کا سر قاہرہ کے دروازہ پر لٹکا دیا گیا۔

یہ ۸۱۷ھ کا واقعہ ہے مستعین باللہ مؤید کی وفات تک اسکندریہ میں نظر بند رہا مؤید کے جانشین نے اسے آزاد کر دیا اور قاہرہ آنے کی اجازت دیدی مگر اس نے اسکندریہ میں قیام کو ترجیح دی اور وہیں ۸۳۳ھ میں وفات پائی۔ [1]

---

[1] تاریخ الخلفاء ص ۳۴۹۔

خلافتِ عثمانیہ

خلیفہ متوکل اور سلطان سلیم اول

مئی ۱۵۱۶ء میں مصری فوج قانصوہ غوری کی قیادت میں مصر سے روانہ ہوئی، اس کے ہمراہ خلیفہ متوکل اور مذاہب اربعہ کے قاضی بھی تھے۔

اگست ۱۵۱۶ء میں حلب کے قریب "مرج دابق" کے مقام پر سلطان سلیم اول نے اسے شکست دی، اس میں سلطان قانصوہ مارا گیا، سلطان سلیم نے حلب کے باہر اپنی فرودگاہ میں خلیفہ کا خیر مقدم کیا اور جب اسے علم ہوا کہ خلیفہ کا اصل وطن بغداد ہے تو وہ اسے بغداد بھیج دینے پر آمادہ تھا۔ سلطان سلیم نے اس وقت خلیفہ کو خلعتِ شاہانہ مرحمت فرمائی، اور اس کے ساتھ بہت سا مال و دولت بھی دیا اور اس کو حلب لوٹ جانے کی اجازت بھی دیدی۔ آخر ستمبر ۱۵۱۶ء میں جب سلطان سلیم دمشق میں داخل ہوا، اس وقت خلیفہ متوکل بھی اس کی معیت میں تھا۔

مملوکوں نے اس موقع پر اپنی جماعت میں سے ایک سلطان کا انتخاب ضروری سمجھا چنانچہ طومان بائی کے ہاتھ پر انھوں نے بیعت کر لی، لیکن . . . . دستور کے مطابق جدید سلطان کو سندِ حکومت عطا کرنے کے لئے ایک خلیفہ کا وجود بھی ناگزیر نظر آیا، اتفاق سے مستمسک (متوکل کا باپ) موجود تھا جو اپنے بڑھاپے کی وجہ سے ۱۵۰۹ء میں خلافت سے علیحدہ ہو گیا تھا، مستمسک نے اس دربار میں متوکل کی نیابت فرمائی جو اکتوبر ۱۵۱۶ء میں منعقد ہوا تھا۔

دسمبر ۱۵۱۶ء میں سلطان سلیم نے مصر کی طرف پیش قدمی کی اور غزہ میں مصر کی ایک محافظ فوج کو شکست دی، چند روز بعد ۲۲ جنوری ۱۵۱۷ء میں ریدانیہ کے مقام پر طومان بائی کی فوجوں نے اس کا مقابلہ کیا اور شکست کھائی، دوسرے روز قاہرہ کے منبروں پر سلطان سلیم کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور ان الفاظ میں اس کا ذکر کیا گیا "اللہم انصر السلطان ابن السلطان ملک البرین والبحرین۔ سلطان العراقین والخادم الحرمین الملک الناصر السلطان سلیم شاہ۔"

سہ شنبہ ۲۶ جنوری ۱۵۱۷ء کو طومان بائی نے قاہرہ پر چڑھائی کردی اور تین روز تک قاہرہ کی سڑکوں پر مصری و عثمانی . . . . لشکروں میں قتل و خونریزی کا بازار گرم رہا، جمعہ ۲۹ جنوری ۱۵۱۷ء کو قاہرہ کے منبروں پر طومان بائی کے نام کا خطبہ پڑھا گیا مگر اسی روز سلطان سلیم نے طوفان بائی کی فوجوں سے شہر خالی کرالیا۔ طومان بائی "وجہ بحری" کی طرف فرار ہو گیا۔ اور وہاں سے نمایندوں کے ذریعہ سلطان سلیم اور اس کے درمیان گفت و شنید شروع ہوئی، سلطان سلیم نے گفت و شنید کی سب سے پہلی شرط یہ پیش کی کہ مملوک فرمانروا کا خط میرے پاس خلیفہ اور مذاہب اربعہ کے قاضی لے کر حاضر ہوں، یہ شرط پوری کی گئی، صرف خلیفہ نے ضعف و نقاہت کی وجہ سے اپنا نمایندہ دوسرے کو بنا کر بھیج دیا تھا، آخر میں سلطان سلیم نے طوماں بائی کو باوجود امان دینے کے پھانسی پر لٹکا دیا۔

مصر پر پورا تسلط قائم کرنے کے بعد سلطان سلیم نے خلیفہ متوکل کو کسی حد تک نظم و نسق میں دخیل کر لیا۔ حاجتمند سلطان سلیم تک رسائی کے لئے خلیفہ کو واسطہ بناتے اور سلطان عموماً اس کی سفارشیں رد نہ کرتا۔ ستم رسیدہ افراد اپنی مقصد براری کے لئے اس کثرت سے خلیفہ کے پاس آتے کہ اس کے محل میں تل رکھنے کی جگہ نہ رہتی۔

سلطان سلیم کا اس حکمتِ عملی سے مقصد اہلِ قاہرہ اور جدید حکومت میں مصالحت کی فضا پیدا کرنا اور عثمانیوں کی حکومت کے لئے زمین ہموار کرنا تھا۔ سلطان نے خلیفہ متوکل کے پاس ہدایا اور سوغات کی ایک بارش سی کردی تھی۔ اس سے پہلے کوئی اور خلیفہ ان الطاف بے پایاں سے بہرہ مند نہ ہوا تھا، لیکن خلیفہ کو جب ان باتوں سے اپنے بارے میں کچھ "غلط فہمی" پیدا ہوگئی تو سلطان نے جون ۱۵۱۷ء میں اسے قسطنطنیہ بھیج دیا۔

جولائی ۱۵۱۸ء میں قسطنطنیہ سے قاہرہ آنے کی سلطان سلیم نے دوبارہ اجازت دیدی اور تھوڑے بہت اختیارات بھی سونپ دیئے گئے مگر جب اس نے دیکھا کہ خلیفہ ان سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے اور اپنے اعزاء و اقربا کے ذریعہ اپنا پروپگنڈا کر رہا ہے اور باندیوں اور مغنیوں

کی خرید و فروخت میں دی ہوئی دولت بے اعتدالی سے لٹا رہا ہے، اس وقت اسے سخت غصہ آیا اور اُسے ایک محل میں نظر بند کر دیا، جہاں ۱۵۲۰ء تک نظر بند رہا، اس کے بعد سلطان سلیمان قانونی کے زمانے میں قاہرہ آنے کی اجازت دیدی گئی اور حسب معمول خلافت . . . کے منصب پر مامور کر دیا گیا۔ ۱۵۲۳ء میں احمد پاشا گورنر مصر کی شورش خلیفہ متوکل نے فرو کی تھی جس نے سلطان سلیمان کے خلاف بغاوت کی تھی اور تھوڑی مدت سے وہاں کا خود مختار حاکم بن بیٹھا تھا۔ یہ اس خلیفہ متوکل کا آخری اور قابلِ ذکر کارنامہ تھا

متوکل نے ۱۵۴۳ء میں قاہرہ میں وفات پائی۔

خلافتِ عثمانیہ مختلف مورخین کے زاویۂ نگاہ سے

مصری مورخ ابن ایاس نے جو عثمانی فتوحات کے عہد میں موجود تھا اور جس نے ان فتوحات کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا ہے، سلطان سلیم اور خلیفہ متوکل کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"خلیفہ متوکل نے سلطان سلیم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تبرکات سونپ دیئے تھے، ان تبرکات میں ایک ردائے اقدس جسے بغداد کے خلفاء عباسیہ خاص موقعوں پر زیب تن کرتے تھے، چند ریش مبارک کے بال اور حضرت عمرؓ کی ایک تلوار تھی۔" [۱]

سر ٹامس آرنلڈ کا بیان ہے۔

"سلطان سلیم یہ نہایت اہم اور قابلِ قدر تبرکات قسطنطنیہ لے گیا، جہاں وہ اس وقت تک جامع ایوب میں موجود ہیں، اس نے اسے سب سے اہم اور قابلِ احترام غنیمت خیال کیا تھا لیکن قاہرہ کی جگہ قسطنطنیہ کو مرکزِ خلافت قرار دینے کا کوئی ثبوت اس زمانہ کے واقعات سے نہیں ملتا ہے۔" [۲]

ان مورخین کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ تبرکاتِ رسول کے قسطنطنیہ بھیجد یئے جانے کو ان کے نزدیک کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں تھی، ان معاصر مورخین میں ابن ایاس مصری

---

[۱] تاریخ مصر ج ۳ ص ۱۲۶۔ [۲] The Caliphate. P.143.

بھی شامل ہے۔ اس نے خلیفہ اور اس کی سرگذشت کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، لیکن ان تمام تفصیلی معلومات میں ہمیں اس کا کہیں اشارہ تک نہیں ملتا کہ سلطان سلیم نے اپنے لئے خلیفہ کا لقب اختیار کر لیا تھا، البتہ اتنا ضرور ہے کہ ابن ایاس اپنی تصنیف میں جب خلیفہ کے قسطنطنیہ بھیج دیئے جانے کے بعد قسطنطنیہ کا ذکر کرتا ہے تو اس کو "مرکز عرش آل عثمان" کے نام سے تعبیر کرتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ قسطنطنیہ کو عالم اسلامی کا مرکز قرار دینے کا خیال سلیم کے دل میں بعد کو پیدا ہوا فتح مصر کے وقت غالباً اس قسم کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ سلیم نے انھیں ایام میں اپنے بیٹے سلیمان کے پاس ایک خط بھیجا تھا، اس خط میں اس نے ان تمام واقعات اور فتوحات کو تفصیل کے ساتھ لکھا تھا جو بالآخر فتح مصر پر جا کر ختم ہوتی ہیں، لیکن اس تمام تفصیل کے باوجود اس خط میں ہمیں خلیفہ کی طرف کوئی اشارہ یا اس کے متعلق کوئی ذکر نہیں ملتا، حالانکہ اگر اس قسم کی کوئی خواہش ہوتی تو وہ ضرور ذکر کرتا۔

سر ٹامس آرنلڈ فرماتے ہیں:۔

"جب عالم اسلامی کے اس مرکز (مصر) پر پوری طرح سے تسلط قائم ہو گیا اور سلطان سلیم خلافت کے لقب کا بے حد خواہش مند بھی تھا تو طبعی طور سے فتوحات کے ذیل میں اس خواہش کا اظہار کرنا چاہئے تھا۔ سلطان سلیم نے اپنے طویل خط میں "مرج دابق" کی جنگ سے لے کر فتح مصر تک تمام فتوحات کا وضاحت سے ذکر کیا ہے، لیکن اپنی اس خواہش کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کیا، سلطان سلیم کی فتوحات کا دائرہ شام، فلسطین، مصر، بلاد حبشہ، حجاز، مکہ و مدینہ، مشرق میں یمن اور مغرب میں حدود قیروان تک وسیع تھا۔ اپنے خطوط میں ان سب فتوحات کا وضاحت سے ذکر کیا ہے مگر خلافت کا نام تک نہیں لیا۔ حجاز اور حرمین کی فرمانروائی پر اسے بے حد مسرت ہوئی تھی اور نہایت فخر و انبساط کے ساتھ اپنے نام کے ساتھ "خادم الحرمین" کے لقب کا اضافہ کیا تھا جو مصر کے مملوک سلاطین کا لقب تھا۔ سلطان سلیم نے یہ لقب

مملوک فرمانروا قانصوہ غوری کی موت کے بعد اختیار کیا تھا، جنوری ۱۵۱۸ء میں جامع حلب کے اندر سب سے پہلے خطبہ میں اس لقب سے اس کا ذکر کیا گیا۔" سلہ

ان باتوں کا ذکر بھی اپنے طویل خطوں میں کیا ہے مگر خلیفہ بننے کی خواہش کے بارے میں کوئی اشارہ تک نہیں کیا۔

سرٹامس آرنلڈ فان ہامر (Van Hammer) کی تائید کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں۔

"خلیفہ کا لقب اس زمانہ میں معمولی امراء کے ساتھ مخصوص تھا، اس میں قرونِ اولیٰ کی شانِ تقدیس اور احترام باقی نہ رہا تھا۔ اس لئے شاید سلطان سلیم نے اس لقب کو تبذل سمجھکر اپنے لئے پسند نہ کیا ہو، چند سال قبل ۱۵۰۸ء میں اس کے حریف شاہ اسمٰعیل صفوی نے جس سے اسے بے حد نفرت اور عداوت تھی، بغداد پر تسلط قائم کرنے کے بعد ایک خصی غلام کو وہاں کا حاکم مقرر کیا اور اسے "خلیفۃ الخلفاء" کا لقب دیا، سلیم کی خوددار طبیعت کے لئے یہ واقعہ بھی کم نہ تھا۔"

سلطان سلیم اور اس کے اسلاف ایک مدت سے خلفاء کے سیاسی اور مذہبی اثر و اقتدار سے بہرہ مند تھے اور اپنے ساتھ خلافت کے لقب کا انتساب بھی فتح مصر سے قبل کرتے تھے مگر جب فتح مصر کے بعد قاہرہ کے خلیفہ عباسی کی حیثیت پر نظر پڑی، جسے اپنے آباؤ اجداد کے اثر و نفوذ سے ایک شمہ نہ ملا تھا اور وہ صرف مملوک سلاطین کی خواہشات و جذبات کا آلہ کار تھا اس وقت یہ منصب اس کی نظروں سے گر گیا۔ تاریخ اس زمانہ کے ایک اسلامی خاندان کا پتہ دیتی ہے جس کے فرماں روا کی شخصیت مطلق مذہبی اور سیاسی فرمانروائی کی حامل تھی۔ قیاس یہ ہے کہ یہ آلِ عثمان کے ماسوا اور کوئی خاندان نہیں ہو سکتا۔ سلطان سلیم کا وہ خط بھی اس پر ایک اداس روشنی ڈالتا ہے جو دسمبر ۱۵۱۷ء میں گورنر مازندران کے نام لکھا تھا، جس میں اپنے خاندان کا ان الفاظ میں ذکر کیا تھا۔ "یہ خاندان آلِ عثمان خلافت کا قید خانہ (معقل) ہے" یہ خط مصر کے آخری خلیفہ متوکل

سلہ The Caliphate. P. 144.

کو قسطنطنیہ روانہ کرنے کے چند ماہ بعد لکھا گیا تھا۔

یہ دعویٰ بے دلیل ہے کہ متوکل نے باقاعدہ خلافت کا چارج سلطان سلیم کو دیدیا تھا سب سے پہلے یہ دعویٰ موراجی دوسون (Mourajid Hosson.) نے ۱۷۸۷ء میں کیا تھا[1] مگر اس دعوی کی کوئی دلیل بیان نہیں کی اور نہ ما بعد کے ان مورخوں نے کوئی سند پیش کی، جنھوں نے اس کا یہ دعویٰ اپنی تاریخوں میں نقل کیا ہے، دوسون کی کتاب سے یہ دعویٰ مشرق و مغرب کی تاریخوں میں نقل کیا گیا اور اس پر اتنا رنگ و روغن چڑھا کہ اب یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت بن گیا۔ یورپ نے عثمانیوں کے دعویٰ خلافت کی تائید میں پروپیگنڈا کیا اور تمام عالمِ اسلامی تک اس کا دامن وسیع کر دیا۔

سر ٹامس آرنلڈ نے ان الفاظ میں دوسوں کے دعوی پر حاشیہ آرائی کی ہے:۔

"ممکن ہے دوسون کا یہ دعویٰ صحیح ہو، اس کا قرینہ سلطان سلیم کا وہ لقب "خادم الحرمین" ہے جو مصر کی کامیابی کے دوسرے دن (۲۳ رجنوری ۱۵۱۷ء) مصر کے منبروں پر سنا گیا اس خطبہ میں سلطان کا لقب متعدد بار آیا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ اس لقب کو اپنے نام کے ساتھ ذکر کرنا باعثِ عزت سمجھتا تھا۔"[2]

ترک مورخین اپنے سلاطین کا ذکر اسی سادہ مگر وسیع مفہوم کے لقب "خادم الحرمین" سے کرتے ہیں اور القاب کی اس طویل فہرست کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن سے یہ سلاطین یاد کئے جاتے تھے، سلطان سلیم نے اس لقب کے ماسوا کوئی لقب سکہ میں کندہ نہیں کرایا، یہی معمول سلطان سلیم کے پیشرو اور اس کے جانشین سلاطین کا رہا ہے۔ سلطان سلیم کے باپ یزید ثانی (۱۴۸۱ء-۱۵۱۲ء) نے سکہ میں یہ عبارت کندہ کروائی تھی "صاحب القوۃ والنصر فی البر والبحر" سلیم کے پوتے مراد ثالث (۱۵۷۴ء-۱۵۹۵ء) کا لقب "سلطان البرین وخاقان البحرین" تھا، محمود ثانی (۱۸۰۸ء-۱۸۳۹ء) نے "سلطان سلاطین العصر" اپنے لئے استعمال کیا تھا، لیکن کسی عثمانی سلطان نے اپنے لئے خلیفہ

[1] Tableau Generale Empire Othoman
[2] Caliphate P. 145

امام یا امیر المومنین، کا لقب اختیار نہیں کیا اور نہ اپنے سلسلۂ نسب کو خلفاء عباسیہ سے ملانے کی کوشش کی لہ

عالمِ اسلامی، عثمانیوں کے جاہ وجلال اور قوت وحشمت سے ناواقف نہ تھا، اپنے زمانہ میں سلطان سلیم مسلمانوں کا سب سے بڑا فرمانروا تھا، اس نے ایرانیوں اور مصر کے مملوکوں کی حکومتوں کو شکست دی اور یورپ کی مسیحی حکومتوں کا شجاعانہ مقابلہ کیا اور انھیں پیہم شکستیں دیں۔ حرمین (مکہ ومدینہ) کو اپنی پناہ میں لے لیا، جن پر پرتگالی بحر احمر کی طرف سے غارت گری کیا کرتے تھے۔ اسلام میں خلافت اور حرمین میں جو مستحکم رشتہ ہے اس کے بیان کرنے کی غالباً ضرورت نہیں۔ مسلمانوں کے اعتقاد میں خلیفہ اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتا تھا جب تک وہ حامئ حرمین نہ ہو اس دعوی کی دلیل کے لئے یزید بن معاویہ اور عبدالملک بن مروان کے زمانہ کی تاریخ کے اوراق الٹنا پڑیں گے اور ان واقعات کو پیش نظر رکھنا پڑے گا جو عہدِ عباسیہ میں رونما ہوئے تھے۔ جب قرامطہ کا حرمین پر سنہ ۳۱۸ھ۔ سنہ ۳۳۸ھ = سنہ ۹۳۰ء۔ سنہ ۹۵۰ء کے دوران میں تسلط تھا اور ان حوادثات کا جائزہ لینا ہوگا جو سنہ ۶۳۸ھ۔ سنہ ۶۵۰ھ = سنہ ۱۲۳۸ء۔ سنہ ۱۲۵۰ء کے دوران میں ظہور پذیر ہوئے تھے، جب حرمین پر دولت رسولیہ کا قبضہ تھا۔ یہی عقیدہ مسلمانوں کے دل ودماغ پر مصر کے فاطمیوں، ایوبیوں اور مملوکوں کی حکومتوں کے وقت کارفرما تھا۔ اس سرسری جائزہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمان فرمانروا حرمین پر فرمانروائی کے لئے کتنی جدوجہد سے کام لیتے تھے۔

سلطان سلیم نے جب مملوکوں کے ملک پر جس میں حرمین بھی داخل تھے قبضہ کیا، اس وقت اس نے بہت فخر وانبساط کے ساتھ اپنے لئے "خادم الحرمین" کا لقب استعمال کیا اور ہمیشہ اپنے لئے باعث صد عزت خیال کرتا رہا۔

سلطان سلیم فتح مصر سے قبل خلیفہ کے لقب سے انتساب رکھتا تھا اور اس کے آباواجداد ڈیڑھ سو برس سے اس لقب سے یاد کئے جاتے تھے لیکن فتح مصر کے بعد یہ لقب اس کے نام کے

لہ — The Caliphate, P. 147-148

ساتھ نظر نہیں آتا۔" قضاۃ بروسہ" فتح مصر کے بعد سلطان سلیم کو ان القاب سے "صاحب الجلالہ، ظل اللہ، بادشاہ، حامی العالم، فلیثبت اللہ ھذہ الاسرۃ تحمل وعائم الخلافۃ" (خدا اس خاندان کو بقائے دوام عطا فرمائے جو خلافت کے ستونوں کو اٹھائے ہوئے ہے) مخاطب کرتے تھے۔ ان القاب سے سلاطین عثمانیہ کو ڈیڑھ سو برس سے مخاطب کیا جاتا تھا، عثمانیوں کی تاریخ میں امام یا امیرالمومنین کا لقب کسی جگہ دکھائی نہیں دیتا ہے۔

سلطان سلیم اگر اصطلاحی مفہوم میں خلیفہ ہوتا تو اس کا ذکر ان خطوط میں ضرور ہوتا جو اس کے بیٹے سلطان سلیمان نے اسے بھیجے تھے لیکن ان میں نہ خلافت کا لفظ نہ قریب المعنی کوئی لفظ نظر آتا ہے سلطان سلیمان کے ان مراسلات میں بھی جو جو اس نے بڑے بڑے عہدہ داروں کے نام سلطان ہونے کے بعد لکھے تھے کوئی ایسا لفظ نہیں ملتا جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ اس کا باپ اصطلاحی مفہوم میں خلیفہ تھا، ان خطوط میں وہ سلیم کے لئے سلطان، خاقان اور خادم الحرمین وغیرہ القاب ذکر کرتا ہے، یہ سب القاب پیشرو عثمانی سلاطین کے تھے، ان میں "خادم الحرمین" کے لفظ کا ضرور اضافہ ہوا تھا۔ قاہرہ کے ایک مدرسہ میں، جسے سلطان سلیم کے عہد میں، سلیمان پاشا صدر اعظم نے ۱۵۴۳ء میں تعمیر کرایا تھا، ایک کتبہ لگا ہے، اس میں سلطان سلیم اول کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے "الخاقان الاعظم ملک ملوک العرب والعجم"

اس سے انکار نہیں کہ بعض وابستگان سلطان اپنے قصائد مدحیہ میں اسے خلیفہ کے لقب سے یاد کرتے تھے، ان میں ابن زنبل جو فتح مصر میں سلطان کے ساتھ تھا خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے، اس نے سلطان سلیم کو خلیفۃ اللہ فی الارض کے لفظ سے خطاب کیا ہے، مورخ قطب الدین، مفتی مکہ نے سلیم کا تذکرہ خاقان اور خیر الخلفاء کے الفاظ میں کیا ہے، شریف برکات بن محمد بن برکات نے ۱۵۲۰ء میں سلطان سلیمان کو تخت نشینی کی مبارکباد دی کا جو خط لکھا تھا، اس میں خلیفۃ اللہ کے لفظ سے مخاطب کیا تھا، قطب الدین، مفتی مکہ نے سلیمان ثانی (۱۵۶۶ء تا ۱۵۷۴ء) کا ذکر خلیفہ کے لقب سے کیا ہے۔ ان باتوں کا جواب یہ ہے کہ فتح مصر سے

قبل عثمانی حکمران کو ایک طاقتور و خود مختار فرمانروا ہونے کی بنا پر خلیفہ کہدیا جاتا تھا، لیکن وہ اس اصطلاحی مفہوم میں خلفاء نہ تھے، جس میں ان الفاظ کا اطلاق خلفاء راشدین اور بنی امیہ کے عہد میں کیا جاتا تھا۔

سلطان سلیم کے جانشینوں میں بھی کسی نے خلیفہ، امام یا امیر المومنین کا لقب اختیار نہیں کیا، یہ الفاظ سرکاری خطوط تک میں کہیں نظر نہیں آتے، ممکن ہے اس کی وجہ سلاطین عثمانیہ کا حنفی ہونا ہو، حنفی نقطہ نظر سے "خلافت حقہ کی مدت صرف تیس برس ہے۔ ترکی فقیہ ابراہیم حلبی کی کتاب "ملتقی الابحر" میں جو عثمانی تاریخ میں نہایت اہمیت رکھتی ہے، کوئی لفظ ایسا نہیں ملتا ہے جو کسی عثمانی سلطان کی خلافت پر دلالت کرتا ہو، ۱۵۷۵ء میں فریدون بک، سکریٹری صدر اعظم محمد صقلی نے مراد ثالث کی خدمت میں چند سیاسی رسائل کا مجموعہ جن میں بیس شاہی خطوط کے نمونے بھی تھے پیش کیا تھا، اس میں بھی خلیفہ کا لفظ کہیں دکھائی نہیں دیتا ہے صرف چار جگہ خلافت کے الفاظ اس طرح آگئے ہیں" مرتبۃ الخلافۃ، روضۃ الخلافۃ ... الخ

سلاطین عثمانیہ نے اٹھارویں صدی عیسوی میں سب سے پہلے خلیفہ کا لقب، سیاسی اغراض کے لئے استعمال کیا، غرض یہ تھی کہ انھیں مذہبی اثر و نفوذ، عالم اسلامی پر حاصل ہو جائے، جس کا بڑا حصہ عیسائی حکومتوں کے ماتحت تھا۔ معاہدہ کچوق کینارجی ..... (Kuchuk Kainarji) میں جو سلطان عبدالحمید اول اور کیتھرائن دوم، ملکہ روس کے درمیان ۱۷۷۴ء میں ہوا تھا، سلطان کا ذکر امام اور خلیفہ کے الفاظ میں کیا گیا۔ اور ملکہ روس نے سلطان ترکی کی مذہبی فرمانروائی جزیرہ نما قرم کے مسلمانوں پر تسلیم کر لی۔ سلطان ترکی کو وہاں اپنا گورنر، قاضی اور مفتی مقرر کرنے کا اختیار دیا گیا، لیکن جب روس نے یہ محسوس کیا کہ یہ چیز عثمانیوں کے سیاسی اثر و نفوذ کا دائرہ وسیع کرنے کی تمہید ہے تو ۱۷۸۳ء میں اس معاہدہ کو ختم کر دیا گیا۔ ۱؎

۱؎ The Caliphate. P. 165.

انیسویں صدی عیسوی سے عثمانی فرماں رواؤں نے قدیم اصطلاحی مفہوم میں یعنی جمہور مسلمین پر غلبہ واقتدار کے معنیٰ میں خلافت کا لقب اپنے لئے استعمال کرنا شروع کیا یہ سلطان عبدالحمید ثانی کا زمانہ تھا چنانچہ یہ لقب مدحت پاشا وزیر اعظم کے دستور حکومت میں جو ۲۳ر دسمبر ۱۸۷۶ء میں نافذ ہوا تھا، سرکاری طور سے داخل کیا گیا۔ اس دستور کی تیسری دفعہ میں صراحت کی گئی کہ سلطنت عثمانیہ عظمیٰ جو اب اسلامی خلافتِ عظمیٰ کی بھی حامل ہے، عن قریب شاہی خاندان کے ایک بڑے فرد کے ہاتھ میں آنے والی ہے۔ چوتھی دفعہ میں اس کی وضاحت تھی کہ صاحبِ عظمت واجلال، سلطان عبدالحمید خاں خلیفۃ المسلمین، حامیٔ دینِ اسلام قرار پائے ہیں۔" لہ

عثمانیوں کی . . . خلافت کے باب میں یہ عہدِ حاضر کے مورخین کے خیالات ہیں، قدیم مورخین ان کے ہم آہنگ نہیں ہیں، ان کا بیان ہے خلیفہ عباسی متوکل خلافت سے دستبردار ہوگیا تھا، اس کے بعد سلطان سلیم کو "امیر المومنین" کا اعزاز حاصل ہوگیا اور اس وقت سے خلافتِ عباسیہ عثمانی خاندان میں منتقل ہوگئی۔

قسطنطنیہ سے خلافتِ عثمانیہ کا زوال

خلافتِ عثمانیہ ۱۹۲۴ء تک کسی نہ کسی حالت میں زندہ رہی ۔ سلطان عبدالحمید کی تخت نشینی کا زمانہ سلطنت عثمانیہ کے ضعف و انحطاط کا دور تھا مسیحی حکومتوں نے عثمانی مملکت کی بنیادیں ہلا دی تھیں، حکومتِ عثمانیہ کے ماتحت عیسائی ملکوں میں مسلسل بغاوتیں ہو رہی تھیں، اس پُرآشوب زمانہ میں روس نے ۱۸۷۷ء میں دولتِ عثمانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا اس وقت رومانیہ، سرویا اور مانٹینگرو عثمانیوں کے ہاتھ سے نکل گئے اور وہاں خودمختار حکومتیں قائم ہوگئیں اس وقت سلطنتِ بلغاریہ بھی برائے نام دولتِ عثمانیہ کے ماتحت رہ گئی۔ درحقیقت اب اس کی حیثیت ایک آزاد مملکت کی تھی۔

لہ The Caliphate. P.173.

موت و زندگی کی اس کشمکش میں عثمانی فرمانروا نے عالمِ اسلامی کی طرف اس امید میں نظر اٹھائی کہ ممکن ہے مسلمانوں کی ہمدردیاں عثمانی مملکت کی ہلتی ہوئی بنیادیں تھام لیں، ورنہ ان مسلمانوں کی طرف سے کم سے کم اطمینان ہو جائے جو ترکوں کے خلاف ریشہ دوانی کرنے والی مسیحی حکومتوں کے ماتحت رہتے تھے، اس مقصد کے لئے سلطان عبدالحمید خاں نے مسلمانوں کے درمیان ایک مستحکم رشتہ قائم کرنے کے لئے خلافت کا احیار کیا اور اخبارات کے اجرار سے اپنے مشن کو کامیاب بنانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے۔ وجہ یہ تھی کہ اڈیٹر پروپگنڈہ کے فن میں ناتجربہ کار تھے اور بلادِ اسلامیہ کی نفسیات، ذہنیت اور زبان سے ناواقف تھے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اہلِ سنت اس پر اڑے ہوئے تھے کہ خلافت صرف قریش میں قائم ہو سکتی ہے۔ بعض مسلم سلطنتیں مغربی حکومتوں کے ماتحت تھیں جنھوں نے مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی وحدت کو قریب قریب ناممکن بنا دیا تھا۔

۱۹۰۸ء میں "احرار ترکوں" نے سلطان عبدالحمید کے خلاف بغاوت کر دی اور انھیں معزول کر کے ان کا دستورِ حکومت ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور خود قوم کے ناخدا بن کر اصلاحات کے لئے اٹھے۔ انھیں اس بات پر ناز تھا کہ ہم نے استبدادی حکومت کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

سلطان عبدالحمید خاں کی معزولی کے بعد دولتِ عثمانیہ کی حالت اور بھی ردی ہو گئی، اتحادیوں نے بحرِ مرمرہ اور استنبول کے ساحلوں پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ۱۹۲۲ء میں یہ "مریضِ سخت جان" پھر سنبھل گیا اور ترکوں نے اتحادیوں کو شکست دی اور ۱۱ر اکتوبر ۱۹۲۲ء میں معاہدہ مودانیہ ہوا، جس کی رو سے اتحادیوں کو وہ مقامات خالی کرنے پڑے۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۳ء میں "مجلس وطنی کبیر" نے سلطنتِ عثمانیہ کو ختم کر دیا "جمہوریہ ترکیہ" کا اعلان کیا اور اس کے صدر مصطفےٰ کمال پاشا منتخب ہوئے، اس وقت سے عثمانیوں کی تاریخ کا ایک جدید باب شروع ہوا ہے

اس کے بعد ترکوں نے اس خیال سے کہ خلافت کی بقا رجعت پسندانہ حرکات کی موجب ہے دوسرے اسلام میں مذہب اور سیاست ایک چیز ہے۔ خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ یہ ۳ر مارچ سنہ ۱۹۲۴ء کا واقعہ ہے۔

~~~~~~
~~~~~~

۲- وزارت

وزیر کا لفظ "وِزر" سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ثقل کے ہیں، وزیر کے شانوں پر نظم و نسق کا بار ہوتا ہے، اس لئے اسے وزیر کہتے ہیں لے

"انتظامِ حکومت کی ذمہ داریاں تنہا سلطان نہیں اٹھا سکتا ہے اس لئے ناگزیر ہے کہ اپنائے جنس کا سہارا لے۔ سلطان اپنی انفرادی زندگی کے معمولات میں جب دوسروں کا دستِ نگر ہوتا ہے تو نوعِ انسانی پر حکومت اور رعایا کے نظم و نسق میں کتنا حاجتمند ہوگا" ۲

وزارت اسلام کی جدید اختراع نہیں ہے، اسلام سے قبل اس کا وجود عہدِ ساسانیاں میں پایا جاتا تھا اور بنی اسرائیل بھی اس سے ناواقف نہ تھے۔ ۳

وزارت عہدِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، خلافتِ راشدہ، اور خلافتِ بنی امیہ میں

اگر وزارت کا مفہوم، نظم و نسق میں فرماں روا کا ہاتھ بٹانا ہی تو یہ صدر اسلام میں پائی جاتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سیاسی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں . . . حضرت ابوبکرؓ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے، یہی وجہ تھی کہ جو عرب رومیوں اور ایرانیوں سے اختلاط کی وجہ سے اس لفظ سے مانوس تھے، وہ حضرت ابوبکرؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وزیر کہا کرتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں یہ اعزاز حضرت عمرؓ کو حاصل تھا حضرت ابوبکرؓ اہم امور کا فیصلہ ان کے مشورہ سے فرمایا کرتے، ان کے سپرد عدالت اور تقسیم زکوٰۃ کا محکمہ بھی تھا حضرت عمرؓ کے عہد میں حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی حیثیت وزراء کی تھی، پیچیدہ مسائل میں وہ ان کے فہم و تجربہ سے فائدہ اٹھایا کرتے اور بہت سی دوسری ذمہ داریاں بھی ان دونوں کے

لے دیکھئے تفصیل الفخری ص ۱۳۷ - ۲ مقدمہ ابن خلدون ص ۲۰۸ - ۳ سورہ طٰہٰ آیت ۲۹ -

شانوں پر تھیں، مثلاً حضرت علیؓ کے ذمہ کتابت (Secretary Ship) محکمہ جیل اور مسلمان قیدیوں کے فدیہ کا انتظام تھا۔

ان حضرات کی ذمہ داریاں ایک وزیر سے کسی طرح کم نہ تھیں لیکن انھیں وزیر کے لقب سے خطاب نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ عرب اس وقت عام طور پر اس لفظ سے ناواقف تھے، یہ وہ وقت تھا جب اسلام اپنی سادگی کے دور سے گذر رہا تھا اور شاہانہ شان و شوکت اور کر و فر سے اُسے نفرت تھی۔ اس زمانے میں خلیفہ نظمِ مملکت میں "مجلسِ شیوخ" سے مشورہ کرتا تھا، یہ مجلس بڑے بڑے صحابہؓ، اعیانِ قوم اور سردارانِ قبائل پر مشتمل تھی، اس کا اجلاس مسجدِ نبوی میں ہوتا تھا، خلیفہ اہم امور کا فیصلہ اس مجلس کے مشورہ سے کرتا تھا، یہ نظمِ مملکت بڑی حد تک جمہوری نظام سے مشابہ تھا۔

بنی امیہ کی خلافت، جب موروثی ملوکیت کی شکل میں قائم ہوئی، اس وقت انھیں بھی اپنی سیاسی پالیسی عمل میں لانے کے لئے وزرار کی ضرورت پڑی، اس مقصد کے لئے چند اربابِ فہم و دانش کا تقرر کیا گیا، اعزاز اور قوت میں ان کی حیثیت وزیروں سے کم نہ تھی، اگرچہ اس لقب سے انھیں خطاب نہیں کیا جاتا تھا۔ زیاد بن ابیہ کا ایک نام ضرور ایسا ہے، جسے امیر معاویہ کے وزیر کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

وزارت عباسیہ کے دورِ عروج میں

بنی عباسیہ کا نظمِ خلافت، ساسانی دستورِ حکومت کی بنیاد پر قائم ہوا تھا اس دستور میں وزارت کا منصب اور اس کے فرائض و اختیارات بھی موجود تھے، عباسیوں کے دورِ عروج میں عہدِ ساسان کی طرح وزیر خلیفہ کا دایاں بازو اور نظمِ مملکت کا محور تھا، گورنروں کا عزل و نصب، مالیات کا نظم و نسق اور محکمۂ امورِ خارجہ اُس کے سپرد تھا، صحیح معنی میں وہ نائب خلافت ہوتا تھا اور فوج اور سول دونوں کا سب سے بڑا حاکم تھا، خلیفہ سے وفاداری اس کا منصبی فرض تھا۔

خلافتِ عباسیہ کے جاہ و جلال کا عقاب، جب آسمان پر اڑ رہا تھا، اس وقت وزارتِ عظمیٰ کی حیثیت بھی بہت بلند تھی، وزیرِ اعظم نظم و نسق میں خلیفہ کا نائب اور سب سے بڑا

حاکم تھا۔ مالیات اور دیوانی مالیات کا سب سے بڑا افسر تھا۔ اُس کی ہدایات کے ماتحت فوجوں کی تنخواہوں کا بجٹ بنایا جاتا تھا اور وہ آمد وصرف میں توازن کا خیال رکھتا تھا۔ وزارتِ خارجہ کی ذمہ داری بھی اسی کے سپرد تھی، تاکہ خارجی ـــ پالیسی ۔۔۔۔ کے ۔۔۔۔ رازوں کا افشار نہ ہو سکے کیونکہ اگر محکمۂ امور خارجہ غیر ذمہ دار یا چند اشخاص کے سپرد کیا جائے تو رازوں کا چھپانا معمولاً ناممکن ہے۔ ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس منصب کا ماہور نہایت بلند پایہ ادیب اور سیاست کار ہوتا تھا، اس لئے وزیر اعظم سے بہتر یہ فرض دوسرا انجام نہ دے سکتا تھا مہرِ خلافت ثبت ہو جانے کے بعد شاہی کاغذات وزیر اعظم کی حفاظت میں دیدیئے جاتے تھے، اور مہرِ خلافت بھی اس کے پاس امانت رکھدی جاتی تھی۔

غرض وزارتِ عظمیٰ کی شخصیت سیف وقلم دونوں کی حامل تھی اور خارجی اور داخلی کوئی شعبہ اس کے حیطۂ اقتدار سے خارج نہ تھا، اسی بنا پر جعفر بن یحییٰ برمکی، ہارون رشید کے دورِ خلافت میں "سلطان" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، نظمِ مملکت اسی کے اشارہ سے گردش کرتا تھا" حجابت کے ماسوا حکومت کے تمام فرائض و اختیارات اسی کی ذات میں مجتمع تھے، "حجابت" میں دروازہ پر کھڑا ہونا پڑتا تھا اس لئے اسے اپنے لئے باعثِ ننگ خیال کرتا تھا۔ [۵۱]

وزیر[۵۲]، بادشاہ اور رعایا کا درمیانی واسطہ تھا، اس لئے اس کے تقرر کے لئے اس کی فطرت کے دو پہلو دیکھنے پڑتے تھے، ایک پہلو وہ ہوتا تھا، جو سلاطین کی طبیعت کے مناسب ہو، دوسرا پہلو وہ جو عوام کی طبیعتوں سے مناسبت رکھتا ہو، تاکہ وہ دونوں فریقوں سے نباہ کر سکے دیانت داری اور سچائی سب سے پہلی شرط خیال کی جاتی تھی، پختہ کاری، انتظامی صلاحیت، تدبر، فہم ودانش، بیدار مغزی اور سیاست کاری، وزارتِ عظمیٰ کے لازمی عناصر تھے، یہ بھی ناگزیر تھا کہ غیر معمولی فضل وعلم اور سخاوت کا بے پایاں جذبہ رکھتا ہو، وزیر اعظم کے لئے رفق ونرمی، وقار و سنجیدگی، مستقل مزاجی، حلم ووقار اور قوانین کے نفاذ کی صلاحیت اور طاقت، یہ اوصاف

---

[۵۱] مقدمہ ابنِ خلدون ص ۲۰۷ - [۵۲] الفخری ص ۱۳۶، ۱۳۷ -

بھی ضروری خیال کئے جاتے تھے۔ [1]

وزارتِ عظمیٰ کے فرائض و اختیارات سب سے پہلے عہدِ عباسیہ میں مرتب کئے گئے، اس سے قبل سلاطین اور امراء ضرورت کے وقت اپنے خاص معتمد اور ارباب بصیرت سے مشورہ لیا کرتے تھے، انھیں کاتب یا مشیر کہا جاتا تھا، اور ان کی حیثیت وزراء کی سمجھی جاتی تھی۔ عباسیوں نے تاسیسِ خلافت کے بعد باقاعدہ وزارتِ عظمیٰ کا منصب قائم کیا اور اس کے آئین و حدود متعین کئے، اسے خطاب بھی "وزیر" کے لقب سے کیا جاتا تھا، عباسیوں کا سب سے پہلا وزیر ابو سلمہ خلال تھا، جو وزیر آلِ محمد کے نام سے معروف تھا، اسے سفاح نے دھوکہ سے قتل کرا دیا تھا اور اس کی جگہ ابو جہم کو مقرر کر دیا تھا، یہ دولتِ عباسیہ کا دوسرا وزیر تھا، ابو جہم کے بعد سفاح نے خالد بن برمک برامکہ کے جدِ اعلیٰ کا اس منصبِ جلیل کے لئے انتخاب کیا تھا۔

اس منصب کے لئے جب کسی شخص کا انتخاب عمل میں آتا تھا تو دو معتمد امیر نامۂ خلافت اس کے پاس لیجاتے تھے وہ دار الخلافت حاضر ہوتا اور خلیفہ کے سامنے آکر ادب سے کھڑا ہو جاتا، اس رسم کے بعد دوسرے کمرہ میں چلا جاتا جہاں وزارت کا خاص لباس زیب تن کرتا اور خلیفہ کے ہاتھوں کو ادب و احترام سے بوسہ دینے کے بعد یہاں سے رخصت ہو جاتا۔ دروازہ پر اُسے سجا سجایا گھوڑا موجود ملتا، اس پر سوار ہو کر دار الوزارت جاتا، احترام کے طور پر حکومت کے اعلیٰ افسر، جنرل، امراء دربار، قصر کے حاجب اور غلام ساتھ ساتھ چلتے۔ دار الوزارت کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے اتر پڑتا، اور اس خاص دربار کے وسط میں سے گزرتا ہوا مسند پر پہنچتا، جو اسی منصب کے اعزاز میں منعقد ہوتا تھا، اس دربار میں اس کی تقرری کا فرمانِ خلافت پڑھ کر سنایا جاتا۔ [2]

خلیفہ کا دفتر حکومت "دیوان عزیز" کے نام سے موسوم تھا، وزیر اعظم اس دیوان کے

---

[1] الفخری ص ۱۳۶ - ۱۳۷ - [2] Ameer Ali, A Short History of the Saracons. P. 413.

نظم ونسق کا منتظم ہوتا تھا، اور اسے "وزیر دیوان العزیز" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، بعض دفعہ محکموں کے افسروں کو بھی وزراء کے نام سے یاد کیا جاتا تھا مگر وہ ہمیشہ وزیر اعظم کے ماتحت ہوتے تھے۔[1]

وزارتِ عظمیٰ کے اس وسیع اقتدار کے باوجود عباسیوں کے دورِ عروج میں وزراء خلفاء سے لرزتے تھے، انھیں اپنی جان کی طرف سے ہر وقت اندیشہ لگا رہتا تھا، منصور نے جب سے اپنی سیاسی مصلحت کے لئے ابوجہم[2] کو زہر دیکر مار ڈالا تھا، اس وقت سے وہ اپنے آپ کو وزیر اعظم کہنے سے بھی جھجکتے تھے۔[3]

ابوایوب موریانی خلیفہ منصور نے خالد بن برمک کے بعد ابوایوب موریانی کو وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ پر مامور کیا، منصور نے اُسے بچپن میں خریدا تھا اور نہایت اعلیٰ تعلیم و تربیت دی تھی، ایک دفعہ اس نے ابوایوب کے ساتھ اپنے بھائی خلیفہ سفاح کے پاس کچھ ہدیہ بھیجا، سفاح نے جب اُسے دیکھا تو اس کی فصاحت و بلاغت اور غیر معمولی صلاحیت کا اسے اندازہ ہوا، اس نے منصور سے لے کر اُسے آزاد کر دیا اور اپنے ممتاز مقربین بارگاہ میں جگہ دی، اور بے شمار مال و دولت سے سرفراز فرمایا، سفاح کی موت تک وہ ان عنایات کا مرکز رہا۔ منصور نے اپنے عہدِ خلافت میں قلمدانِ وزارت اس کے حوالہ کر دیا، لیکن ابوایوب کو وزارتِ عظمیٰ کا منصب سازگار نہ آیا، اور بہت جلد منصور کی نظریں بدل گئیں، جب اس نے یہ دیکھا تو منصور کی خوشنودی کے لئے جائز و ناجائز مال و دولت سے خزانہ بھرنے لگا، مقصد اس سے اپنی کارگذاری دکھانا تھی۔ اس ضمن میں ایک دفعہ اس نے منصور سے اہواز کی ایک زمین کی اصلاح اور اسے قابل زراعت بنانے کے بہانہ سے تین لاکھ درہم کی منظوری حاصل کر لی اور اسے یقین دلایا کہ ریاست کی آمدنی پر اس کا

لہ Ameer Ali. P. 414.　　۲ے مروج الذہب ج ۴ ص ۳۵۲ والفخری ص ۱۴۰۔

سلہ منصور ابوجہم سے بے حد بغض و کینہ رکھتا تھا، یہ کچھ مدت سفاح کا وزیر اعظم بھی رہا تھا۔ ابوجہم نے جب زہر کے اثرات کو محسوس کیا تو اٹھ کر جانے لگا۔ منصور نے دریافت کیا، کہاں؟! جواب دیا "جہاں امیر المومنین نے بھیجا ہے۔" (خدا کے گھر)

اثر بہت خوشگوار پڑے گا لیکن خزانہ سے یہ رقم وصول کرکے اس نے اپنے گھر رکھ لی اور زمین کی نشو ونما پر ایک حبہ صرف نہ کیا۔ آخر سال میں موہوم زمین کی آمدنی کے نام سے بیس ہزار درہم خزانہ میں داخل کر دیتا تھا، برسوں یہ سلسلہ جاری رہا، حاسدوں کے کان میں جب اس کی بھنک پڑی تو انھوں نے منصور سے کہدیا، منصور نے خود جاکر اس زمین کا معائنہ کیا تو زمین جوں کی توں پڑی ہوئی تھی۔ خلیفہ جوشِ غضب میں لرزنے لگا اور ابو ایوب اور اس کے اہل وعیال کو موت کے گھاٹ اتار دیا، اور اس کا مال و دولت سب ضبط کر لیا۔ یہ ۱۵۴ھ کا سانحہ ہے۔[1]

ربیع بن یونس | ابو ایوب کے دردانگیز واقعہ کے بعد وزارتِ عظمیٰ کے لئے ربیع بن یونس کا انتخاب عمل میں آیا، ربیع، پختہ کار، بیدار مغز، صاحب فہم وفراست، سیاست داں، حکومت کا اہل، پاکیزہ سیرت، نیک کردار، شریف فطرت، ریاضی کا ماہر اور سلاطین کی نفسیات سے خوب واقف تھا۔

ایک روز منصور اپنے باغیچہ میں تھا، اس کی نظر ایک درخت پر پڑی جس کا نام "خلاف" تھا، منصور نے ربیع سے دریافت کیا، اس درخت کا کیا نام ہے؟ ربیع نے جواب دیا "اجماع و وفاق" لفظ "خلاف" کی بدشگونی سے اس نے احتراز کیا، وہ منصور کی نفسیات اور طبیعت کی افتاد سے واقف تھا۔

منصور کی موت تک ربیع اس کا معتمد اور وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ پر مامور رہا منصور کی وفات کے بعد ربیع نے اس کے بیٹے مہدی کی بیعت کا پروپیگنڈا کیا تھا، اس جرم میں ہادی نے اپنی خلافت کے زمانہ میں اسے قتل کرا دیا تھا۔

عباسیہ کے ابتدائی دور میں وزیر اعظم کی زندگی معرضِ خطر میں رہتی تھی اور جبینِ خلافت کی ایک شکن اُن کی ہستی کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتی تھی۔ تاہم رعایا پر وزیر اعظم کا غیر معمولی رعب و دبدبہ ہوتا تھا اور اس کی ہیبت سے لوگ لرز اٹھتے تھے۔ خلفاء کا معمول تھا کہ وہ اہم معاملات

---

[1] الفخری ص ۱۵۷ - ۱۵۹۔

ہیں اُن سے مشورہ ..... کر لیتے تھے، منصور کی حد سے زیادہ خود اعتمادی نے وزارت کی اہمیت کا خاتمہ کر دیا تھا، اس کے باوجود وہ ہمیشہ مہماتِ مملکت میں وزراء سے مشورہ ضرور کر لیتا تھا، اگرچہ اس کی شاہانہ ہیبت اور استبداد کے سامنے وزراء کی کوئی حقیقت نہ تھی، اور وہ ہمیشہ اس سے تھرتھراتے رہتے تھے چنانچہ منصور کے وزراء کے چہروں پر اطمینان اور خوشی کے احساسات کبھی کسی نے نہیں دیکھے تھے۔" [1]

یحییٰ بن خالد برمکی | وزارتِ عظمیٰ کا اقتدار اور اثر و نفوذ ہارون رشید کے عہد میں ذروۂ کمال تک پہنچ گیا تھا، ہارون نے "سپردم بتو مایۂ خویش را" کہہ کر قلمدانِ وزارت یحییٰ بن خالد برمکی کو سونپا تھا اور نہ صرف مہرِ خلافت، بلکہ اپنی مہرِ خاص بھی اسی کے حوالہ کر دی تھی، حکومت کا تمام نظم و نسق یحییٰ کے اشارۂ چشم و ابرو سے چلتا تھا، اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا جعفر بن یحییٰ اس کا جانشین مقرر کیا گیا تھا۔

جعفر بن یحییٰ برمکی | جعفر بن یحییٰ کے عہدِ وزارت میں برامکہ حکومت کی تمام مشینری پر چھا گئے تھے اور ہر شعبہ میں ان ہی کا عمل دخل تھا، ہارون رشید ایک معمولی رقم بھی براہِ راست خزانہ سے نہیں لے سکتا تھا یہ رقم بھی برامکہ کے واسطے سے اس کے پاس پہنچ سکتی تھی۔ ہارون کے مقابلہ میں برامکہ کی حیثیت فریقِ غالب کی تھی، حکومت کے تمام شعبوں پر خاندانِ برامکہ کے افراد چھائے ہوئے تھے دل و دماغ پر ان کی ہیبت اور عظمت کا سکہ بیٹھا تھا، وہ امید و بیم کے مرکز تھے، ان کے سامنے خلیفہ کو کوئی پوچھتا نہ تھا، سلاطین کے پاس سے آئے ہوئے ہدایا، سیدھے برامکہ کے پاس پہنچتے تھے اور خلیفہ کو عموماً خبر بھی نہ ہوتی تھی، برامکہ نے شیعوں اور اپنے عزیز و اقارب کے گھر مال و دولت سے بھر دیئے تھے۔

ایک بار عبدالملک بن صالح عباسی نے جعفر بن یحییٰ سے درخواست کی کہ ہارون سے میری تین حاجتیں پوری کرا دیجئے۔ دس لاکھ درہم دلا دیجئے، میں قرضہ ادا کروں گا، میرے بیٹے کو

---

[1] الفخری ص ۱۵۷۔

کسی صوبہ کا گورنر مقرر کرا دیجئے، اس سے میری حیثیت بڑھ جائے گی۔ خلیفہ کی صاحبزادی سے میرے بیٹے کا رشتہ کرا دیجئے۔ جعفر نے جواب میں کہا یہ رقم ابھی تمہارے گھر پہنچ جائے گی، تمہارے بیٹے کو میں مصر کا گورنر مقرر کرتا ہوں، امیر المومنین کی فلاں صاحبزادی کا اتنے اتنے مہر کے بدلہ تمہارے بیٹے کا نکاح کرتا ہوں[1]۔

عبدالملک جب گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ مطلوبہ رقم پہنچ چکی ہے، صبح کے وقت جعفر، ہارون کے پاس پہنچا اور اٹھنے سے قبل گورنری کا پروانہ اور نکاح کی منظوری حاصل کر لی۔

اس واقعہ سے جعفر کے اثر ورسوخ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہارون نے غیر معمولی بھروسہ کی بنا پر حکومت کا نظم ونسق اس پر چھوڑ رکھا تھا، برامکہ اس عہد میں مرجع خلائق تھے، ان کی غیر معمولی سخاوت اور نازیبا نہ تھی، برامکہ کی تعریف میں بے مثل قصائد لکھے گئے، ان کے جود وکرم کے واقعات طائفے مجلسوں میں گاتے تھے، تاریخ کے صفحات برامکہ کی غیر معمولی سخاوت کے واقعات سے معمور ہیں۔ ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

ہارون کی دوربیں نظر نے برامکہ کے اس جاہ وجلال سے مستقبل میں خطرہ محسوس کیا، اور اس اندیشہ سے اس کی نظریں بدل گئیں، نوبت یہاں تک پہنچی کہ جعفر قتل کرا دیا گیا۔ یحیی اور دوسرے صاحبزادے جیل میں ٹھونس دیئے گئے، ان میں سے یحیی اور فضل ہارون کی زندگی ہی میں جیل میں مر گئے، باقی خاندان جیل میں سڑتا رہا۔ امین نے اپنے دورِ خلافت میں اُن سب کو رہا کر دیا تھا۔ "برامکہ کی بربادی" تاریخ کا مشہور خونیں باب ہے۔

وزارت کی قسمیں عہد عباسیہ میں وزارت کی دو تقسیمیں تھیں۔

۱۔ وزارتِ تنفیذ:۔ اس میں وزیر خلیفہ اور رعایا کے درمیان صرف واسطہ ہوتا تھا وہ حکومت کے معاملات خلیفہ کی خدمت میں پیش کر دیتا تھا، ان پر صادر کئے ہوئے احکامات پر عمل درآمد کرتا تھا، حکومت کے نظم ونسق میں اس کا کوئی دخل نہ تھا، اس کی حیثیت ایک سکریٹری سے زیادہ نہ تھی،

[1] الفخری ص ۱۸۸

۲۔ وزارتِ تفویض:۔ یہ وزارتِ عظمیٰ کی حیثیت رکھتی تھی اس میں وزیر کو خلیفہ کی طرف سے حکومت کے نظم و نسق اور تصرفات کے اختیارات سونپ دیئے جاتے تھے، وزیر کے لئے یہ ضروری نہ تھا کہ انتظامی امور میں خلیفہ کی اجازت حاصل کرے، بلکہ اسے کلی اختیارات حاصل ہوتے تھے لیکن، خلیفہ کو آخری فیصلہ کرنے اور اس کے مقرر کئے ہوئے حکام کو معزول کرنے کا اختیار تھا۔

ابنِ خلدون کا بیان ہے:۔

"دولتِ عباسیہ میں جب استبداد کی کیفیت پیدا ہوئی تو اس کا محور ایک نہیں رہا بلکہ کبھی وزارتِ عظمیٰ بنی اور کبھی اس کا مرکزِ عمل سلطان کی ذات بنی، وزارتِ عظمیٰ جب حکومت کی مشینری پر حاوی ہوجاتی تو استبداد کا مرکز وزیرِ اعظم ہوتا۔ رائے عامہ کی نظر میں خلیفہ کے نائب ہونے کی وجہ سے اس کے احکامات کی حیثیت شرعی ہوتی تھی، اس لئے وہ مذہبی رنگ میں اپنے استبداد کو عمل میں لاتا تھا، جب وزیر کی حیثیت ایک پیشکار یا سکریٹری کی ہوتی تھی، اس وقت سلطان کا پلہ بھاری ہوتا تھا اور اسے جبر و استبداد کا موقع ملتا تھا"[1]

وزارتِ عظمیٰ کے لئے مجتہدانہ صلاحیتوں کے علاوہ فنونِ حرب اور مالیات کے صیغہ میں پوری مہارت لازمی خیال کی جاتی تھی۔ وزارتِ عظمیٰ اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی تھی جب تک وزیرِ اعظم فوجی صلاحیت اور فنونِ جنگ میں دستگاہ رکھتا ہو، اور مالیات کے صیغہ کو صحیح طور پر چلا سکتا ہو، مامون رشید کے الفاظ ہیں، وزارتِ عظمیٰ کے منصب کے لئے ضروری تھا کہ وہ نیک اطوار ہو، پاکیزہ عادات رکھتا ہو، مستقل مزاج ہو، انتہائی مہذب ہو، نہایت تجربہ کار ہو، اسرار چھپانے کا ظرف رکھتا ہو، مہماتِ حکومت انجام دینے کی صلاحیت موجود ہو، غیر معمولی ذہین اور دانشمند ہو، مدلل بات کرتا ہو، مردم شناس ہو، جری اور شجاع ہو، حکماء کی طرح

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۱۰۷۔۱۰۸

باوقار ہو، علماء کی طرح متواضع ہو، فقہاء کی طرح فہم رسا رکھتا ہو، احسان کے وقت احسان شناس ہو، ابتلاء کے وقت صبر و ضبط کا خوگر ہو، اندیشۂ فردا رکھتا ہو، زبان کی لطافت اور اپنے حسنِ بیان سے لوگوں کے دلوں کو موہ لیتا ہو، ان اوصاف کا حامل وزیرِ اعظم حکومت کا نظم و نسق نہایت کامیابی اور خوش اسلوبی سے چلا سکتا ہے۔

ماوردی کے الفاظ ہیں، وزیرِ اعظم یا نائب السلطنت کے اختیارات ہیں، احکام صادر کرنا، حکام کا تقرر کرنا، عدالت کا نظم و نسق چلانا، فوجوں کی قیادت کرنا یا کسی دوسرے کو اپنے اختیارات سے کمانڈر مقرر کر دینا، انتظامی امور کو صادر کرنا اور انھیں نافذ کرانا یہ سب داخل تھے۔

خلیفہ اور وزیرِ اعظم میں اتنا امتیاز تھا کہ خلیفہ کو آخری فیصلہ کرنے کا اختیار رہتا تھا اور وہ وزیرِ اعظم کے مقرر کیے ہوئے حکام کو معزول کر سکتا تھا، وزیرِ اعظم خلیفہ کے مامور افسروں کو معزول کرنے کا مجاز نہیں تھا۔

اس سے قبل بیان کیا گیا ہے کہ وزیرِ تنفیذ یا پیشکار سلاطین اور رعایا کے درمیان صرف واسطہ ہوتا تھا۔ وہ سلاطین کے صادر کیے ہوئے احکام پر عمل درآمد کرتا تھا، گورنروں کے پاس سلطان کے احکام روانہ کرتا تھا، فوجوں کے ساز و سامان کا انتظام کرتا تھا، بادشاہ کے سامنے مہماتِ سلطنت اور نئے پیدا شدہ واقعات کو پیش کرتا تھا، ان کے متعلق احکام حاصل کرتا تھا اور انھیں عمل میں لاتا تھا۔ ذاتی طور پر اسے حکومت کے نظم و انتظام میں مطلق دخل نہ ہوتا تھا۔

وزارتِ تنفیذ کے لیے ضروری تھا، دیانت دار ہو، تاکہ یہ اطمینان کیا جا سکے کہ اس نے واقعات میں آمیزش نہیں کی ہے اور شاہی کاغذات رد و بدل سے مامون ہیں، صداقت شعار ہو، تاکہ اس کی اطلاعات پر اعتماد کیا جا سکے، لالچی نہ ہو، تاکہ اطمینان ہو کہ وہ رشوت سے متنفر ہے اور رشوت لے کر کاغذات پیش کرنے میں تاخیر یا عجلت نہیں کرتا ہے، اس کا دل عداوت اور بغض و کینہ سے خالی ہو، ورنہ اس کا امکان ہے کہ وہ جو معاملات اپنے مخالفوں کے پیش کرے ان میں ذاتی عداوت کا جذبہ کارفرما ہو، نہایت سمجھ دار اور مردم شناس ہو، تاکہ دھوکہ دے کر لوگ اپنا

اُن کو سیدھا نہ کر سکیں اس میں نفسانیت اور خواہش پرستی کا جذبہ نہ ہو، ورنہ راہِ راست سے بھٹکنے کا اندیشہ ہے کیونکہ خواہشات انسان کی عقل پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور اچھے برے میں تمیز نہیں رہتی ہے۔ اگر سلطان اس وزیر کو مشورہ میں بھی شریک کر لیتا ہو تو یہ بھی دیکھا جاتا تھا کہ پختہ کار ہو تاکہ صحیح مشورہ دے سکے۔

اس عہدے پر عورت کا مامور کرنا ٹھیک نہیں ہے، آپ نے فرمایا "جس قوم نے حکومت کا نظم ونسق عورتوں کے سپرد کیا اس نے کبھی فلاح وبہبود نہیں پائی"۔ دوسرے خطرات کو نظر انداز کیجئے، یہ کوتاہی بھی ہے کہ ان میں صابت رائے اور ثباتِ عزم کی بھی کمی ہوتی ہے اور اس عہدہ کے لئے یہ چیز لازمی ہے اس عہدہ پر ایک ایک ذمی بھی مامور کیا جاسکتا تھا، اگرچہ وزارتِ تفویض یا وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ پر اس کا تقرر جائز نہ تھا، کیونکہ وزارتِ عظمیٰ کے لئے "امامت" کی شرطیں لازمی تھیں،

دونوں وزارتوں کے اختیارات میں چند نمایاں فرق تھے۔

(۱) وزیر اعظم کو، حکومت اور عدالت پر پورا اختیار تھا۔

(۲) گورنروں کا عزل ونصب اس کے اختیار میں تھا،

(۳) فوجی اور جنگی معاملات میں کلی اختیارات حاصل تھے۔

(۴) مالیات پر کامل اختیار تھا۔

وزیرِ تنفیذ یا سکرٹری کو یہ اختیارات حاصل نہ تھے وہ محض ایک پیشکار کی حیثیت رکھتا تھا خلیفہ دو وزیرِ تنفیذ اجتماعی یا انفرادی طور سے مقرر کر سکتا تھا مگر دو وزیرِ تفویض ایک ساتھ مقرر نہیں کرتا تھا، وجہ ظاہر ہے، وزیرِ تفویض نائب السلطنت ہوتا تھا اور حکومت کے نظم ونسق میں اسے کلی اختیارات ہوتے تھے۔

قانونِ فطرت ہے، زمین وآسمان میں اگر دو خدا ہوتے تو دونوں کے نظام میں خلل آجاتا[1] ایک مملکت کی تو ہستی ہی کیا ہے!!

[1] آیۃ ۲۲ سورۂ انبیاء

وزارت عباسیہ کے دورِ انحطاط میں

عہدِ عباسیہ میں قلمدانِ وزارت ایرانی خاندانوں میں رہا، ان میں برامکہ، بنی سہل، بنی طاہر، بنی فرات اور بنی جراح نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔

بنی جراح کے دو فرد، علی بن عیسیٰ (وزیرِ اعظم خلیفہ مقتدر) اور عبد الرحمٰن بن عیسیٰ (وزیرِ اعظم خلیفہ راضی) عہدِ عباسیہ کی ممتاز شخصیتیں ہیں۔ خلفاء عباسیہ کی حیثیت کمزور پڑ جانے کے بعد سے وزارتِ عظمیٰ کا اقتدار بڑھ گیا تھا، وزارت کے غیر معمولی اقتدار کو دیکھ کر ہر ممتاز امیر کی نظریں اس پر حریصانہ پڑتی تھیں۔

تیسری صدی ہجری کے آخر سے، جب خلفاء عباسیہ کے ہاتھ، عصائے جہانبانی کے بوجھ سے کانپ رہے تھے، وزارت کے لئے حریفانہ مقابلہ شروع ہو گیا تھا، اور ایک دوسرے کو شکست دینے کے لئے کوئی تدبیر اٹھا نہیں رکھی جاتی تھی، چنانچہ ریشہ دوانیاں کی جاتی تھیں، خلیفہ کو بڑی بڑی رشوتیں دی جاتی تھیں اور ذلیل سے ذلیل حرکت کرنے سے بھی نہیں جھجکتے تھے۔

یحییٰ بن خاقان ابنِ خاقان عباسیہ کے دورِ انحطاط کی نمایاں ہستی ہے، یہ مقتدر (۲۹۵ھ۔ ۳۲۰ھ) کا وزیرِ اعظم تھا، اس کے امتیازی اوصاف، بد طینتی اور بے تدبیری تھے، اسے عزل و نصب کا گویا مرض تھا۔ ایک دفعہ اس نے کوفہ کے لئے انیس[۱۹] گورنروں کا تقرر ایک دن میں کیا تھا، اور ان سب سے رشوت وصول کی تھی، اتفاق سے ایک منزل پر اُن سب کا اجتماع ہو گیا تو حقیقت معلوم ہوئی۔ [۱]

علی بن عیسیٰ ۳۰۱ھ میں ابنِ خاقان اپنی بے اعتدالیوں کی وجہ سے معزول کر دیا گیا، اور اس کی جگہ علی بن عیسیٰ کا تقرر عمل میں آیا" عہدِ عباسیہ میں کوئی وزیر اتنا عابد زاہد، اتنا پاکیزہ اوصاف اور اتنا زبردست اہلِ قلم نہیں گزرا ہے، یہ قرآن کا حافظ، معانی و تفسیر سے باخبر، اور غیر معمولی سخی تھا"[۲]

علی بن عیسیٰ نے فقراء اور بے بس انسانوں کی حالت سدھارنے کی طرف عملی قدم اٹھایا

---

[۱] و [۲] الفخری ص ۲۴۰ و ۲۴۱۔

اور اس مقصد کے لئے اپنی ذاتی جائداد کی نصف آمدنی وقف کر دی، اس وقف کی سالانہ آمدنی اسی ہزار دینار (۴ لاکھ روپیہ) سے زیادہ تھی، اس کے ماسوا اور بہت سے وقف کئے تھے، ان اوقاف کے انتظام کے لئے ایک مستقل محکمہ "دیوان البر" کے نام سے قائم کر دیا تھا، حرمین اور سرحدوں کی تحفظ کے فنڈ میں جو آمدنی ہوتی تھی، اسے نہایت دیانتداری سے انھیں مدوں میں صرف کیا جاتا تھا دوسری مدوں میں اُسے صرف کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

اصلاحات کا دائرہ اسی جگہ ختم نہیں ہوگیا، بلکہ اس نے دفتروں کے نظم ونسق میں اصلاح کی، حکومت کے داخلی نظام کو درست کیا، اس کے دورِ وزارت میں ملک کا امن وامان بحال ہوگیا اور حکومت کا نظم ونسق اعتدال پر آگیا، یہ اس کی غیر معمولی سیاست دانی اور حکومت کی بلند پایہ قابلیت کا نتیجہ تھا، ورنہ اس دورِ انحطاط میں اس کی توقع بھی نہیں ہوسکتی تھی، یہ وزیر نہایت عادل تھا، عدل وانصاف کے وقت امیر وغریب، شریف ورذیل اس کی نظر میں سب برابر تھے، اس معاملہ میں کسی رورعایت کا قائل نہ تھا، اکثر اوقات عدالت کا اجلاس اور جھگڑے قضیوں کا فیصلہ خود کرتا تھا۔

علی بن عیسیٰ کا ایک کارنامہ یہ تھا کہ اس نے مفادِ عامہ کے کاموں کے لئے مدینۃ السلام کی آمدنی، سواد کی مالگذاری اور تقریباً تیرہ ہزار دینار (۶۵ لاکھ روپیہ) الگ کر دیئے تھے، اور حرمین اور سرحدوں کے بجٹ میں اسی ہزار دینار (۴ لاکھ روپیہ) سے زیادہ گنجائش رکھی تھی، اونٹوں اور خچروں کی ایک بہت بڑی تعداد رفاہِ عام کے لئے جدّہ سے مکہ معظمہ پانی لاد کر لاتی تھی اس کی وجہ سے ہر طبقہ کو پانی بافراط پہنچنے لگا تھا، اس نے مسخروں کو دربار سے نکال باہر کیا تھا، اور ظلم وستم کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا۔

بنو عباسیہ کی بدقسمتی سے اس مصلح وزیر کی وزارت کی عمر دراز نہ ہوسکی اور اسے معزول کر دیا گیا، اس کی معزولی کی وجہ خلیفہ مقتدر کی صغرسنی اور عورتوں کا حکومت میں اثر واقتدار تھا، حکومت کا نظم ونسق اس کی ماں "سیدہ" کے ہاتھ میں تھا، اور حکومت کی مشنری اسی کے اشارۂ

چشم وابرو پر گردش کرتی تھی، اس کے اقتدار کا یہ حال تھا کہ "سیدہ" تو "سیدہ" اس کی کسی مصاحبہ کا عتاب بھی وزارتِ عظمیٰ کے منصب سے اتار سکتا تھا، چنانچہ علی بن عیسیٰ پر ایک مصاحبہ ام موسیٰ کا عتاب نازل ہوا تھا اور وہ معزول کر دیا گیا، بات اتنی سی تھی کہ ام موسیٰ نے عیدالاضحیٰ کے موقع پر کچھ رقم طلب کی تھی، وزیر اعظم نے معذرت کر دی تھی، بس پھر کیا تھا غضب آگیا، اور "سیدہ" کے کان اس کے خلاف اتنے بھرے گئے کہ اسے وزارت سے دستبردار ہونا پڑا، یہ دوشنبہ ۸ ذی الحجہ ۳۰۴ھ کا واقعہ ہے۔[1]

حامد بن عباس علی بن عیسیٰ کا جانشین حامد بن عباس مقرر کیا گیا، یہ شخص اگرچہ صاحب فضل و کرم تھا اور مالیات کے شعبہ میں خاص مہارت رکھتا تھا مگر قلمدانِ وزارت سنبھالنے کی اس میں صلاحیت نہ تھی، اس کی نااہلی کا اندازہ کرکے خلیفہ مقتدر نے سابق وزیر اعظم علی بن عیسیٰ کو اس کا مددگار مقرر کر دیا تھا، علی بن عیسیٰ نے اپنے غیر معمولی سیاسی شعور سے بگڑے ہوئے نظام کو ایک دفعہ اور سدھار دیا تھا اور اپنی بے مثل قابلیت اور عالمگیر ہمدردی کی وجہ سے حکومت کی مشینری پر چھا گیا تھا، وزیر اعظم حامد بن عباس کی اس کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہ تھی، دربار میں صرف اتنا رسمی امتیاز ضرور تھا کہ حامد بن عباس دولت عباسیہ کا یونیفارم سیاہ لباس پہن کر مسند وزارت پر جلوہ فرما ہوتا تھا اور علی بن عیسیٰ اس کے سامنے ادب سے معمولی لباس میں بیٹھتا تھا۔[2]

ابن مقلہ مقتدر کے دورِ حکومت میں وزراء کے روزانہ عزل و نصب کی وجہ سے خلافتِ عباسیہ کی داخلی حالت نہایت ابتر ہو گئی تھی، اس کے عہد میں یکے بعد دیگرے بارہ وزیر مقرر ہوئے تھے ان میں بعض تو کئی دفعہ معزول ہوئے تھے اور پھر ان کا تقرر کیا گیا تھا، مثلاً ابوالحسن علی بن فرات اور علی بن عیسیٰ،

مقتدر نے بعض نااہل وزراء پر بے حد اعتماد کر لیا تھا، حکومت کا نظام اس کی وجہ سے درہم برہم ہو گیا تھا، ان نااہل وزراء میں ابوعلی بن مقلہ کی شخصیت نمایاں تھی۔ خلیفہ کے حد سے زیادہ

---

[1] ابن اثیر ج ۸ ص ۲۶ و تحفۃ الامراء فی تاریخ الوزراء ص ۲۸۶۔ [2] الفخری ص ۲۴۲۔

اعتماد کی وجہ سے اس کا اثر و نفوذ بہت بڑھ گیا۔ اور اس نے ریاست کی آمدنی پر نہایت بے دردی سے ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ مقتدر نے اسے دوبارہ ۳۱۶ھ میں وزیر اعظم مقرر کیا۔ اور خلعت سے سرفراز فرمایا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ معزول کر دیا گیا، خلیفہ راضی کے عہد تک اس کی زندگی کا نشیب و فراز یہی رہا کبھی معزول ہوا، کبھی تقرر ہوا، خلیفہ راضی نے اسے وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر مامور کیا۔ مگر تھوڑی مدت کے بعد دایاں ہاتھ کاٹ کر جیل میں ڈال دیا گیا۔ اور ایک مدت تک اسی میں سڑتا رہا تھا۔[1]

ضعف وزارت ابن مقلہ کے بعد کوئی قابل ذکر شخصیت اس عہدہ پر مامور نہیں ہوئی تھی، ابن مقلہ کے بعد نہایت نااہل وزرا اس منصب پر فائز ہوئے تھے، اس کی وجہ سے نظام سلطنت میں اور ابتری پیدا ہو گئی تھی، مابعد کے قابل ذکر وزرا میں ایک ابوالقاسم عبیداللہ بن محمد کلوذانی ہے، جس کے خلاف فوج نے بغاوت کر دی تھی، اور اسے دو ماہ کے بعد ہی قلمدان وزارت سے دست بردار ہونا پڑا تھا، دوسرا حسین بن قاسم تھا، یہ نہایت بد طینت اور کمزور پالیسی کا انسان تھا، حکومت کے نظم و نسق کو سنبھال لینا اس کے امکان سے خارج ثابت ہوا اس لیے اسے معزول کر دیا گیا۔[2]

عباسیہ کے عہد زوال میں امرا کے اندر وزارت عظمیٰ کے لیے حریفانہ کشمکش شروع ہو گئی تھی، ہر حریف کے ایجنٹ اور ہوا خواہ ہوتے تھے، جو اس کی حمایت میں پروپیگنڈا کرتے تھے، کامیاب حریف ان لوگوں کی "خدمات جلیلہ" کی قدر کرتا تھا، اور انہیں بڑے بڑے عہدوں پر مامور کر دیتا تھا، جب یہ وزیر بدقسمتی سے معزول کر دیا جاتا تھا تو اس کے یہ حامی بھی منتشر کر دیے جاتے تھے۔[3]

---

[1] الفخری ص ۳۴۵ [2] تفصیل دیکھو الآداب السلطانیہ ص ۳۴۷ اور اس کی شرح ص ۳۴۷ [3] Hazaral Bawke, P. 27.

اس دور کے وزراء خوشامد میں "خلیفہ، قصر کی عورتوں، خادموں اور منہ چڑھے ملازمین کے سامنے دولت کے انبار لگاتے رہتے تھے، یہ دولت رعایا پر طرح طرح کے ٹیکس لگا کر فراہم کی جاتی تھی، وزیر اعظم کے ایجنٹوں اور پٹھوؤں نے اس سلسلہ میں قیامت اُٹھا رکھی تھی۔

خلیفہ راضی نے وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر کمزور پالیسی کے وزراء کو مامور کیا تھا، یہ وزراء خوشامد میں خلیفہ کی ذات پر بے شمار مال و دولت صرف کرتے تھے، راضی کے عہد خلافت میں جب ابن مقلہ تیسری دفعہ وزیر اعظم مقرر ہوا تھا تو اس نے خلیفہ کی خدمت میں پانچ لاکھ دینار و ۲۵ لاکھ روپیہ نذرانہ کے طور پر پیش کیے تھے، مگر دو ماہ بھی نہ گذرے تھے کہ فوج نے اس کے خلاف بغاوت کر دی اور خلیفہ اسے معزول کرنے پر مجبور ہوا۔

ابن مقلہ کے بعد عبدالرحمٰن بن عیسیٰ اس عہدہ پر مامور ہوا یہ بھی نااہلی کی وجہ سے معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ اس کا بھائی مقرر کر دیا گیا اس کے عہد وزارت میں سلطنت کی حالت اور بھی ردی ہوگئی اور اسے اپنے منصب سے سبکدوش ہونا پڑا۔ اس کا جانشین ابوجعفر بن محمد بن قاسم کرخی ہوا، یہ بھی اپنے پیشرو نالائق وزراء کا صحیح جانشین تھا، اس نے نظام سلطنت کو سدھارنے کے لیے کسی قسم کا عملی قدم نہیں اُٹھایا، اس کے زمانہ میں سلطنت کا نظم ونسق حد سے زیادہ ابتر ہوگیا، یہ نہایت ٹھگنا اور کوتاہ قامت انسان تھا، سریر خلافت کے پائے چار انگشت اس غرض سے کاٹ دیے تھے کہ خلیفہ دربار میں اس سے وقت ضرورت مشورہ کر سکے، اس وقت لوگوں نے کہا تھا" یہ سلطنت کی تباہی کا شگون ہے" مستقبل نے ثابت کر دیا کہ لوگوں کا یہ خیال غلط نہ تھا، رائے عامہ نے اس کی بدعنوانیوں کے خلاف بغاوت کر دی تھی اور وہ جان بچا کر بھاگ گیا تھا۔[1]

کرخی کے بعد قلمدان وزارت سلیمان بن حسن کے سپرد کیا گیا، یہ وہ وقت تھا

---

[1] الفخری ص ۲۵۲ - ۳۵۳

جب حکومت کے نظم ونسق میں بڑے بڑے جنرلوں کا اثر و اقتدار بہت بڑھ گیا تھا، اس کی وجہ سے باوجود قابلیت کے حکومت کے نظام کو اعتدال پر لانا اس کے امکان سے خارج ثابت ہوا اور خلیفہ نے مجبور ہو کر ابن رائق گورنر واسط و بصرہ کے ہاتھ میں حکومت کا نظم ونسق دیدیا اور امیر الامراء کا اسے لقب دیا۔ ابن رائق کا اثر و اقتدار نہایت سرعت سے بڑھ گیا اور وزیر اعظم کی حیثیت ایک ماتحت کی ہوگئی، گورنروں کا عزل ونصب اب امیر الامراء کے اختیار میں تھا، اور حکومت کی تمام مشینری اسی کے اشارہ پر گردش کرتی تھی اور وزارت عظمی کا عہدہ ایک مہمل اور بے معنی سا لفظ رہ گیا تھا۔[1]

ابن مسکویہ کے الفاظ میں امیر الامراء کے بعد وزارت کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا تھا اسے دار السلطنت، محکموں اور صوبوں کے نظم ونسق میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہ تھا، اس کا کام صرف یہ رہ گیا تھا کہ جشن اور تقریب کے موقع پر سیاہ لباس اور پٹکا اور تلوار لٹکا کر دربار میں حاضر ہو جائے اور ادب و احترام کے ساتھ خاموش کھڑا رہے اور بس، ابن رائق اور اس کا فارن سکرٹری حکومت کے سیاہ و سفید کے مالک تھے، مالیات پر ان کا تصرف تھا، حکومت کی آمدنی حسب منشا صرف میں لاتا تھا اور شرعی نظام مالیات کا خاتمہ ہو گیا تھا سلطان کی ذاتی دلچسپیوں کے لیئے ضرور ایک بڑی رقم خاص کر دی جاتی تھی۔[2]

راضی کے عہد خلافت میں وزارت عظمی کی جگہ امیر الامراء نے لے لی تھی، اس کے اختیارات میں وزراء کا عزل ونصب ہوتا تھا، ابن رائق نے امیر الامراء کے منصب پر فائز ہونے کے بعد خلیفہ کی منظوری سے فضل بن جعفر بن فرات کو وزارت عظمی کے عہدہ پر مامور کیا تھا، اس زمانہ میں مالیات پر پورا اختیار ابن فرات کو دیدیا تھا اور حکومت کے دوسرے محکمے اپنے قبضہ میں رہنے دیئے تھے، یہ اس کی پالیسی تھی، بدنامی کے ڈر سے وہ براہ راست مال و دولت سمیٹنے سے بچنا چاہتا تھا، ان دونوں کی ملی بھگت کا نتیجہ تھا کہ مملکت کی دولت

---

[1] الفخری ص ۳۵۳ [2] ابن مسکویہ ج ص ۳۵۲

سے ان کے گھر پٹ گئے تھے[1]، امیر الامراؤں کا یہ جبر و استبداد اور خود سرانہ اقتدار ایک عرصہ تک قائم رہا، حکومت کی مشینری پر یہ عجمی امیر الامرا پوری طرح پر حاوی تھے لیکن سیاسی مصلحت سے ان خود سروں نے خلافت اور وزارت کے القاب اختیار کرنے سے اجتناب کیا تھا لیکن انہیں اپنا آلہ کار بنا رکھا تھا اور ان کے نام سے اپنا اُلو سیدھا کیا کرتے تھے، وہ جانتے تھے خلافت اور وزارت عظمیٰ کا عوام پر کتنا اثر ہے، یہ دور خلافتِ عباسیہ کے آخر عہد تک قائم رہا تھا، اس دوران میں زبان بگڑ گئی تھی اور بعض مشہور صناع اور صنعتیں ختم ہو گئی تھیں، ان عجمی حکام کو عربی زبان و ادب کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت کیا تھی اور صنعت و حرفت کی طرف توجہ کرنے کے لئے سیاسی اغراض نے اجازت نہ دی تھی۔

اندلس کے اموی فرماں رواؤں نے ابتدا میں وزارت کے قیام کی ضرورت نہیں سمجھی، لیکن آخر میں یہ شعبہ قائم کر دیا تھا اور اسے چند شعبوں میں تقسیم کر کے ہر شعبہ ایک وزیر کے سپرد کر دیا تھا، وزارت کا یہ شعبہ مالیات، رسل و رسائل، قانون و انصاف اور امور خارجہ میں منقسم تھا، اور ہر شعبہ ایک ایک وزیر کی نگرانی میں دیدیا گیا تھا، ان وزرا کا ایک قصر میں اجتماع ہوتا تھا جہاں سے وہ سلطان کے احکام نافذ کرتے تھے، یہ وزیر اپنا ایک لیڈر منتخب کر لیا کرتے تھے، جو سلطان کے پاس آمد و رفت رکھتا تھا اور ان کے اور سلطان کے درمیان واسطہ کا کام دیتا تھا، اس کی نشست گاہ دوسرے وزرا سے کچھ ممتاز اور اونچی ہوتی تھی اسے حاجب کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، اندلس میں آخر دم تک وزارت کا یہی نظام قائم رہا تھا[2]۔

1۔ تاریخ الخلفاء (سیوطی) ص ۲۶۰ 2۔ مقدمہ ابن خلدون۔ ص ۲۰۸

وزارت سلاجقہ کے دور اقتدار میں

خلافت عباسیہ پر سلجوقیوں کے غلبہ اور ان کے عہدِ عروج (۴۴۷ھ-۵۵۱ھ) کے وقت عراق فتنہ وفساد اور حوادثات سے معمور تھا اس دور میں باطنیوں کی فتنہ پردازی آخری نقطۂ کمال پر پہونچ گئی تھی اور ان شرارت کے مجسّموں نے خلفاء اور ممتاز ارکانِ دولت کو بھی موت کے گھاٹ اُتارنا شروع کر دیا تھا، بایں ہمہ یہ دور چند لحاظ سے ممتاز ہے، اس عہد میں ممتاز وزراء منصۂ شہود میں آئے تھے، ان میں قابل ذکر ابو شجاع کی شخصیت ہے، جو خلیفہ مقتدی (۴۶۷ تا ۴۸۷ھ) کے عہد خلافت میں وزارتِ عظمیٰ کے منصب پہ مامور تھا یہ وزیر نہایت عادل اور منصف تھا، اس کا معمول تھا کہ نماز ظہر کے بعد عدالت کا اجلاس کرتا تھا اور منادی کرا دیتا تھا "جس کسی کو کوئی شکایت ہو وہ آ کر پیش کرے"[1] یہ وزیر نرم خو، بردبار، اور اغماض کرنے والا تھا، شیعہ وسنی میں جب محلہ کرخ اور بغداد کے "باب البصرۃ" میں جھگڑا ہو گیا اس وقت اس نے انتہائی تحمل سے کام لیا تھا۔ اور باوجود اُکسانے کے اس نے خوں ریزی سے احتراز کیا تھا، خلیفہ مقتدی نے یہ صورتِ حالات دیکھکر کہا تھا "ایسے وقت میں اس قسم کی نرمی کام نہیں دیتی ہے، تمہاری رواداری اور چشم پوشی نے بلوائیوں کا حوصلہ بڑھا دیا ہے۔ اس وقت مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ محلوں کے دس ممتاز اور بڑے آدمیوں کے گھر منہدم کر دیے جائیں، اس طرح یہ فتنہ وفساد فرو ہو سکے گا۔

---

[1] الفخری ص ۲۶۴

وزیر نے کوتوال شہر کو بلایا اور کہا" خلیفہ نے دس ممتاز اہل محلہ کے گھروں کو تباہ کر دینے کا حکم دیا ہے، میں اس وقت بڑی کشمکش میں مبتلا ہوں، ایک طرف تو مجھے خدا کا خوف ہے کہ بے قصوروں کے گھر تباہ ہو جائیں گے، دوسری طرف خلیفہ کے عتاب کا اندیشہ ہے، اس کشمکش سے نجات کی میرے ذہن میں یہ تدبیر آئی ہے کہ ان سربرآوردہ لوگوں کے مکانات اور ان کے ساز و سامان کی قیمت کا تخمینہ لگا کر میری طرف سے نقد رقم ادا کر دو پھر ان عمارتوں کو منہدم کرا دو، اس واقعہ سے اس کی فطرت کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ابوشجاع نے اپنے عہدِ وزارت میں حج کیا تھا، اس سے قبل برامکہ کو چھوڑ کر عہدِ عباسیہ کے کسی وزیر نے اپنے وزارت کے زمانہ میں حج نہیں کیا تھا، وزارت سے معزول ہونے کے بعد ضرور یہ فرض یاد آتا تھا، آخر میں یہ وزارت سے خود مستعفی ہو کر گوشہ نشین ہو گیا تھا، اس زمانہ میں سوتی کپڑے پہنتا تھا، دوسری دفعہ جب حج کو گیا تو مدینہ منورہ میں قیام گزیں ہو گیا اور زندگی کے معمولات میں مسجد نبوی میں جھاڑو دینا اور چراغ جلانا خاص طور سے داخل تھا، یہاں یہ ہمیشہ موٹے دبیز کپڑے پہنتا تھا اور فرش پر بیٹھتا تھا[1]

اس عہد کے وزراء میں ابوعلی حسن بن علی بھی نمایاں شخصیت رکھتا ہے، مسترشد باللہ (۵۱۲ھ ۔ ۵۲۹ھ) نے اسے ۵۱۳ھ میں وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر مامور کیا تھا، یہ ریاست کے نظم و نسق کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا تھا، مسترشد نے اسے جلال الدین سید الوزراء، صدر الشرق و الغرب اور ظہیر امیر المؤمنین کے خطابات دیئے تھے[2]

سلطان سلجوقی کے وزیر کو ابوعلی حسن کی غیر معمولی قابلیت نے اس کا حاسد بنا دیا تھا اس بغض و حسد نے بہت جلد شدید اختلافات کی شکل اختیار کر لی اور سلطان سلجوقی کے وزیر نے خلیفہ کو بھڑکا کر ابوعلی کو معزول کرا دیا کچھ عرصہ کے بعد مسترشد کو جب اپنی کوتاہ فہمی کا علم ہوا تو اس نے دوبارہ اسے اس منصب پر مامور کر دیا اور خلعت سے نوازا اور ارکانِ دولت کو

---

[1] الفخری ص ۲۶۵ [2] شرح الفخری ص ۲۶۹ - ۲۷۰

حکم تھا کہ جب وہ دیوانِ وزارت کو روانہ ہو تو احترام میں اُس کے آگے آگے چلیں، یہ پہلا وزیر اعظم تھا جسے یہ اعزاز بخشا گیا تھا[1] اس کی شجاعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب سلطان سنجر نے بغداد پہونچنے اور خلیفہ مسترشد کے خلاف ہنگامہ بپا کرنے کا قصد کیا تھا تو اس نے کہلا بھیجا تھا" اگر تم نے اپنی جگہ سے ایک انچ بھی حرکت کی تو یاد رکھنا اپنی مملکت کے ایک ایک چپہ سے ہاتھ دھو بیٹھو گے اگر تم ایک فرسنگ بڑھو گے تو میں دو فرسنگ پیش قدمی کروں گا"۔ ایک دفعہ جب ابو علی حسن بیمار ہو گیا تو خلیفہ اس کی عیادت کو آیا، اسے اس نے بہت بڑی عزت افزائی سے تعبیر کیا۔

مسترشد باللہ کے وزراء میں شریف ابو القاسم زینبی بھی داخل تھا، یہ وزارت عظمیٰ کے آئین و اصول میں مہارتِ تامہ رکھتا تھا، مسترشد نے اسے قلمدان وزارت سونپتے وقت اس کی قابلیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا" آج تمہارے وجود سے منصب وزارت عظمیٰ کی عزت افزائی ہوئی ہے" اس سے قبل برعکس حالت تھی" مسترشد نے ارکانِ دولت کو حکم دیا کہ دیوانِ وزارت تک زینبی کے احترام میں آگے آگے چلیں۔[2]

اس دور کے وزراء میں ابن ہُبیرہ بھی نمایاں حیثیت رکھتا ہے یہ خلیفہ مقتفی (۵۳۰ھ - ۵۵۵ھ) کے زمانہ میں وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر فائز تھا، سلجوقیوں کا زور توڑنے میں اس وزیر اعظم کا بہت بڑا دخل تھا، اس نے ہدایت کر دی تھی کہ میرے نام کے ساتھ وزیر کے ماسوا اور کسی دوسرے لقب کا اضافہ نہ کیا جائے۔ اس سے قبل وزراء کے بہت سے القاب ہوتے تھے وہ کہتا تھا خدا نے" ہارون کو" وزیر" کے لقب سے خطاب کیا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کو وزیر کے خطاب سے یاد فرمایا تھا، میرے لیے سب سے بڑی عزت اس میں ہے

---

[1] الفخری ص ۲۷۰ [2] ایضاً ص ۲۷۱

کہ مجھے اسی لفظ سے خطاب کیا جائے۔

ابن ہبیرہ بلند پایہ فاضل، زبردست سیاست داں اور اولوالعزم وزیر اعظم تھا تدبیر مملکت اور حکومت کے نظم ونسق میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا یہ اپنے زمانہ کا ممتاز اہل قلم اور شاعر بھی تھا[1]

اس عصر کے عباسی وزرا میں ابونصر احمد بھی ممتاز درجہ رکھتا ہے، یہ ملک شاہ سلجوقی کے مشہور وزیر اعظم نظام الملک کا بیٹا تھا، اس نے اپنے زمانہ میں جبر و استبداد کا خاتمہ کر دیا تھا، مسترشد باللہ نے ایک دفعہ بغداد کی شہر پناہ تعمیر کرنے کے لیے شہریوں پر اجتماعی طور پر پندرہ ہزار دینار۔ ۷۵ لاکھ روپیہ کی رقم واجب کی تھی، ابونصر نے یہ رقم ان سے لینا گوارا نہ کیا اور اپنی ذاتی دولت سے ادا کر دی[2]

دورِ عباسیہ کے آخری دور کے وزرا میں ایک نمایاں ہستی انوشروان خالد بن محمد قاشانی کی ہے، یہ مسترشد کے زمانہ میں وزارت عظمیٰ کے منصب پر متمکن تھا، انوشرواں نے عباسیوں اور سلجوقیوں دونوں کے ہاں وزارت عظمیٰ کے فرائض انجام دیے تھے، وزارت کے قبول کرنے سے یہ ہمیشہ پہلو بچاتا تھا، انکسار و تواضع کا یہ حال تھا کہ ہر آنے والے کے احترام میں اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ حریری نے ایک مستقل "مقامہ" میں اس کے اوصاف کا تذکرہ کیا ہے۔

وزارت مصر میں

مصر میں وزارت کے نظام کی ابتدا، اخشیدیوں کے عہد سے ہوئی ہے۔ سب سے پہلے احمد بن طولون نے احمد بن محمد واسطی کو اپنا کاتب یا پرائیویٹ سکرٹری مقرر کیا تھا اور حکومت کے نظم و ضبط میں اس سے مشورہ لے لیا کرتا تھا، ۲۶۴ھ میں جب احمد بن طولون چند روز کے لیے شام گیا تو اس نے اپنے بیٹے عباس کو اپنی جگہ مصر کا حاکم اور ابن محمد واسطی کو اس کا مشیر کار مقرر کر دیا، یہ کاتب ایک وزیر اعظم کے فرائض

[1] الفخری ص ۲۷۹-۲۷۸ [2] ایضاً ص ۲۷۲

انجام دیتا تھا، دوسرے الفاظ میں وہ ان تمام اختیارات کا حامل تھا جو ایک وزارت عظمیٰ کے منصب سے وابستہ ہوتے تھے۔

وزارت عہد فاطمیہ میں

فاطمیوں کے مصر پر تسلط کے وقت ابوالفضل جعفر بن فرات وزارت عظمیٰ کے منصب پر مامور تھا ابوالفضل جعفر عباسیوں اور اخشیدیوں دونوں کے دور حکومت میں اس عہدہ پر فائز رہا یہ نہایت کٹر سنی تھا، خلیفہ فاطمی معز الدین نے رسماً اسے ہٹانا مصلحت وقت کے خلاف سمجھا لیکن اندرونی طور پر اس کے تمام اختیارات سلب کر لیے اور وہ صرف نام کا وزیر اعظم رہ گیا تھا، سبکدوش کرنا اپنی سیاست کاری کے خلاف سمجھتا تھا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے رائے عامہ کے مشتعل ہونے کا اندیشہ تھا[1] خلیفہ کا نفس ناطقہ، فاتح مصر جوہر صقلی ابوالفضل کو لفظ وزیر سے خطاب کرنا بھی اپنی کسر شان سمجھتا تھا، جوہر نے ایک خادم اس کی نقل و حرکت کی نگرانی کے لیے متعین کر دیا تھا یہ شبانہ روز ہمزاد کی طرح اس کے ساتھ لگا رہتا تھا، اور اس کی حرکات و سکنات پر نظر رکھتا تھا۔[2] ان حرکتوں نے وزیر کے اثر و اقتدار کا قریباً خاتمہ کر دیا تھا یاقوت کا بیان ہے" خلیفہ معز الدین کے مصر آنے کے بعد ابن فرات نے اس منصب سے استعفا دے دیا تھا۔[3]

ایک واقعہ اور پیش آیا تھا جس نے خلیفہ فاطمی کو ابوالفضل جعفر سے اور بدظن کر دیا تھا، وہ یہ تھا کہ جب خلیفہ معز الدین اسکندریہ کے قریب پہونچا تو اس نے اسکندریہ میں اس کا استقبال کرنے سے انکار کر دیا تھا اس وقت چند ممتاز سنی اشخاص اس کے پاس حاضر ہوئے اور نشیب و فراز سمجھاتے ہوئے کہا" آپ کا یہ رویہ مستقبل میں سنیوں کے لیے مضر ثابت ہوگا اور شیعی حکومت کے جبر و استبداد کے لیے یہ بہانہ کافی ہوگا، ان کے کہنے سے وہ استقبال کے لیے نکلا تھا اگرچہ اس کا دل نہ چاہتا تھا،

معز الدین اس واقعہ سے بے خبر نہ تھا ملاقات کے وقت اس نے جعفر سے

[1] اتعاظ الحنفاء (مقریزی) ص ۷۰ [2] ابن خلکان ج ۱ ص ۱۱۹ [3] اتعاظ الحنفاء ص ۸۵ [4] الادیب ج ۲ ص ۴۱۲

دریافت کیا "کیا تم نے حج کیا ہے"؟ جعفر نے اثبات میں جواب دیا، شیخین (حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ) کی قبر کی زیارت بھی کی ہے؟ جعفر شیعی خلیفہ کے اس سوال کا مقصد اپنی غیر معمولی فراست سے سمجھ گیا اور برجستہ جواب دیا" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیخودانہ محبت نے اس طرف متوجہ ہی نہ ہونے دیا جس طرح امیر المؤمنین سے گفتگو میں اتنا منہمک ہوا کہ ولی عہد کو سلام کرنے کا بھی ہوش نہ رہا، السلام علیکم یا ولی عہد المسلمین ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"

معزالدین نے یعقوب بن کلس اور علوج بن حسن کو جنگی اور مدنی امور میں اپنا مشیر مقرر کیا اور ۱۴ محرم ۳۶۳ھ سے دیوان خراج (احتساب) ساحلوں کے نظم و نسق کا محکمہ، اوقاف، انتظام میراث اور پولیس[1] کا صیغہ ان دونوں کے سپرد کر دیا، ابن کلس نے اپنا معتمد علیہ ابن فرات کو بنا لیا اور خراج کے افسروں کا محاسبہ اس کے سپرد کر دیا، ان دونوں میں اتنے گہرے تعلقات تھے کہ ابن فرات کھانا بھی ابن کلس کے ساتھ کھاتا تھا، یہ تعلقات اس وقت سے اور بھی مستحکم ہو گئے تھے جب سے ابن فرات کے لڑکے کی شادی ابن کلس کی لڑکی سے ہو گئی تھی،

ابن فرات خلیفہ عزیز باللہ (۳۶۵ھ ۳۸۶ھ) کے عہد میں وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر مامور ہوا اور صرف ایک سال فائز رہا۔[2] ۳۸۲ھ میں جب خلیفہ عزیز نے اپنے وزیر ابوالحسین بن علی بن عمر عداس کو مال کی خورد برد اور خیانت کے جرم میں معزول کیا تو اس کی جگہ ابن فرات کو خراج کا افسر مقرر کر دیا گیا ربیع الاول ۳۸۳ھ میں دوبارہ اسے قلمدان وزارت سپرد کیا گیا اور وہ ایک سال تک اپنے فرائض انجام دیتا رہا، ۳۹۱ھ میں یہ زبردست شخصیت دنیا سے اٹھ گئی۔[3] ابن فرات کا یہ امتیازی وصف تھا کہ وہ عباسیہ، اخشیدیہ، اور فاطمیہ تینوں کے دور حکومت میں وزارت کے عہدہ پر مامور رہا تھا۔

یعقوب بن کلس فاطمیوں کے دورِ عروج میں وزارت کی نوعیت دورِ عباسیہ کی "وزارت تنفیذ" کی تھی، اس جگہ اس دور کے سب سے ممتاز وزیر کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے یہ یعقوب بن کلس

[1] ابن خلکان ج ۲ ص ۴۴۰ [2] المقریزی الخطط ج ۲ ص ۴۸ [3] ابن خلکان ج ۲ ص ۱۳۹

کی شخصیت تھی۔

یعقوب بن کلس یہودی تھا بغداد میں پیدا ہوا وہیں نشو و نما ہوئی، سن رشد میں باپ کے ساتھ شام چلا آیا اور وہاں سے ۳۳۱ھ میں مصر وارد ہوا یہ اخشید مؤسس دولت اخشیدیہ کا عہد حکومت تھا، اخشید کی وفات کے بعد یعقوب بن کلس کے کافور اخشیدی سے مراسم ہو گئے، کافور نے اسے اپنے محل کی تعمیر کا نگراں ۔۔ مقرر کر دیا اور پھر اس کی نجابت اور فطرت کی پاکیزگی دیکھ کر اپنے دیوان خاص میں اس کا تقرر کر دیا اس پر غیر معمولی اعتماد کی بناء پر محکموں کے افسروں کے نام حکم جاری کر دیا گیا کہ خزانہ سے ایک پیسہ بھی بغیر ابن کلس کے دستخط کے نہیں لیا جا سکتا ہے۔ دولت اخشیدیہ کے آخری عہد میں اس نے اپنا اسلام ظاہر کر دیا تھا اور جامع مسجد میں نماز ادا کرنے لگا تھا، کافور کے دل میں اس کی وجہ سے اس کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی تھی، اس کے بعد ابن کلس کا معمول تھا کہ نماز و تلاوت میں مصروف رہتا، ایک متبحر عالم قرآن کی تفسیر پڑھاتا اور تجوید کی تعلیم دیتا یہ شبانہ روز اس کا ہم جلیس رہتا اس کے ساتھ نماز پڑھتا اس کے ساتھ کھانا کھاتا اور اس کے ہاں سوتا تھا، کافور اپنی وفات تک (۳۵۷ھ) برابر اسے عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا رہا۔ کافور کی موت کے بعد بلاد مغرب چلا گیا، جہاں خلیفہ معز الدین کی خدمت میں باریاب ہوا ۳۶۲ھ میں مصر اس کے ساتھ دوبارہ واپس آیا، محرم ۳۶۳ھ میں معز الدین نے اسے اور علوج بن حسن کو جنگی اور مدنی معاملات کا انچارج مقرر کیا تھا۔

ابن کلس کا معمول تھا کہ اپنے قصر میں ہر ہفتہ اور پنجشنبہ کے روز ایک بہت بڑی مجلس منعقد کرتا تھا جس میں اس کی تالیفات سنائی جاتی تھیں، اس مجلس میں قضاۃ، فقہاء، اساتذۂ قرأت و تجوید، محدثین، شعراء اور ممتاز ارکانِ دولت کا اجتماع ہوتا تھا، قصر میں نجی ملازمین کی ایک بہت بڑی تعداد قرآن کے نسخوں اور حدیث، فقہ، ادب اور دوسرے علوم و فنون کی کتابوں کی نقلیں کرنے پر مامور تھی، قصر میں ایک کشادہ مہمان خانہ تھا جس میں حمام اور دوسری ضروریات کا انتظام تھا، ابن کلس نماز مغرب کے بعد ہر روز یہاں کرسیِ عدالت پر جلوہ فرما ہوتا تھا اور شہریوں کی

شکایات اور ضروریات کے بارے میں مناسب کارروائیاں کرتا تھا، محل میں محکمۂ فوج، شعبۂ مالیات، دیوانی خراج اور رکارڈ آفس اور دوسرے صیغے قائم تھے، ہر شعبہ میں اس صیغہ کے ماہر افراد کی ایک معقول تعداد کام کرتی تھی، علمار شعرار ادبار فقہار اور متکلمین اور ماہرین فن کی بڑی بڑی تنخواہیں مقرر تھیں اور باقاعدہ ملتی تھیں، یہ اربابِ فن اسی محل کے ایک مخصوص حصّہ میں سکونِ قلب کے ساتھ علمی کاموں میں منہمک رہتے تھے، رفاہِ عام کے لیئے ایک شفاخانہ بھی قائم تھا جس میں صدہا حاذق اطبار ملازم تھے جو مریضوں کا مفت علاج معالجہ کرتے تھے۔

ابن کلس کی مدح وستائش میں بہت سے شعرار کے صدہا قصائد اس دور کی تاریخ میں موجود ہیں اور اس قدر منزلت کے آئینہ دار ہیں جو عام طور پر لوگوں کے دلوں میں پائی جاتی تھی۔

ابن کلس نے خلیفہ عزیز کو مشورہ دیا تھا کہ جامع ازہر کو دعوت شیعہ کے مرکز کی بجائے ایک یونیورسٹی کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے، جہاں علوم عقلیہ اور نقلیہ کی تعلیم دی جائے، خلیفہ نے اسے شرفِ قبول بخشا تھا اور اس "جامعہ" کی وائس چانسلری کے فرائض ابن کلس کے سپرد کیے تھے یہ ۳۷۸ھ کے آخر کا واقعہ ہے۔

وزارت عہد حاکم اور مستنصر میں

حاکم (۳۸۶ھ تا ۴۱۱ھ) کے ابتدائی دور میں عیسیٰ بن نسطورس وزارت کے منصب سے معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ حسین بن عمار کا تقرر عمل میں آیا اس عصر میں وزارت، وساطت کے نام سے موسوم تھی، ابن عمار قبیلہ کتامیہ کا ایک لیڈر تھا جو خانوادۂ فاطمیہ کی ایک شاخ تھا اور مصر میں ان کی سب سے بڑی پشت پناہ تھا، ابن عمار کے بعد خلیفہ حاکم کا استاد اور مشیر کار برجوان اس منصب پر مامور ہوا جو ۲۰ ربیع الثانی ۳۹۰ھ میں قتل کر دیا گیا تھا[1]۔

اس عظمت وجلال کے باوجود جو اس زمانہ میں وزرار کو حاصل تھی ان کے اختیارات محدود تھے اور ان کا عزل ونصب خلیفہ کی خوشی وناخوشی پر موقوف تھا مگر یہ حالت فاطمیہ کے

---

[1] دیکھو:- الاشارة الی من نال الوزارة (ابن منجب) ص ۲۷

دور آخر (۴۶۵ھ ۔ ۴۶۷ھ ۔ ۱۰۹۳ء ۔ ۱۱۷۱ء) میں قائم نہیں رہی تھی، اس عہد میں وزارت کا اقتدار عہدِ عباسیہ کی وزارت عظمیٰ کے اقتدار سے کسی طرح کم نہ تھا۔

خلیفہ مستنصر (۴۲۷ھ ۔ ۴۸۷ھ) کے دور میں وزراء کا اثر و اقتدار عہدِ ہارون کے وزراء یحییٰ اور جعفر برمکی کے برابر تھا، وزیر قریبًا آمر مطلق ہوتا تھا اور خلیفہ کی ہستی اس کے مقابلہ میں فروتر تھی مستنصر کے عہد میں نہایت شدید قحط پڑا تھا جو مسلسل سات برس (۴۵۷ھ ۔ ۴۶۵ھ) تک مسلط رہا تھا اس نازک وقت میں قریبًا چالیس وزارتیں یکے بعد دیگرے بدلی تھیں ان روز کی وزارتوں نے مملکت کی بدبختی میں جو اضافہ کیا ہوگا اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں آخر میں بدر جمالی گورنر عکار اس عہدہ پر مامور ہوا جس کا "پیرہن وزارت" خلافت کے اقتدار کے لئے "کفن" ثابت ہوا اس وقت سے وزارت کا اثر و اقتدار بہت بڑھ گیا، اور خلیفہ کی شخصیت کا خاتمہ ہوگیا، خلیفہ کا عزل و نصب تک وزیر کے اختیار میں تھا، وزیر اعظم نہایت کمزور ارادہ کا خلیفہ منتخب کرتا تھا جو وزیر اعظم کے ہاتھوں میں کٹ پتلی رہتا تھا، افضل بن بدر جمالی اس عہد کا سب سے ممتاز اور آمر مطلق وزیر اعظم گذرا ہے فوج، مالیات اور حکومت کے دوسرے اہم شعبوں پر اس کی آمرانہ فرماں روائی تھی، اس کا قصر حکومت کے نظم و نسق کا محور تھا بے محل نہ ہوگا اگر ہم اس ممتاز شخصیت کا ایک اجمالی تذکرہ کر دیں۔

افضل بن بدر جمالی خلفائے فاطمیہ نے جب سے ترکوں، سوڈانیوں، اور آرمینوں اور صقالیوں کو حکومت کے نظم و نسق میں دخیل کر لیا تھا، اس وقت سے ان طبقوں میں باہمی رقیبانہ کشمکش پیدا ہوگئی تھی اور ایک خوفناک داخلی فتنہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا، خلیفہ مستنصر باللہ فاطمی کے عہد میں ان "رقابتوں" نے نازک صورت اختیار کر لی تھی اس وقت خوش قسمتی سے بدر جمالی گورنر عکا نے فاطمیوں کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو ایک ہوشیار امیر البحر کی طرح اس بھنور سے بچا لیا تھا، بدر جمالی ۴۶۵ھ میں وزیر اعظم ہوا اور تادم آخر اس عہدہ پر مامور رہا، خلیفہ مستنصر کے آخری زمانہ میں اس نے وفات پائی تھی، اس کی جگہ اس کا بیٹا شاہنشاہ افضل وزیر اعظم ہوا جو نہایت سرعت سے حکومت

کی مشنری پر چھا گیا اور خلیفہ کی حیثیت اس کے مقابلہ میں ایک عضو معطل سے زیادہ نہ رہی، وزیر اعظم کا سیف وقلم (فوج اور نظم ونسق) پر آمرانہ اقتدار تھا اس زمانہ میں وزیر اعظم کی اقتصادی خوش حالی میں بھی غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا۔

مستنصر کی وفات کے بعد افضل بن بدر جمالی سیاہ وسفید کا مالک تھا، اس وقت اس نے ولی عہد خلافت نزار کو معزول کر دیا اور اس کی جگہ اس کے بھائی مستعلی کو تخت خلافت پر بٹھا دیا، عرب مورخین کا بیان ہے کہ یہ اس کینہ کا عملی اظہار تھا جو نزار کی طرف سے اس کے دل میں مدت سے بیٹھا ہوا تھا، واقعہ یہ تھا کہ ایک دفعہ افضل قصر مستنصر کے دروازہ کے اندر خچر پر سوار ہو کر داخل ہو گیا، نزار کو یہ جسارت ناگوار گذری اور اس نے نہایت حقارت سے اس سے کہا: "او ارمنی! نجس کہیں کے اُترا"، افضل اُس وقت تو مصلحت وقت سے خاموش ہو گیا مگر اُس کے دل میں کینہ بیٹھ گیا، مستنصر کی وفات کے بعد اسے انتقام کا موقع ملا اور اس نے اسے معزول کر کے مستعلی کو خلافت کے لیے منتخب کر لیا۔ نزار نے جب دیکھا کہ خلافت اس کے ہاتھوں سے جاتی رہی تو وہ اسکندریہ چلا گیا، وہاں کے گورنر نے اس کی بہت آؤ بھگت کی اور گورنر اسکندریہ اور اہل اسکندریہ نے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور "مصطفیٰ لدین اللہ" لقب دیا، افضل کو اس کی اطلاع ہوئی تو ایک زبردست فوج لے کر اسکندریہ پر چڑھائی کر دی ابتداء میں افضل کو کامیابی نہیں ہوئی اور اسے قاہرہ واپس لوٹنا پڑا، یہاں مزید طیاریاں کیں پھر دوبارہ نزار پر چڑھائی کر دی اس دفعہ نزار کو شکست ہوئی اور وہ "امان" کی درخواست کرنے پر مجبور ہوا افضل نے نزار کو دو دیواروں کے درمیان زندہ چنوا دیا یہ "امان" کی التجا کا جواب تھا۔

افضل علم دوست انسان تھا، مرنے کے بعد اس نے ایک کتب خانہ چھوڑا جس میں مختلف علوم وفنون کی پانچ لاکھ مجلد کتابیں موجود تھیں، یہ شعراء، علماء اور اہل قلم کا قدردان تھا اور دوسری بہت سی خوبیوں کا حامل تھا، اس کے پاس بے شمار دولت تھی (۵۰۱ھ = ۱۱۰۷ء) میں صرف کثیر سے ایک شاندار محل تعمیر کرایا اس کے لیے بیش قیمت فرنیچر اور

سامانِ آرائش کے علاوہ نہایت اعلیٰ قسم کے آلات اور نادر اشیاء کا ایک بہت بڑا ذخیرہ فراہم کیا تھا اس سے اس کی خوش مذاقی اور فنّی ذوق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، افضل نے حکومت کے دفاتر اپنے محل میں منتقل کرا لیے تھے، اس میں ہر شعبہ کے لیئے ایک وسیع کمرہ تھا، یہاں ایک کمرہ "مجلسِ عطا" کے نام سے موسوم تھا جس میں افضل بذاتِ خود بیٹھتا تھا اور اپنے ہاتھ سے ہر مصیبت زدہ اور مفلس شخص کو ایک ایک دینار عطا کرتا تھا، "مجلس عطا" میں اس مقصد کے لیئے آٹھ تھیلیاں روزانہ رکھی جاتی تھیں جن میں پینتیس ہزار دینار ہوتے تھے، دو تھیلیاں زنان خانہ میں رکھی رہتی تھیں، ایک میں دینار ہوتے تھے دوسری میں درہم، مقصد یہ تھا کہ کسی وقت عطا سے ہاتھ خالی نہ رہے۔

اس وقت افضل کی حیثیت آمرانہ تھی اس کے قبضہ میں خراج کا محکمہ تھا اسی کے قصر میں گورنمنٹ قائم تھی، تمام حکومت کا نظم و ضبط اسی کے زیر اقتدار تھا مستعلی کی حیثیت اس کے سامنے ایک بے دست و پا انسان کی تھی، حکومت کے نظم و نسق میں اس کا مطلق اثر نہ تھا، وزیر اعظم کی جنبشِ لب سے حکومت کی مشنری حرکت کرتی تھی، خلیفہ آمر (۴۹۵ھ ۔ ۵۲۴ھ) کے عہد تک اسی شان و شوکت کے ساتھ وہ ڈکٹیٹر رہا، آمر کے عہد میں اسے قتل کر دیا گیا یہ عید کی صبح کا واقعہ ہے، خلیفہ کے حکم سے اس کی دولت خزانۂ خلافت میں منتقل کر دی گئی۔ اس دولت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ منشیوں کی ایک بہت بڑی تعداد دو ماہ کی مسلسل محنت کے بعد اس کا گوشوارہ مرتب کر سکی تھی۔

افضل رعایا اور تاجروں کے ساتھ نہایت رواداری اور شرافت کا برتاؤ کرتا تھا، اس کے دروازہ سے کبھی کوئی محروم واپس نہ ہوا، وہ اپنے مخالفوں سے عموماً عالی ظرفی کا معاملہ کرتا تھا، اسکندریہ میں ایک یہودی اسے ہمیشہ سب و شتم کرتا تھا، افضل جب اسکندریہ گیا تو اس نے اسے گرفتار کر لیا، یہودی ڈر کر کہنے لگا "میرے پاس پانچ لاکھ درہم ہیں انہیں لے لیجئے اور مجھے چھوڑ دیجئے"، افضل نے جواب دیا "لوگ کہیں گے میں نے دینار کے لالچ میں تجھے قتل کر دیا

اس لیے چھوڑتا ہوں۔ ورنہ کبھی نہ چھوڑتا۔

افضل نے لاوارثی مال کے حفظ و اہتمام کے لیے ایک علیحدہ شعبہ قائم کیا تھا، جب کبھی کوئی وارث وراثت کا دعویٰ کرتا اور قاضی کو اطمینان ہوجاتا کہ واقعی یہ وارث ہے تو فوراً اسے ورثہ دیدیا جاتا تھا اس سے قبل اس مال کو خزانہ میں داخل کردیا جاتا تھا[۱]۔

خلیفہ عاضد فاطمی (۵۵۵ھ-۵۶۷ھ) کے آخری زمانہ میں افضل بن بدر جمالی کے قتل کے بعد اسدالدین شیرکوہ منصب وزارت پر مامور ہوا دو ماہ بعد موت نے اس کی جگہ خالی کردی اور اس کا بھتیجہ صلاح الدین یوسف بن ایوب وزارت پر فائز ہوا اس نے خلافت فاطمیہ کے بے روح لاشہ کو دفنا دیا تھا اور اس کی ہڈیوں پر دولت ایوبیہ کی تعمیر کی تھی۔

وزارت مملوکوں کے عہد میں

مملوکوں کے عہد میں سب سے پہلے سلطان بیبرس نے وزارت کی بنا رکھی اس نے اپنا ایک وزیر مقرر کیا جو امور حکومت میں اس کا مشیر کار تھا، یہ وزیر سلطان اور رعایا کے درمیان واسطہ تھا اس کا فرض سلطان کے احکامات کو عمل میں لانا اور ضرورت کے وقت اسے مشورہ دینا تھا اس کے لیے خود مختاری اور اپنا اقتدار قائم کرنے کا کوئی موقع نہ تھا سلطان اپنی غیرموجودگی میں اپنا قائم مقام مقرر کردیتا، اسے بیبرس کی عدم موجودگی میں اس کے اختیارات حاصل تھے[۲]۔ سفر میں سلطان کے ساتھ ایک دوسرا وزیر ہوتا تھا جسے "وزیر الصحبۃ" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، محمد بن قلادون (۱۲۹۰ء-۱۳۴۱ء) کے عہد تک وزارت کا یہ نظام قائم رہا ابن قلادون نے وزارت کا منصب ختم کردیا تھا اور اپنے ناظر خاصہ (پرائیویٹ سکرٹری) کو اس کی ذمہ داریاں سونپ دی تھیں اس عہدہ کی حیثیت وزارت سے کم تھی۔

مملوکوں نے وزارت کی اہمیت اور استقلال کا خاتمہ کردیا تھا اور اسے کبھی پنپنے کا موقع نہ دیا چنانچہ کبھی اس منصب پر کسی شخص کو مامور کردیا اور کبھی اس عہدہ کو توڑ دیا اور اس کی ذمہ داریاں "ناظر حکومت" یا "ناظر خاص" (پرائیویٹ سکرٹری) کے سپرد کردیں، غالباً مملوکوں کو یہ اندیشہ تھا

[۱] تاریخ مصر (ابن میسر) ص ۵۸-۵۹۔ [۲] دیکھیے تفصیل صبح الاعشیٰ۔ ج ۴ ص ۱۶-۱۷

کہ وزراء کا اقتدار بڑھ کر کہیں حکومت پر نہ چھا جائے، عباسیہ اور فاطمیہ کے آخری زمانہ کا تلخ تجربہ ان کے سامنے تھا۔[1]

مملوکوں نے عہدِ ماضی کے تلخ تجربات سے فائدہ اٹھا کر دور اندیشی کے طور پر وزارت وغیرہ کا مفہوم بدل دیا تھا، صرف صاحب اپنے مفہوم میں ضرور مستعمل رہا تھا ٹیکس کے افسر کو وزیر کہا جاتا تھا اور وزیر جنگ نائب کے لفظ سے مخاطب کیا جاتا تھا۔[2]

وزیر کی تنخواہ وزیر کی تنخواہ کی کوئی حد مقرر نہ تھی، تنخواہ صرف وزیر کو نہ ملتی تھی بلکہ اس کی اولاد و ر بھائیوں اور رشتہ داروں کی تنخواہیں بھی مقرر تھیں، وزیر انہیں جاگیریں، ہدایا خلعت بھی عید اور خاص خاص موقعوں پر عطا کرتا تھا، یعقوب بن کلس وزیر اعظم عزیز باللہ فاطمی کی سالانہ تنخواہ ایک لاکھ دینار تھی مرنے کے بعد اس نے چار ہزار دہ نوجوان چھوڑے تھے جن کی تعلیم و تربیت اپنی تنخواہ سے کی تھی یعقوب بن کلس نے چار ہزار دینار کے بیش قیمت جواہرات اور پانچ لاکھ کے دوسرے سکے چھوڑے تھے اس کے ماسوا اور بہت سا ساز و سامان تھا۔

افضل بن بدر جمالی نہایت متمول وزیر اعظم تھا ۵۱۵ھ میں اس نے جو محل بنوایا تھا اس میں چھ ملین سونے کے دینار اور تین ملین نقرہ چاندی نقد محفوظ تھی محل کے دس کمروں میں دس دس سونے کے گاڑ لگے تھے، ہر گاڑ کا وزن دو سو مثقال (۱۔ مثقال ۱½ ۴ ماشہ) تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کثرت سے گائیں، بھینسیں، بکریاں اور اونٹ وغیرہ تھے، جن کی سالانہ آمدنی چالیس لاکھ دینار سے زیادہ تھی،

یحییٰ بن ہبیرہ وزیر مقتفی عباسی (۵۳۰ھ ۵۵۵ھ) کی سالانہ تنخواہ ایک لاکھ دینار تھی۔[3]

---

[1] الظاہر بیبرس (محمد جمال الدین سرور) ص ۱۳۲ [2] مقدمہ ابن خلدون ص ۲۰۸ [3] الفخری ص ۲۷۶

کتابت

کاتب | وزارت کی ذمہ داریاں امتدادِ زمانہ سے اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ انہیں انجام دینا تنہا وزیر کے امکان سے باہر تھا اس لیے مختلف محکموں کی نگرانی اور انتظام کے لیے چند دوسرے عہدے قائم کیے گئے تھے ان میں "کاتب" (فارن سکرٹری) کا عہدہ سب سے بڑا تھا۔

مملکت کے نظم و نسق کا دائرہ عمل حسب ذیل چار امور تک محدود تھا۔

(۱) انتظامی کارروائیاں۔

اس میں شہری، فوجی اور دوسری انتظامی ذمہ داریاں داخل تھیں، ان ذمہ داریوں کی حامل شخصیت کو مشرق کی قدیم حکومتوں میں وزیر کے نام سے تعبیر کیا جاتا تھا،

(۲) گورنروں اور دوسرے عہدہ داروں کو فرماں روا کے احکام سے اطلاع دینا، دوسری حکومتوں سے خط و کتابت کے فرائض انجام دینا حکومت کا یہ نہایت اہم شعبہ تھا، اس صیغہ کے افسر کو "کاتب" کہا جاتا تھا۔

(۳) مالیات کا نظم و نسق، آمد و صرف کا جائزہ اور بجٹ میں صحیح توازن کا خیال، یہ ذمہ داریاں ایک مستقل افسر کے سپرد تھیں، اسے افسر مال یا وزیر مالیات کہا جاتا تھا۔

(۴) ارباب حاجت کے اژدحام کو روکنے اور ان میں نظم و ضبط قائم رکھنے اور تہذیب و ادب سے انہیں سلطان کے حضور میں پیش کرنے کے لیے باقاعدہ ایک نظام قائم تھا اس نظام کے افسر کو حاجب کہا جاتا تھا، یہ دروازہ پر مامور ہوتا تھا، اس کی اجازت کے بغیر کوئی خلیفہ کے حضور میں پیش نہیں ہو سکتا تھا۔[۱]

---

[۱] مقدمہ ابن خلدون۔ ص ۲۰۵

کتابت خلافتِ راشدہ میں

جزیرہ عرب کا سوادِ اعظم طبقہ نوشت و خواند سے ناواقف تھا، خلیفہ کسی اچھے خط والے کو اپنا کاتب مقرر کر لیتا تھا، جو نہایت بلیغ عبارت میں اس کے مفہوم کو ادا کر دیتا تھا، صدرِ اسلام میں حضرت عمر حضرت علی حضرت زید بن ثابت اور حضرت معاویہ بن ابی سفیان (رضی اللہ عنہم) ممتاز کاتب گذرے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ بزرگ قرآن اور ان خطوط کی کتابت پر مامور تھے جو آپؐ، ملوک اور امراء کے نام لکھواتے تھے، اس عہدہ کے فرائض وقتاً فوقتاً حضرت عثمانؓ، سعد بن عاصؓ اور مغیرہ بن شعبہؓ بھی انجام دیا کرتے تھے، حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں اس منصب پر حضرت عثمانؓ مامور تھے، حضرت عمرؓ نے زید بن ثابتؓ اور حضرت عبداللہ بن ارقمؓ کا اس عہدہ پر تقرر کیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے کاتب مروان بن حکم تھے اور حضرت علیؓ کے زمانہ میں عبداللہ بن ابی رافعؓ اس عہدہ پر فائز تھے[1]

کتابت عہد بنی امیہ اور بنی عباسیہ میں خلافت بنی امیہ کا جب قیام ہوا تو سلطنت کے مختلف صیغوں کے لیے پانچ کاتب مقرر ہوئے اور رسل و رسائل، خراج کے امور، فوجی معاملات، پولیس کے لیے ہدایات اور قاضی کے لیے ایک ایک مستقل کاتب کا تقرر کیا گیا۔ مرتبہ کے لحاظ سے رسل و رسائل کے کاتب کی حیثیت سب سے بلند تھی، خلفاء اس عہدہ پر اپنے کسی قریبی عزیز یا کسی معتمد خاص کو مامور کرتے تھے، عہد عباسیہ میں بھی خلفاء کا یہی معمول رہا[2]

محکمہ رسائل یا دیوانی رسائل دولتِ عباسیہ میں بہت اہم محکمہ تھا اس محکمہ کا افسر قریب

---

[1] کتاب الوزراء والکتاب (جہشیاری) ص۔ ۱۲۔ ۱۴۔ ۲۴ [2] مقدمہ ابن خلدون۔ ص ۲۰۶ - ۲۰۵

قریب وزیر اعظم کے ہم رتبہ ہوتا تھا، اس کے فرائض میں قوانین کی تشہیر اور ان کا نفاذ، سیاسی خطوط کی تحریر اور دوسری اہم ذمہ داریاں داخل تھیں، اس کاتب کا فرض تھا کہ خلیفہ کو اطمینان کرا دینے یا دکھا دینے کے بعد مہر خلافت ثبت کرے، یہ کاتب سرکاری خطوط کے جوابات رکارڈ آفس میں اپنی مہر ثبت کرنے کے بعد حفاظت سے رکھ دیتا تھا۔ عدالت میں اس کی نشست خلیفہ کے قریب ہوتی تھی، یہ مدعی، مدعا علیہ کے بیانات اور ان کے بارے میں خلیفہ کے فیصلہ جات تحریر کرتا اور ان پر مہر خلافت ثبت کرتا تھا۔ اس کے فرائض میں یہ بھی داخل تھا کہ خلیفہ کے فیصلہ کی نقل لکھ کر دیدے اور اصل کو رکارڈ آفس میں حفاظت کے ساتھ امانت رکھ دے، اس عہدہ کے لیے خلیفہ معزز خاندان کی بلند پایہ ادیب شخصیت کو مامور کرتا تھا جو وسعت معلومات اور پاکیزہ طرز نگارش کے لحاظ سے غیر معمولی شہرت کا مالک ہوتا تھا، خلفاء اس کے بے حد خواہشمند تھے کہ ان کے مافی الضمیر کو نہایت بلیغ اور پاکیزہ انداز میں ظاہر کیا جائے۔

یہ کاتب خلیفہ کی طرف سے امراء اور سلاطین سے خط وکتابت کرتے تھے۔

یہ اہم ذمہ داری کبھی خود خلیفہ انجام دیتا تھا اور کبھی وزیر اعظم کے حوالہ بھی کر دیتا تھا۔

عباسیہ کے دور عروج میں کاتبوں کی ایک بہت بڑی تعداد گذری ہے، جن کی مثال زمانہ کبھی پیدا نہ کر سکا۔ ان میں یحییٰ بن خالد برمکی اور فضل بن ربیع (عہد ہارون میں) فضل حسن اور احمد بن یوسف (عہد مامون میں) محمد بن عبد الملک زیات، حسن بن وہب اور احمد بن مدبر (عہد معتصم اور واثق میں) غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں۔[۱]

کتابت عہد طولون میں	اخشیدیوں سے قبل مصر میں وزارت کا منصب قائم نہ تھا گورنر وزارت کی خدمات کاتبوں سے لیا کرتے تھے، احمد بن طولون نے احمد بن محمد

واسطی کو اپنا کاتب مقرر کیا تھا اور ضرورت کے وقت وزارت کی خدمات بھی اس سے لیتا تھا، جب واسطی سامرا بھیجدیا گیا تو اس کی جگہ ایک مصری جعفر بن عبد الغفار کو اپنا کاتب

مقرر کیا مگر تجربہ سے جب وہ اس کا اہل ثابت نہ ہوا تو احمد بن خاقان نے ابن طولون کو مشورہ دیا کہ اسے سبکدوش کر دیا جائے مگر احمد بن طولون کی سیاسی پالیسی یہ تھی کہ اس منصب پر کوئی مصری ہی مامور کیا جائے اور اس وقت اس کی نگاہ میں کوئی دوسرا مصری نہ تھا، اس لیے اس نے اس مشورہ کو درخور التفات نہیں خیال کیا[۱] ابن طولون کا ایک مقصد اس پالیسی سے مصریوں کی تالیف قلوب تھا دوسرا اس کا بنیادی خیال تھا کہ ایک مصری اپنے بلاد کے طبعی حالات سے زیادہ واقف ہوگا اور اسے ملک کی فلاح و بہبودی کا جتنا خیال ہو سکتا ہے اتنا کسی غیر مصری کو نہیں ہو سکتا۔

ابن طولون کا ایک پرائیویٹ سکرٹری اور ایک فارن سکرٹری تھا، فارن سکرٹری کا فرض یہ تھا کہ خلیفہ کی طرف سے سلاطین اور امراء کے خطوط کے جوابات دیدے اور ضرورت کے وقت ان کے پاس خطوط روانہ کرے۔

کتابت عہد فاطمیہ میں فاطمیہ کے عہد میں کتابت کا منصب قریب قریب وزارت کے ہمپایہ تھا، اس معزز عہدہ پر نہایت معتمد قابل اور غیر معمولی سیاسی صلاحیت رکھنے والے فرد کو مامور کیا جاتا تھا، اس وقت یہ منصب وزارت کے لیے پہلا قدم شمار ہوتا تھا۔

خلیفہ فاطمی معز الدین نے جوہر صقلی کو ۳۴۱ھ میں اپنا کاتب مقرر کیا تھا، یہ نہایت بلند پایہ ادیب اور اہل قلم تھا۔ سیرت کی پاکیزگی میں اس کی نظیر ملنا دشوار تھی، جب فاطمیوں نے وزارت کا منصب اڑا دیا تھا اس وقت اس کے فرائض کاتب ہی انجام دیتا تھا۔ اسے عموماً "صاحب الوساطہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔

عہد فاطمیہ میں فارن سکرٹری کی تنخواہ ماہانہ ڈیڑھ سو دینار ۔/۷۵۰ روپیہ تھی اور اس کے محکمہ کے کلرکوں کی تنخواہ تیس دینار ۔/۱۵۰ روپیہ ہوتی تھی۔ مرتبہ کے لحاظ سے صاحب قلم الدقیق، قریباً فارن سکرٹری کے ہم رتبہ ہوتا تھا، عدالت عظمیٰ اور فوجداری کے معاملات

---

[۱] سیرت احمد بن طولون (ابن دایہ) ص ۱۵

اس کے سپرد تھے، خلیفہ سے خلوت میں ہم نشینی کا اعزاز اسے حاصل تھا وہاں یہ خلیفہ سے قرآن کے معانی اور تفسیر پر مذاکرہ کرتا، انبیاء، خلفاء اور بڑے آدمیوں کی سیرت بیان کرتا، مکارم اخلاق پر گفتگو کرتا اور خوش خطی کی اسے تعلیم دیتا اس کی ماہانہ تنخواہ سو دینار (۵۰۰ روپیہ) تھی، جب یہ بیٹھتا تو اپنے سامنے دوات رکھ لیتا جس پر سونے چاندی کی گلکاری ہوتی تھی، جب مجلس ختم ہوتی تو خلیفہ اس دوات میں دس دینار ڈال دیتا یہ اس کا حق ہوتا تھا اور تین مثقال (ایک تولہ ۲/۱ ماشہ) ایک کاغذ میں مشک عنبر ہوتا تھا یہ اس لیے تھا کہ آئندہ نشست کے موقع پر خلیفہ کے تشریف فرما ہونے سے قبل اسے سلگا دیا جائے۔ فاطمیوں کے آخری دور میں جب وزیر کا اقتدار بہت بڑھ گیا تھا اور وہ "صاحب قلم و سیف" ہوتا تھا اس وقت اس کے ایک پہلو میں "صاحب قلم الدقیق (پرائیویٹ سکرٹری) کی جگہ بیٹھتا تھا اور وزیر اعظم کے دستخط کے نیچے یہ بھی اپنے دستخط کرتا تھا، عدالت میں پیش ہونے سے قبل کاغذات کی جانچ پڑتال کرنے کا وہ مجاز تھا، صاحب قلم الدقیق کے قریب قریب رتبہ کا صاحب قلم الجلیل ہوتا تھا اس کا فرض تھا کہ عدالت کے کاغذات صاحب قلم الدقیق سے لے کر صیغہ قانون میں حفاظت سے رکھ دے اور نہایت ایمانداری سے انہیں خلیفہ کی خدمت میں تصدیق کے لیے پیش کرتا رہے، یہ کاتب عموماً ان نفوس میں سے منتخب کیے جاتے تھے جن کی ادبی اہلیت کی وسعت اور فن انشاء میں قدرت کی غیر معمولی شہرت ہوتی تھی۔

فاطمیوں کے عہد میں قضاعی (۴۵۴ھ = ۱۰۶۲ء) غیر معمولی ترقی کر کے شاہی کاتب کے منصب پر فائز ہو گیا تھا، خلیفہ آمر کے عہد میں ابن منجب صیرفی دیوان رسائل کے منصب پر مامور کیا گیا تھا، یہ ممتاز ادیب اور مورخ تھا۔

ایوبیوں کے عہد میں قاضی فاضل عبد الرحیم بیسانی (۵۹۶ھ = ۱۱۹۹ء) مشہور کاتب گذرا ہے، یہ صلاح الدین ایوبی کے زمانہ میں منصب وزارت پر فائز ہو گیا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کے دو بیٹے بھی وزارت پر مامور کیے گئے تھے۔

کتابت مملوکوں کے عہد میں

مملوکوں کے عہد میں سب سے بڑا عہدہ دار سکرٹری یا صاحب انشار ہوتا تھا، دیوان انشار کی ترکیب کاتبوں کے دو طبقوں سے ہوتی تھی، ایک طبقہ کو "کتّاب دست" کہتے تھے، یہ لوگ سلطان کے سامنے بیٹھتے تھے اور ان کا افسر واقعات و معاملات سلطان کے سامنے پیش کرتا تھا" دوسرے طبقہ کے کاتبوں کو "کتّاب الدرج" کہتے تھے، کہنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ خطوط اور فرامین کو ایک مستطیل ورق پر لکھتے تھے جس میں چند جوڑ ہوتے تھے۔ ان کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ ان خطوط اور دستاویزوں کی نقلیں لے لیں جنہیں صاحب انشار اور کتّاب دست نے مرتب کیا تھا ان کی تعداد کتّاب الدست کے اعتبار سے گھٹتی بڑھتی رہتی تھی،[1]

دیوان انشار کا افسر ظاہر بیبرس کے عہد میں فخر الدین بن لقمان تھا۔[2] یہ فن انشار کا ماہر اور غیر معمولی معلومات کا حامل شخص تھا، یہ خارجی ممالک سے آئے ہوئے خطوط کو سلطان کے سامنے بحث و تبصرہ کے لیے پیش کرتا تھا اور سلطان کی طرف سے جوابات لکھتا تھا۔[3] اس دیوان کے افسر کو "صاحب دیوان انشار" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا مگر جب قاضی فتح الدین، قلادون کے عہد حکومت میں اس عہدہ پر مامور ہوا اُس وقت سے صاحب دیوان انشار کو کاتب سر یا پرائیویٹ سکرٹری کہنے لگے تھے اور آخر عہد ممالیک تک یہی لقب رہا تھا۔[4]

یہ دیوان عہدِ حاضر کی وزارت خارجہ کے ہم معنی تھا، اس کے فرائض اور طریقۂ کار بالکل عہدِ جدید کی وزارت خارجہ کی طرح تھا۔

---

[1] صبح الاعشیٰ، ج ۱۔ ص ۱۳۷۔ ۱۳۸ [2] حسن المحاضرہ۔ ج ۲ ص ۱۳۱۔ [3] الخطط (للمقریزی) ج ۲۔ ص ۱۳۶۔ [4] صبح الاعشیٰ۔ ج ۱ ص ۱۰۴

حجابت

خلافتِ راشدہ اور بنی اُمیّہ میں

خلفاءِ راشدینؓ نے ملاقات کی عام اجازت دے رکھی تھی چنانچہ ہر شخص بے تکلف ان کے پاس جا سکتا تھا اور کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی، حضرت امیر معاویہؓ نے سب سے پہلے دروازہ پر حاجب مقرر کیے یہ خارجیوں کی ان شرارتوں کے بعد کیا گیا تھا جو ان شریروں نے حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ، عمرو بن عاصؓ کے ساتھ کی تھیں حاجب رکھنے کا اہم مقصد دشمنوں کے شر سے بچنا تھا، دوسری غرض یہ بھی تھی کہ دروازوں پر بھیڑ نہ ہونے پائے جس کی وجہ سے امورِ حکومت انجام دینے میں خلل پیدا ہو۔ بابِ خلافت سے ان ملاقات کے خواہش مندوں کو دھکا نہیں دیا جاتا تھا، یہ آئینِ شریعت کے خلاف سمجھا جاتا تھا، جب خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی اور شاہی رسوم اور القاب کا رواج ہوا تو سب سے پہلی تبدیلی سلطنت میں یہ کی گئی کہ بابِ خلافت پر جاہ و جلال کا مظاہرہ کیا گیا، خلیفہ کے پاس براہِ راست عام لوگوں کو جانے سے روکا گیا، سب سے بڑی وجہ اس کی یہ تھی کہ خلفاء کو خوارج وغیرہ کی طرف سے ہر لمحہ اندیشہ رہتا تھا، جب سے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ، عمرو بن عاصؓ وغیرہ کے ساتھ حادثات پیش آئے تھے اس وقت سے یہ اندیشہ اور بڑھ گیا تھا، دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ خلیفہ کے پاس ایک مجمع سا لگ جانے کی وجہ سے حکومت کے اہم امور انجام دینے میں بھی خلل واقع ہوتا تھا اس لیے انہوں نے بابِ خلافت پر "حاجب" مقرر کر دیے تھے۔[1]

---

[1] مقدمہ ابن خلدون۔ ص ۲۰۶

حاجب اعلیٰ عہدہ دار ہوتا تھا وہ عہدِ جدید کے "امین الاسرار" کے ہم پایہ تھا، اس کا شمار امراء دولت میں تھا، اس کا منصبی فرض یہ تھا کہ وہ خلیفہ کے پاس حاضر ہو کر ملاقات کرنے والے کے نام، مرتبہ، پورے حالات اور ان کی ضرورت سے خلیفہ کو اطلاع دے اور خلیفہ کی اجازت سے اس کی خدمت میں حاضر کردے، اگر ملاقات کرنے والے زیادہ ہوتے تو ضرورتوں کی اہمیت کا لحاظ کرکے انہیں خلیفہ کی خدمت میں باریابی کا موقع دیتا تھا

عبد الملک بن مروان نے جب حاجب مقرر کیا تھا تو اُسے ہدایت کردی تھی "موذن" ڈاکیہ، اور کھانے کے لیے بلانے والے کو کبھی میرے پاس آنے سے نہ روکنا۔ وہ ہر وقت بلا تکلف داخل ہو سکتے ہیں[۱]۔ عبد الملک بن مروان نے اپنے بھائی عبد العزیز بن مروان گورنر مصر کو نصیحت کی تھی۔ دیکھو! حاجب کے فرائض اپنے اہل ترین آدمی کے سپرد کرنا، وہ تمہاری زبان اور دل و دماغ ہے اسے ہدایت کرنا وہ ملاقات کے خواہشمند کے مرتبہ، پورے حالات اور ضرورت کی اہمیت سے پہلے آگاہ کرے اس کے بعد اگر تم ضرورت سمجھو تو بلا لو ورنہ واپس کر دو[۲]۔

عہدِ عباسیہ میں | عباسی خلفاء نے اس سلسلہ میں ایک قدم اور بڑھایا، وہ غیر معمولی ضرورت کے وقت ملاقات کرتے تھے، بابِ خلافت کے "حجاب" کا معمول تھا کہ بڑے لوگوں کو "دارِ خاص" اور "عام لوگوں کو" دارِ عام" میں بٹھا دیتے تھے اور باری باری سے باریاب کرتے تھے، بڑے چھوٹے میں امتیاز کرنا حاجبوں کا کام تھا بڑے آدمیوں کے بعد چھوٹے آدمیوں کی باری آتی تھی، یہ بیان کرنے کی غالباً ضرورت نہیں، ابنِ خلدون نے اسے "حجابِ ثانی" سے تعبیر کیا ہے، خلافتِ عباسیہ کے دورِ انحطاط میں ایک اور "حجابِ ثالث" حائل ہو گیا تھا جو دو پہلے حجابوں سے زیادہ شدید تھا اور وہ وزیرِ اعظم تھا جو خلیفہ اور اربابِ حاجت کے درمیان خلیج کی طرح حائل تھا اور من مانی کارروائیاں کرتا تھا۔

---

[۱] مقدمہ ابن خلدون۔ ص ۲۰۷ [۲] الفخری۔ فی آدابِ السلطانیہ۔ ص ۱۱۵

عہدِ عباسیہ میں تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ حاجب کا مرتبہ بڑھتا گیا، خلیفہ اکثر اوقات امورِ سلطنت میں ان سے مشورہ لیا کرتا تھا، عہدِ عباسیہ کا ممتاز حاجب فضل بن ربیع تھا، جس کا برامکہ کی بربادی میں بہت بڑا حصہ تھا، اسی نے امین کو اپنے بیٹے کی ولی عہدی اور اپنے بھائی مامون کی ولی عہدی کو منسوخ کر دینے پر آمادہ کیا تھا، جس کا انجام دنیا کو معلوم ہے۔ حاجب کے لیے ضروری خیال کیا جاتا تھا کہ وہ خندہ جبیں ہو، اپنے آقا کا انتہائی خیر خواہ ہو، مردم شناس ہو، اپنے آقا کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں وقعت اور اچھے احساسات پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو[۱]۔

عہدِ عباسیہ میں بسا اوقات حاجب امورِ مملکت میں دخیل رہے تھے، ان کا اقتدار قریب قریب وزیر کے برابر تھا، محکموں کے افسروں کے لیے ضروری تھا کہ وہ اہم انتظامی معاملات میں ان کے مشورہ اور ان کی اجازت کے بغیر کارروائیاں نہ کریں[۲]۔

محمد بن یاقوت حاجب کے نظم و نسق میں دخل سے اربابِ تاریخ ناواقف نہیں، دیوانِ خراج کا نظم و انتظام بھی اسی کے اشارۂ چشم سے گردش کرتا تھا اور حکومت میں اس کا اقتدار وزیرِ اعظم سے کسی طرح کم نہ تھا[۳]۔

بنی اُمیہ اندلس کے عہد میں

بنی اُمیہ اندلس کے عہد میں حاجبوں کا فرض خاص و عام دونوں کو سلطان کے پاس جانے سے روکنا تھا، وہ صرف سلطان اور وزراء کے درمیان ملاقات کا واسطہ تھے، وزراء سے کم درجے کے لوگ سلطان سے ملاقات نہ کر سکتے تھے، دولتِ اندلس میں ان حاجبوں کی حیثیت بہت بڑھی ہوئی تھی، ابن حدیر جیسے با اقتدار افراد اس عہد کے حاجب گذرے ہیں، جب حکومت اندلس میں شاہنشاہیت کی شان پیدا ہو گئی اُس وقت بھی یہ منصب قائم تھا، جب حکومت اندلس کا شیرازہ منتشر ہو گیا اور اس کی جگہ چند

۱؎ المحاسن والمساوی (بیہقی) ج ۱ - ص ۱۲۴ ۲؎

۳؎ تجارب الامم (ابن مسکویہ) ج ۱ - ص ۱۰۳ واقعات ۳۲۳ھ

سری حکومت قائم ہوگئی اس وقت فرماں روا اس میں ایک شان خیال کرتا تھا کہ سلطان کے تمام القاب سے اسے خطاب کرنے کے علاوہ یہ بھی ذکر کیا جائے کہ حاجب اور "ذی الوزارتین (وزیر اعظم، وزیر جنگ) کے منصب بھی اس نے قائم کر رکھے ہیں[1]

مصر میں

ابن خلدون عہد فاطمیہ میں "حجابت" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے " اس کے بعد مغربی ممالک اور بلاد افریقہ میں اس لفظ کا ذکر نہیں ملتا ہے وجہ یہ تھی کہ یہ ممالک غیر متمدن تھے مصر کی مملوک حکومت کے دور میں کسی کسی فرماں روا کے زمانہ میں "حجاب" کا وجود ضرور نظر آتا ہے، ان کے عہد میں حجابت ایک ممتاز منصب تھا، حجاب کے اختیارات کا دائرۂ عمل صرف ملاقات کرنے والوں کو سلطان کی خدمت میں پیش کر دینے تک محدود نہ تھا، بلکہ وہ امراء اور فوج کے باہمی معاملات سلطان کے مشورہ سے ایک ثالث کی حیثیت سے تصفیہ کراتے تھے رفتہ رفتہ ان کا اقتدار اتنا بڑھ گیا تھا کہ انہوں نے ثالث بن کر ان نو آباد مغلوں کے مسئلہ کا حل کیا تھا جو چنگیز خاں کی سیاسی اسکیم کے ماتحت مصر میں آباد ہو گئے تھے[2]

[1] مقدمہ ابن خلدون - ص ۲۰۹ [2] خطط (مقریزی) ج ۲ - ص ۲۲۰ - ۲۲۱

باب دوم

۱۔ شہری نظام
۲۔ دفاتر
۳۔ فوج
۴۔ بحری نظام
۵۔ ڈاک
۶۔ پولس

نظم و نسق

عربوں کا نظام حکومت عہد جاہلیت میں

دورِ جاہلیت میں قبیلہ کا مفہوم افرادِ انسانی کا وہ مجموعہ تھا جو ایک خطہ پر قیام پذیر ہوا قبیلہ کا شیخ ان کا حاکم تھا، وہ قبیلہ کے افراد کی نسب اور خون کے رشتہ کی بنا پر شیرازہ بندی کرتا تھا اور افراد کی امداد سے قبیلہ کی فلاح و بہبود میں کوشاں رہتا تھا، عربوں میں عہدِ حاضر کی حکومتوں میں سے کسی نوع کی حکومت کا وجود نہ تھا نہ ان کے ہاں آج کی طرح عدالت کا نظام تھا جہاں وہ جھگڑے قضیوں کا فیصلہ کرانے جاتے، نہ پولیس تھی جو امن و امان قائم رکھتی، اور نہ فوج تھی جو بیرونی خطرات کی مدافعت کرتی، عرب کسی منظم حکومت کے ماتحت نہ تھے، اس لیے ٹیکس وغیرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ان میں مظلوم اپنا انتقام ظالم سے خود لے لیتا تھا، اس وقت قبیلہ کا فرض ہوتا تھا کہ وہ اس کی پشت پناہی کرے اگر ظالم اپنے ظلم کی تلافی کر دیتا تو پھر اس سے انتقام لینے کا حق نہ رہتا، اگر ظالم خود مظلوم کا کوئی عزیز رشتہ دار ہوتا تو وہ تنہا اسی سے اپنا بدلہ لے لیا کرتا قبیلہ اس وقت دخل نہ دیتا، شرفاء عرب اپنے ایک امیر کی قیادت میں لڑتے اور امن کے زمانہ میں ان کی حیثیت ایک منظم سوسائٹی یا معاشرہ کی ہوتی تھی۔

قبیلہ میں جمہوری حکومت کا قیام تھا، قبیلہ کا شیخ خاندانوں کے سربرآوردہ اور ممتاز اشخاص کو اعلانِ جنگ کرنے، مصالحت کرنے اور قبیلہ کے نظم و نسق کے متعلق مشورہ کرنے کے لیے جمع کرتا اور اتفاق رائے سے جو طے ہو جاتا اس کے مطابق عمل درآمد کیا جاتا، ان کی یہ مجلس شوریٰ پارلیمنٹ کی حیثیت رکھتی تھی۔ قبیلہ کا کوئی لکھا ہوا دستور حکومت نہ تھا، صرف موروثی روایات پر ان کا نظام قائم تھا، اسی کو قانونِ حکومت کی حیثیت حاصل تھی، اس لحاظ سے

عہدِ جدید کا نظامِ سلطنت اس نظام سے مختلف تھا، موجودہ زمانہ میں معمولاً مملکت کے نظام کی بنیاد کسی نہ کسی دستورِ حکومت پر ہوتی ہے۔

اسلام نے عربوں کے مختلف طبقوں اور مختلف فرقوں کے افراد میں یک جہتی پیدا کر دی تھی اور اتحادِ قومی کو اتحادِ مذہبی میں تبدیل کر دیا تھا، اسلام نے آقا و غلام، امیر و غریب اور شریف و رذیل کے امتیازاتِ باطل کو مٹا دیا تھا اور عربوں کی منتشر قوت ایک ایسی "مستحکم عمارت" کی شکل میں مجتمع کر دی تھی جو اینٹوں کے باہمی سہارے پر قائم ہوتی ہے۔ خدا نے اس شیرازہ بندی کو اپنا بہت بڑا احسان فرمایا ہے،

"(اے پیغمبر!) . . . . خدا ہی کی ذات ہے، جس نے اپنی مددگاری سے مومنوں کی جماعت سے تیری تائید کی اور وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں باہمی الفت پیدا کر دی اگر تو وہ سب کچھ خرچ کر ڈالتا جو روئے زمین میں ہے، جب بھی ان کے دلوں کو باہمی الفت سے نہ جوڑ سکتا، لیکن یہ اللہ ہے جس نے باہمی الفت پیدا کر دی۔"[1]

عربوں کی شیرازہ بندی میں اسلام کی مساوات اور جمہوری نظام نے بہت سہارا دیا تھا اور اس کی وجہ سے ..... عربوں کو آپؐ نے ایک مرکز پر جمع کر دیا تھا۔ اسلامی جمہوریت نے ان کے قبائلی امتیازات کا جنازہ دفنا دیا تھا۔ جو ان کی شیرازہ بندی میں ایک وسیع خلیج کی طرح حائل تھے، قرآن نے ان باطل امتیازات کو ان الفاظ میں لغو قرار دیا۔

"ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، خاندان اور قبیلے محض امتیاز کے لیے بنا دیے ورنہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ اس سے ڈرتا ہو۔"[2]

---

[1] آیت ۶۲-۶۳- سورۂ انفال۔ [2] آیت ۱۳- سورۂ حجرات۔

اس خداوندی تعلیم کا اثر تھا کہ نسلی اتحاد کی جگہ مذہبی رشتہ ان کی وحدت کا سبب بنا اور مذہب نے راعی رعایا اور قوم کے افراد میں ایک مستحکم رشتہ قائم کر دیا اور ان کی حیثیت ایک مشین کے مختلف پرزوں کی سی ہو گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کا دائرۂ عمل مذہبی معاملات تک محدود نہ تھا بلکہ اس کا دامن سیاسی امور تک وسیع تھا۔ آپؐ فوج کی قیادت فرماتے۔ جھگڑوں کا فیصلہ فرماتے، زکوٰۃ وغیرہ کا مال وصول کرتے اور شرعی نقطۂ نظر سے اُسے صرف میں لاتے، آپؐ کی مقدس شخصیت مذہبی اور سیاسی دونوں حکومتوں کی حامل تھی، مگر سیاسی حکومت کی حیثیت ثانوی تھی، آپؐ کی بعثت کا حقیقی مقصد دعوت اسلام اور اس کی نشرو اشاعت تھی، یہی وجہ تھی کہ آپؐ دنیاوی معاملات میں بڑے بڑے مہاجرین اور انصار سے مشورہ فرماتے پھر ان کے متعلق احکام صادر فرماتے[1] لیکن مذہبی امور میں آپؐ کی شخصیت خود مختار تھی ان امور کے متعلق آپؐ کسی سے مشورہ نہیں فرماتے تھے دنیاوی امور میں آپؐ کے مشیر کار خاص طور پر حضرت حمزہؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت عمارؓ، حضرت حذیفہؓ، حضرت ابوذرؓ، حضرت مقدادؓ اور حضرت بلالؓ (رضی اللہ عنہم) ہوتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہری نظام کی بنیاد رکھ دی تھی، مدینہ میں اسلامی ریاست کا باقاعدہ نظام قائم تھا، آنحضرتؐ کی طرف سے حجاز و یمن کے بڑے بڑے شہروں اور بڑے بڑے قبیلوں میں حکام کا تقرر کیا گیا تھا، اس وقت ان حاکموں کے اختیارات کا دائرہ نماز کی امامت اور صدقات کے جمع و انتظام تک محدود تھا۔ اور ان کی کوئی سیاسی حیثیت نہ ہوتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ سے کسی غزوہ کے لیے روانہ ہوتے تو مدینہ میں اپنے کسی صحابی کو اپنا قائم مقام بنا جاتے، وہ آپؐ کی

---

[1] مقدمہ ابن خلدون۔ ص ۲۰۶

بجائے نماز میں امامت کرتا۔ جب کسی شخص کو سپہ سالار بنا کر روانہ فرماتے تو امامت کے علاوہ انتظامی اور فوجی اختیارات بھی اس کے سپرد کر دیے جاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حاکموں کے انتخاب کے وقت یہ خیال رکھتے تھے، کہ ان کا پایہ صلاح و تقویٰ، علم و عمل اور تفقہ و بصیرت کے لحاظ سے بلند ہو۔ آنحضرتؐ نے سب سے پہلے عتاب بن اسیدؓ گورنر مکہ کی تنخواہ ایک درہم یومیہ مقرر فرمائی تھی، اس سے قبل ان حاکموں کی باقاعدہ تنخواہوں کا معمول نہ تھا، فتوحات اور مالِ غنیمت سے انہیں حصہ مل جاتا تھا، یہی ان کی تنخواہ خیال کی جاتی تھی۔

شہری نظام
خلافتِ راشدہ میں

اسلامی ریاست کا شہری نظام روم و فارس سے قریبًا ماخوذ تھا، عربوں کو علم تھا کہ ان قوموں کا سیاسی نظام، ان کی تہذیب اوران کا تمدن تاریخ میں امتیازی حیثیت کا حامل رہا ہے، عربوں نے بلادِ روم و فارس کو فتح کرنے کے بعد ان کے صدیوں کے نظامِ شہری کو درہم برہم کرنا نامناسب خیال کیا اور چند خلافِ اسلام امور میں اصلاحات کے سوا اور کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی، مسلمان مفتوحہ اقوام سے قریب ہونے کی کوشش کرتے تھے اس لیے وہ ہر اس کام سے احتراز کرتے جو فاتح مفتوح قوم میں بُعد پیدا کرے خلافتِ راشدہ میں ریاست کا نظم و نسق مختلف اداروں میں مخصوص اختیارات و فرائض کے ساتھ تقسیم ہوا تھا اس کی ابتدار عہدِ عباسیہ سے ہوئی ہے،

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کیے ہوئے گورنروں کو بحال رکھا، اور حکومت کے دوسرے شعبے ممتاز صحابہ کے سپرد کر دیے، چنانچہ مالیات کا شعبہ حضرت ابوعبیدہؓ اور عدالت کا محکمہ حضرت عمرؓ کے حوالہ کر دیا، اس میں آپ نے مناسبت اور تجربہ کا لحاظ رکھا تھا، دوسرے مہماتِ حکومت میں آپ اصحاب رائے اور اربابِ فقہ سے مشورہ لے لیا کرتے تھے ان میں حضرت عمر، عثمان، علی، عبدالرحمٰن بن عوف، معاذ بن جبل، ابی بن کعب اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم امتیازی درجہ رکھتے ہیں، قاضیوں کے تقرر کا اختیار اپنے صوبوں میں گورنروں کو حاصل تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں بلادِ عرب حسبِ ذیل صوبوں میں تقسیم تھے

مکہ، مدینہ، طائف، صنعاء، حضرموت، خولان، زبید، ابع، جند، نجران، جرش، اور تحسیمن ۔

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے دور میں جب دائرۂ حکومت زیادہ وسیع ہوا تو آپ نے اسلامی ریاست کو چند بڑے بڑے صوبوں میں تقسیم کر دیا تاکہ ان کے نظم نسق اور ولایات کے انتظام میں آسانی ہو، یہ صوبے حسب ذیل تھے ۔

اہواز اور بحرین کا ایک صوبہ، سجستان، مکران اور کرمان کو ملا کر ایک صوبہ، طبرستان کا ایک صوبہ، بلادِ فارس کو تین صوبوں میں تقسیم کر دیا، عراق کے دو حصے کر دیے ایک کا صدر مقام کوفہ تھا دوسرے کا بصرہ تھا، بلادِ شام کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک کا مرکز حمص تھا اور دوسرے کا دمشق تھا، فلسطین ایک مستقل صوبہ تھا، افریقہ کے تین ٹکڑے کر دیے تھے، مصر کا مرتفع علاقہ، مصر کا نشیبی حصہ، مغربی مصر اور صحرائے لیبیا۔[1] حکومتِ اسلامیہ کا شہری نظام سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے قائم کیا تھا۔ سیاسی زاویۂ نگاہ سے حضرت عمرؓ بلادِ عرب میں مرکزیت اور عربوں میں ایک قومی وحدت کا احساس پیدا کرنا چاہتے تھے، وہ اسے بھی ناپسند کرتے تھے کہ مفتوحہ ممالک میں شادی بیاہ کا رشتہ قائم کیا جائے انہیں دوسری قوموں سے عربوں کا نسلی اختلاط گوارا نہ تھا، یہ ان کی سیاسی پالیسی تھی، سید امیر علی جج کے الفاظ میں "اگر حضرت عمرؓ کی زندگی کی مدت کچھ اور طویل ہوتی تو ان کی غیر معمولی سیاسی صلاحیت اور بلند پایہ شخصیت عربوں میں وحدتِ قومی کا زبردست احساس پیدا کر دیتی اور وہ ان خانہ جنگیوں میں ایک وسیع خلیج بن کر حائل ہو جاتے جنہوں نے اسلام کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔"[2]

---

[1] SAYED AMEER ALI. A SHORT HISTORY OF THE SARACENS. - P. 60-67.

[2] " " " " " " - P. 57.

حضرت عمرؓ نے ہر صوبہ پر ایک گورنر کا تقرر کیا تھا جو ان کی ہدایات کے ماتحت حکومت کرتا تھا۔ خلیفہ کو عاملہ، مقننہ اور انتظامیہ کے کلی اختیارات حاصل تھے۔

ہر صوبہ کا گورنر نماز میں امامت کرتا، جھگڑوں کا فیصلہ کرتا، جنگ میں فوج کی قیادت کرتا، مال کو جمع کرتا اور حکومت کے دوسرے اہم فرائض انجام دیتا تھا۔ خراج کے افسر کی اعلیٰ حیثیت تھی، یہ مالیات کا سب سے بڑا افسر تھا اور گورنر کے دوش بدوش حکومت کے فرائض انجام دیتا تھا۔ گورنر نظم و نسق میں خود مختار تھا اور خراج کا افسر مالیات کے محکمہ کا مستقل حاکم تھا، اس کی حیثیت گورنر کے رقیب کی تھی چنانچہ دونوں میں اقتدار کے بارے میں ہمیشہ کشمکش رہتی تھی، حضرت عمرؓ کی یہ زبردست سیاست تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ایک دوسرے سے چوکنا تھا۔ مالیات کے افسر کا تقرر خلیفہ کے اختیار میں تھا۔

حضرت عمرؓ نے عرب گورنر مقرر کیے تھے ان کے جانشینوں کی پالیسی بھی یہی حضرت عمرؓ کا معمول تھا کہ جب کسی کو گورنر بنا کر روانہ کرتے تو اسے رخصت کرنے کے لیے کچھ دور مدینہ کے باہر تشریف لاتے اور رخصتانہ ہدایات فرماتے "میں نے گورنر اس لیے مقرر کیا ہے کہ تم لوگوں میں نماز قائم کرو، ان کے حقوق ادا کرو، ان میں عدل و انصاف کرو۔ دیکھو عربوں کو دُرّے نہ مارنا اس کی وجہ سے ان کی وقعت کم ہو جائے گی اور نہ انہیں نظر بند کرنا یہ ان کے حق میں ایک فتنہ ہوگا" حضرت عمرؓ نہایت بیدار مغز خلیفہ تھے وہ گورنروں کے حالات سے باخبر رہتے۔ اگر کسی گورنر کی شکایت پہنچتی تو گورنر اور مظلوم دونوں کو اپنے سامنے حاضر کرتے اور پوری تحقیق کے بعد منصفانہ فیصلہ فرماتے اور اس میں کسی کی رو رعایت نہ کرتے، جب فوج کے سپہ سالاروں کو رخصت کرتے تو انہیں نہ اسکے خوف اور جبر و زیادتی سے اجتناب کی نصیحت فرماتے، جنگ میں بزدلی سے غیرت دلاتے، دشمن کے ناک کان کاٹنے کی ممانعت کرتے، اور لوٹ مار سے

منع فرماتے، آپ کی سخت ممانعت تھی کہ بڈھے، عورت، بچہ کو کسی حالت میں قتل نہ کیا جائے۔

حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) خلیفہ ہوئے تو آپ نے بھی حضرت عمرؓ کی سیاسی پالیسی اختیار کی، حضرت عثمانؓ کا سب سے پہلا جو فرمان سپہ سالاروں کے نام پہونچا تھا اس میں یہ الفاظ تھے، عمرؓ کا دستورِ حکومت اور نظام قائم رہے گا، تم میں سے کسی کو اپنے عہدہ سے نہیں ہٹایا جائے گا، حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری دور میں ان کا اقتدار ان کے بڑھاپے کی وجہ سے کم ہوگیا تھا۔ جس کی وجہ سے صوبوں میں بغاوتیں ہوئیں اور ملک میں ایک زبردست فتنہ اٹھا جس نے انہیں شہید کرکے دم لیا، ان کی شہادت کے بعد حضرت علی (رضی اللہ عنہ) خلیفہ ہوئے، آپ نے فوراً حضرت عثمانؓ کے گورنروں کو معزول کر دیا۔

خلافتِ راشدہ میں خلفاء "مجلسِ شیوخ" سے انتظامی امور اور حکومت کے نظم و نسق میں امداد لیا کرتے تھے، اس مجلس کے عناصر ترکیبی میں بڑے بڑے صحابہؓ اعیانِ مدینہ اور سردارانِ قبائل داخل تھے، مسجدِ نبوی میں اس مجلس کا اجلاس ہوتا تھا۔ خلیفہ اس مجلس کے مشورہ کے بغیر کسی امر کا قطعی فیصلہ نہ کرتا تھا، اسلام کا نظامِ حکومت خلافتِ راشدہ کے تیس سالہ دور میں بڑی حد تک جمہوری نظام سے ملتا جلتا تھا۔

مسجد کی حیثیت اسلام کے ابتدائی دور میں مسجد اجتماعی اور سیاسی اغراض کا مرکز تھی، خلیفہ اور گورنر پنج وقتہ نمازوں میں مسلمانوں کی امامت کرتے اور سیاسی معاملات طے کرنے مسجد میں حاضر ہوتے، اس زمانہ میں مسجد صرف عبادت گاہ نہ تھی بلکہ سیاسی اور اجتماعی زندگی کا مرکز تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں سفیروں سے ملاقات فرماتے گورنروں کو ہدایات مسجد سے روانہ فرماتے، مذہبی معاملات میں صحابہ سے مشورہ فرماتے، سیاسی اور مذہبی تقریریں فرماتے . . . . مسجد کے منبر پر

حضرت عمرؓ نے اپنی قلبی بصیرت سے دیکھ کر عراق میں مسلمانوں کی پسپائی کی خبر دی تھی، حضرت عثمانؓ نے اپنے اوپر لگائے ہوئے الزامات کے جوابات کے لیئے مسجد کے منبر کو موزوں خیال کیا تھا، جس وقت خلیفہ کا انتخاب عمل میں آتا تھا اُس وقت اُس کا معمول تھا کہ مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کرے اور اپنی سیاسی پالیسی کا اعلان کرے۔ مسجد کا یہ منبر دستوری حکومت کے تختِ شاہی کے مشابہ ہے، جس پر کھڑے ہو کر بادشاہ تقریر کرتا ہے اور اپنی سیاسی حکمتِ عملی کا اعلان کرتا ہے۔

مسجد آغازِ اسلام سے علماء کا مرکز رہی ہے یہ تفسیر و حدیث کی درس گاہیں، بچوں کے مکتب، مذہبی تعلیم گاہیں اور عدالت گاہیں رہیں، اُس زمانہ کی سیاست کو مذہب سے کسی طرح جدا نہیں کیا جا سکتا ہے، اُس وقت مسجد میں اُن تمام امور کا اعلان کیا جاتا تھا جن کا تعلق مفادِ عامہ سے ہوتا تھا۔

مسجدوں کی اجتماعی اور سیاسی حیثیت زیادہ مدت قائم نہ رہی، خلافتِ راشدہ کے بعد خلیفہ منبر کے کام تختِ شاہی سے لینے لگا اور گورنروں اور قاضیوں نے مسجد کی جگہ اپنی اپنی جلوہ گاہوں کو اپنا سیاسی اور عدالتی مرکز قرار دیا اور وہیں سے اپنے فرائض انجام دینے لگے، مسجد اب صرف اس لیے رہ گئی تھی کہ وہاں مذہبی تقریریں کر دی جائیں جس میں حمد و ثنا، درود اور سلام ہوں اور اس محراب اور منبر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام اور محافظِ دین کی حیثیت سے خلیفہ کا پروپیگنڈا کیا جائے، جب خلیفہ کے سیاسی جاہ و جلال کا جنازہ اُٹھ گیا، اس وقت اتنا کافی تھا کہ خطبہ میں خلیفہ کا نام ذکر کر دیا جائے تاکہ رائے عامہ کو یہ غلط فہمی رہے کہ گورنر خلیفۂ وقت کو امتِ مسلمہ کا سب سے بڑا سیاسی فرماں روا تسلیم کرتا ہے۔

۱؎ THECALIPHATE. P. 36 - 38.

گورنروں کے اختیارات و فرائض

خود مختار گورنروں کے اختیارات و فرائض معمولاً حسبِ ذیل ہوتے تھے

۱۔ ایک جنرل کے فرائض و اختیارات اپنی فوج پر۔

۲۔ اپنے صوبہ میں حکام اور قاضیوں کے تقرر کا پورا اختیار۔

۳۔ مالیات کے محکمہ کا نظم و نسق۔

۴۔ تحفظ ناموسِ دین۔

۵۔ حدودِ اسلام اور تعزیرات کا عمل میں لانا۔

۶۔ امامت پنج وقتہ اور جمعہ کی نمازیں۔

۷۔ حاجیوں کے لیے سہولتیں مہیا کرنا۔

اگر یہ اقلیم سرحدی ہے اور دشمن کی یورش ہوتی رہتی ہے تو انھیں ذمہ داری "جہاد" کی اور بڑھ جاتی تھی جہاد کے بعد مالِ غنیمت کی تقسیم وغیرہ بھی اسی کا فرض تھا۔

اگر استبدادی حکومت ہوتی اور گورنر کا تقرر خلیفہ کی طرف سے نہ کیا جاتا بلکہ وہ اپنے اثر و قوت سے اقتدار حاصل کر لیتا، اس وقت یہ گورنر اپنی سیاسی پالیسی اور تدبیرِ مملکت میں خود مختار ہوتا تھا، مگر مذہبی معاملات میں خلیفہ سے نیازمندانہ تعلق ضرور رکھتا تھا۔ ماوردی کے الفاظ میں "خودسر گورنر وہ ہے جو طاقت سے اس علاقہ پر قبضہ کر لے جو خلیفہ کے دائرۂ اقتدار میں داخل تھا اور خلیفہ مصلحتاً اس علاقہ کا نظم و نسق اور وہاں کی سیاسی فرماں روائی اُسے سونپ دے، یہ گورنر مذہبی معاملات میں خلیفہ سے اجازت لے لیتا تھا، تاکہ رائے عامہ کی نظر میں اس کی حکومت اسلامی

رہے اور گورنر کا اس میں کوئی نقصان بھی نہ تھا۔[1]

یہ گورنر اپنے دائرۂ عمل میں ایک خودمختار فرماں روا کی حیثیت رکھتے تھے، گورنروں کی دوسری قسم وہ تھی جن کے اختیارات و فرائض اپنے صوبہ میں تاج خلافت کی طرف سے محدود تھے اور ان کے اختیارات کا دائرہ فوج، نظم ونسق، حریم خلافت کی حمایت، ناموسِ دین کے تحفظ تک محدود تھا۔ عدالت، مالیات اور عاملہ کا اسے کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔

اسلام کے دورِ اوّل میں گورنر خودمختار ہوتے تھے مگر بعد میں ان کے اختیارات محدود کر دیے گئے تھے حضرت عمرو بن عاصؓ مصر کے خودمختار گورنر تھے، فوج، عدالت اور مالیات کے محکموں پر انہیں پورا اختیار حاصل تھا۔ تھوڑی مدت کے بعد حضرت عمرؓ نے مالیات کا محکمہ ان سے لے لیا اور اس کا افسر عبد اللہ بن سعدؓ کو مقرر کر دیا کچھ عرصہ کے بعد عدالت کا محکمہ بھی ان سے لے لیا گیا اس کے بعد ان کے اختیارات کا دائرہ فوج اور نماز کی امامت تک محدود رہ گیا تھا۔

عہد بنی امیہ کا شہری نظام

عہدِ بنی اُمیہ میں اسلامی سلطنت کا دائرۂ عمل بہت وسیع ہو گیا۔ انتظامی سہولتوں کے لیے اس وقت سلطنت پانچ بڑے بڑے صوبوں میں تقسیم کر دی گئی تھی۔

۱۔ حجاز، یمن اور عرب وسطیٰ۔

۲۔ مصر، مصر کا مرتفع حصہ، مصر کا نشیبی علاقہ۔

۳۔ عراق عرب (بلادِ بابل اور آشور قدیم) عراق عجم (بلادِ فارس) عمان وبحرین، کرمان وسجستان، کابل وخراسان، بلاد ماوراء النہر اور سندھ، پنجاب کے بعض علاقے، یہ سب خطے ملا کر ان کا ایک بڑا صوبہ بنا دیا گیا تھا یہ گورنر عراق کے ماتحت تھا، جس کا صدر مقام

[1] ماوردی۔ ص ۲۸-۲۹۔ وغیرہ۔

کوفہ تھا۔ انتظامی آسانیوں کی غرض سے گورنر عراق کی طرف سے خراسان اور بلادِ
ماوراء النہر کا ایک حاکم مقرر ہوتا تھا جو اکثر مرو میں رہتا تھا۔ بلادِ بحرین اور عمان حاکم بصرہ
کے ماتحت ہوتے تھے، جسے گورنر عراق مقرر کرتا تھا۔ سندھ اور پنجاب کے شہروں
کا ایک الگ حاکم ہوتا تھا اس کا تقرر بھی گورنر عراق کرتا تھا۔

۴۔ بلاد الجزیرہ، ارمینیہ، آذربیجان اور ایشیائے کوچک کے چند علاقے۔

۵۔ شمالی افریقہ، اس کے حدود میں مغربی مصر، بلادِ اندلس، جزائر سسلی، سروانیہ اور
بلیار داخل تھے۔ صدر مقام قیروان تھا۔ گورنر افریقہ طنجہ، بحر روم کے جزائر اور بلادِ
اندلس پر ایک حاکم مقرر کرتا تھا جس کا دار الحکومت قرطبہ ہوتا تھا۔[۱]

خلافتِ راشدہ کی طرح بنی امیہ کے دور میں بھی عرب گورنر مقرر کیے جاتے تھے
یہ ان کی سیاسی پالیسی تھی۔ بنی امیہ نے اتنا اور اضافہ کیا کہ اس منصب جلیل پر خاندانِ
خلافت سے کسی کو مامور کرتے تھے، بنی امیہ کے آخر عہد میں خصوصاً یزید بن عبد الملک
کے زمانہ میں گورنروں کو اپنے اپنے دار الحکومت میں قیام کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ اس
سے قبل کوئی گورنر دمشق میں مقیم تھا، کوئی کسی دوسری فرحت افزا جگہ میں قیام رکھتا تھا۔
یہ گورنر اپنے قائم مقام مقرر کر دیا کرتے تھے، جو زیادہ سے زیادہ آمدنی ان کی
خوشنودی اور "دلچسپیوں" کے لیے پیش کرتے تھے۔ گورنر ملکی نظم و نسق میں عہدہ داروں
کی بہت بڑی تعداد سے امداد لیا کرتا تھا، ان میں افسر مال، قاضی اور پولیس کا افسر ممتاز
عہدے دار تھے۔[۲]

بنی امیہ کا ملکی نظام امیر معاویہؓ کا مرہونِ احسان نہ تھا۔ بلکہ سچ پوچھیے تو اس کا
مؤسس عبد الملک بن مروان تھا جس نے شہری اور مالیات کا نظام عربوں کے

۱۔ SAYED AMEER ALI. P. 187–188.

۲۔ SHORT HISTORY OF THE SARACENS. P. 190–

نقطۂ نظر اور ان کی خاص ذہنیت کا لحاظ کر کے مرتب کیا تھا، عبد الملک رشوت سے سخت جلتا تھا اور اس کے انسداد میں اس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اگر کسی گورنر یا حاکم کے بارے میں اسے رشوت ستانی کا علم ہو جاتا تھا تو اسے کبھی نہیں بخشتا تھا۔

عہدِ بنی امیہ میں گورنر کی حکومت مطلق تھی اسے جان و مال پر اختیار حاصل تھا حجاج بن یوسف کی گورنری اس پر کافی روشنی ڈالتی ہے، حجاج کے قبضہ میں مالیات کا پورا نظام تھا وہ پورا اخراج وصول کرتا تھا اور خلیفہ کے پاس اسے روانہ کرنے کی ضرورت نہیں خیال کرتا تھا، حجاج کے بعد بہت سے گورنر حجاج بن یوسف کے نقشِ قدم پر چلے تھے آخر عہد میں اموی گورنروں کی گورنری کی مدت بھی کافی طویل ہونے لگی تھی۔ مثلاً مشرق میں حجاج بن یوسف اور مصر میں عبد العزیز بن مروان کی گورنری کو قریب بیس بیس برس گذر گئے تھے۔ جب حضرت عمر بن عبد العزیزؒ خلیفہ ہوئے تو آپ نے پچھلے گورنروں کو برطرف کر دیا اور جدید گورنروں کو ہدایت کر دی کہ بغیر میری اجازت کے کسی کو قتل نہ کیا جائے

بنی امیہ کا ملکی نظام بہر دور میں عیوب سے معمور نہ تھا ہاں! یزید بن ولید کے زمانہ میں اس کی حالت ضرور سخت ابتر ہو گئی تھی، وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنے پیش رو خلفاء کے طریقۂ کار کو ترک کر دیا تھا، بنی امیہ کے آخری خلیفہ مروان بن محمد نے باوجود اپنی بلند ہمتی اور شجاعت کے مہماتِ حکومت اور دشمنوں کی طرف سے بے نیازی اختیار کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملکی نظام اور ابتر ہو گیا اور مملکت کی مشینری بگڑ گئی بنی امیہ کی حکومت، عربوں کی حکومت تھی۔ گورنر اور حاکم خاندانِ خلافت سے مقرر کیے جاتے تھے یا وہ عربوں کے سربر آوردہ خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اس کا موالیوں پر بہت برا اثر پڑا تھا اور وہ خلافتِ امویہ کی بربادی کا سبب بنے، بنی امیہ کے زوال کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ خلفاء ملکی حالات سے بے بہرہ رہتے یہ وہ وقت تھا جب انہوں نے اپنی

حرکتوں سے جنرلوں کو برانگیختہ کر دیا تھا، ولی عہدی کے سلسلہ میں خاندانِ اموی میں پارٹی بندی پیدا ہو گئی تھی اور ان کا خاندانی شیرازہ منتشر تھا ان حالات میں فوجوں کو تنخواہ ملنے میں تاخیر ہوئی تو فوجوں نے ان کے حریف عباسیوں کی پشت پناہی کی۔ انجام یہ ہوا کہ امویوں کی حکومت کا آفتاب دمشق میں غروب ہو گیا۔[1]

عہد عباسیہ کا ملکی نظام

عباسیہ کے دورِ عروج میں ملکی نظام میں مرکزیت قائم تھی۔ حکومت کا محور بغداد تھا، یہیں سے تمام مملکت پر فرماں روائی کی جاتی تھی۔ عہدِ اموی کے گورنر حجاج بن یوسف اور زیاد بن ربیہ کی طرح عباسی گورنر مطلق العنان حاکم نہ تھے اس کی وجہ سے انہیں اپنا اقتدار بڑھانے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ سچ پوچھیے تو بنی امیہ کے خاتمہ کے بعد لامرکزیت کو مرکزیت میں اسی پالیسی نے تبدیل کر دیا تھا۔ عہدِ عباسیہ میں، عالمِ اسلامی میں اہم منصب افسر مالیات، ڈاک خانہ کا افسر اور قاضی تھے۔ دورِ عروج میں گورنروں کے اختیارات و فرائض فوج کی قیادت اور نماز میں امامت تک محدود تھے

جب دولتِ عباسیہ کا ضعف و انحطاط بڑھ گیا تو گورنر بغداد میں قیام کو ترجیح دینے لگے اور اپنی طرف سے صوبوں میں حاکم مقرر کر دیتے تھے جو قائم مقام کی حیثیت سے وہاں حکومت کرتے تھے۔ خلافتِ عباسیہ جب انتہائی دورِ انحطاط سے گذر رہی تھی، اس وقت مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بہت سے گورنر خود مختار بن بیٹھے تھے اس زمانہ میں مصر میں دولتِ طولون اور دولتِ اخشیدیہ کی بنیاد پڑی اور مشرق میں طاہریہ، صفاریہ، سامانیہ حکومتیں قائم ہو گئیں اور اس عظیم الشان سلطنت کے اجزاء منتشر ہونا شروع ہو گئے۔

منصور عباسی کی سیاسی پالیسی اور دستورِ حکومت پر عباسیوں کا ہمیشہ عمل رہا اس دستور پر ان حکومتوں نے بھی عمل درآمد کیا جو دولتِ عباسیہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے

[1] الاسلامیہ فی عز العرب (پروفیسر کرد علی)۔ ص ۱۱۹

کے بعد وجود میں آئی تھیں۔ پروفیسر نکلسن لکھتے ہیں "بغداد کو دار الخلافت کے اسباب و محرکات نے پورے نظام حکومت میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیا تھا جو جدید حکومت کے لیے نہایت سود مند ثابت ہوا تھا، اموی حکمران عربوں کے جمہوری نظام کے علمبردار تھے، مگر عباسیوں نے اس شاہنشاہی نظام کو اختیار کیا جو عام طور سے مشرق میں رائج تھا، جس سے اہل فارس داریوس ( ) اور اجزرسیس ( ) کے زمانہ سے مانوس تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عباسی ان مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کر سکے جس طرح ان سے پہلے ان پر آل ساسان کرتے تھے۔

ہارون رشید کے زمانہ تک عباسیہ کا نظام حکومت استبدادی یا شاہنشاہی رہا۔ اگرچہ محکموں کے افسروں اور خاندان شاہی کے ممتاز افراد سے غیر سرکاری حیثیت سے اہم معاملات میں مشورہ لے لیا جاتا تھا۔ مگر تمام قوت کا سرچشمہ فرماں روا کی ذات تھی اور مملکت کے نظم و نسق میں اس کو "اقتدار اعلیٰ" کی حیثیت حاصل تھی۔ اس دور میں وزیر خلیفہ کا دایاں بازو خیال کیا جاتا تھا۔ اس کے اہم فرائض و اختیارات میں گورنروں کا عزل و نصب، مالیات کا انتظام، اور امور خارجہ کی نگرانی داخل تھی، وہ نظم و نسق میں خلیفہ کا قائم مقام ہوتا تھا، اور اسے فوجی اور شہری معاملات میں خلیفہ کی طرف سے کلی اختیارات حاصل تھے، خلیفہ اور ریاست کی خیرخواہی اس کا فرض منصبی تھا۔ وزراء کے یہ اختیارات و فرائض عباسیہ کے ابتدائی دور میں تھے۔ لیکن جب امتداد زمانہ نے یہ ثابت کر دیا کہ اتنی انتظامی ذمہ داریاں تنہا ایک شخص صحیح طور سے انجام نہیں دے سکتا، تو چند محکموں کا اضافہ کر دیا گیا جو وزیر کو ملکی نظم و نسق اور مختلف صیغوں کی دیکھ بھال اور انتظامی امور میں سہارا دیتے۔[۱]

ریاست کا نظم و نسق چند محدود قوانین کی بنیاد پر قائم تھا جو موجودہ متمدن قوموں

[۱] SAYED AMEER ALI - P. 405 - 406 -

کے نظام سے بہت مشابہ تھا، بعض حیثیت سے وہ عہدِ جدید کے نظام سے زیادہ وسعت نظری کا حامل تھا، حکومت عثمانیہ کی طرح، عباسیوں کے ہاں بھی حکومت کے تمام چھوٹے بڑے عہدے مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کو بلا کسی تفریق و امتیاز کے دیے جاتے تھے، عباسیہ اور بنی امیہ میں سب سے بڑی مابہ الامتیاز چیز یہی تھی۔ عباسیہ کے بعد مستقبل کی تمام اسلامی سلطنتوں کا یہی دستورِ عمل رہا اور اس مساوات کو انہوں نے کبھی ترک نہیں کیا۔[۱]

گورنروں کو انتظامی معاملات میں خلیفہ کی طرف سے کلی اختیارات حاصل تھے لیکن مدنی اور عدالتی اختیارات "مطلق" نہ ہوتے تھے بلکہ ان پر پابندیاں لگی ہوئی تھیں، اس کا خیال رکھا جاتا تھا کہ گورنر کی میعادِ حکومت طویل نہ ہونے پائے، اس محدود مدت میں بھی ان کی طرف سے خطرہ پیدا ہو جاتا تھا تو فوراً معزول کر دیا جاتا تھا۔ اور اسے نظم و نسق اور دوسرے امور کے بارے میں ایک مفصل رپورٹ پیش کرنا پڑتی تھی اور اس کی دیانتداری اور صداقت میں معمولی سا شبہ تمام املاک ضبط کر لینے کے لئے کافی تھا منصور کے عہد میں گورنر کی حیثیت برائے نام تھی[۲] اور خلیفہ کے اشارہ پر گردش کرتا تھا۔ عدالت کے اختیارات قاضی کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ جس کی امداد کے لیئے مقامی سربرآوردہ لوگوں کی جیوری مقرر تھی اختیارات کی اس تحدید کے باوجود بعض گورنر اس زمانہ میں بھی خودمختارانہ حیثیت سے حکومت کرتے تھے۔ اس امتیازی حیثیت میں بعض مادی اتفاقات کا دخل تھا۔

خلیفہ کی حکومت "دیوانِ عزیز" کے نام سے منسوب تھی[۳]۔ یہ پہلے بھی کسی جگہ بیان

۱؎ IBID. P. 408-409.

۲؎ 〃 P. 409.

۳؎ 〃 P. 464.

کیا گیا ہے کہ وزیر اس دیوان کا نگراں تھا محکموں کے افسروں کو بھی ایک زمانہ میں وزرار کہا جاتا تھا۔ یہ وزرار وزیر اعظم کے ماتحت ہوتے تھے۔

معتصم اور واثق کے دور میں نظام حکومت ہارون و مامون کے زمانہ سے مختلف نہ تھا، ان کے جانشینوں کے دور میں بھی کوئی بنیادی تبدیلی نہ ہوئی اور منصور کا دستور حکومت قائم رہا۔ تیسری صدی ہجری کے نصف اخیر سے خلفاء عباسیہ کی شان و شوکت اور جاہ و جلال کا جنازہ اٹھ چکا تھا، مامون کے بعد بیدار مغز اور پختہ کار خلفار کا قحط رہا اور حکومت کے نظام میں ابتری پھیلتی گئی اس انحطاط کا اہم سبب بدنظمی اور محکمہ عدالت کا ضعف تھا، اس وقت گورنروں اور وزیروں کے سرکش جذبات کو اعتدال پر رکھنے والا کوئی نہ تھا۔[1]

مصر کا نظام حکومت

حضرت عمرو بن عاص رضؓ سے خلافتِ فاطمیہ تک

مصر حضرت عمرو بن عاصؓ کے زمانہ (سنہ ۲۰ھ ۔ سنہ ۶۴۱ء) سے عہد طولون (سنہ ۲۵۴ھ ۔ سنہ ۲۹۲ھ ۔ سنہ ۸۶۶ء ۔ سنہ ۹۰۵ء) تک "تاجِ خلافت" سے وابستہ رہا۔ اس کے بعد ایک خود مختار صوبہ بن گیا تھا۔ مصر میں مسلمانوں کا نظام حکومت رومیوں کے طرز پر قائم تھا۔ عربوں میں قدیم متمدن اقوام کے قوانین اور نظاموں کو اپنانے کی خاص صلاحیت تھی مصر میں فاطمیوں کے زمانہ تک نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی سلطانی مظاہر میں ضرور اضافہ ہوا، مدیر یا محافظ اور مامور یا نائب مدیر اور خولی یا مفتش زراعی اس وقت بھی

---

[1] الادارۃ الاسلامیہ فی عزالعرب ص ۱۶۷

اسی مفہوم میں مستعمل ہیں جس میں رومیوں کے زمانہ میں استعمال کیے جاتے تھے، گرافٹن ملن (GRAFTON MILUN) نے اپنی کتاب "مصر رومیوں کے عہد میں" میں وضاحت کی ہے کہ لفظ مدیر رومی لفظ (EPISTRATEGOR) کے ہم معنی ہے اور مامور TO PARCH کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اور خولی یا منتظم زراعت رومی لفظ SITOLOGES. کے مترادف ہے۔[1]

فتح اسلام کے بعد بعض ممتاز رومی گورنر اپنے اپنے منصب پر قائم رہے لیکن اکثر رومی گورنروں نے مسلمانوں کے ماتحت رہنا پسند نہ کیا۔ اور اپنے صوبوں کو خیرباد کہہ دیا، عربوں نے ان کی جگہ قبطی گورنر مقرر کر دیئے جو عیسائی تھے۔ اس وقت ان عیسائی گورنروں کی ایک بہت بڑی تعداد تھی، مسلمانوں نے حکومت کی ذمہ داریوں کے کم ہونے کی وجہ سے اس زمانہ میں مذہبی امور کی طرف اپنی توجہ مرکوز کر دی۔

حکومت اسلامیہ میں گورنر سب سے بڑا عہدہ دار تھا اس کا تقرر خلیفہ کے اختیار میں تھا۔ وہ اپنے صوبہ میں عدالت، مالیات، فوج اور پولیس کا سب سے بڑا افسر ہوتا تھا۔

نماز کی امامت گورنر کا اہم فریضہ تھا، مذہبی ارتباط اور شیرازہ بندی میں نماز کا بہت بڑا دخل تھا۔ گورنر جمعہ اور عیدین کی نمازیں امامت کرتا تھا۔ مصر میں اسلام کا دائرۂ عمل نہایت سرعت سے وسیع ہوگیا اور کثرت سے مصری سچے دل سے یا جزیہ کے ڈر سے مسلمان ہو گئے تو مسلمانوں اور قبطیوں میں شادی بیاہ کے تعلقات کی وجہ سے مسلمانوں کی مردم شماری میں اور اضافہ ہوگیا، اس وقت متعدد مسجدیں اور جامع مسجدیں تعمیر کرنا پڑیں۔

[1] EGYPT UNDER ROMAN RULE P. 215.

خلافتِ راشدہ اور بنی امیہ اور عہدِ عباسیہ کے ابتدائی زمانہ میں گورنر نماز میں امامت کا فرض انجام دیتے تھے۔ جب تک عرب گورنر آتے رہے یہ حالت قائم رہی جب غیر عرب گورنر آئے تو اپنے لب ولہجہ اور تلفظ خراب ہونے کی وجہ سے اپنے نائب مقرر کر دیتے تھے، ان گورنروں نے عباسی خلافت سے بغاوتیں کر دی تھیں جب عباسی خلفاء ترک امراء اور بنی بویہ کے زیر اقتدار تھے اور ان کی حیثیت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

عہدِ فاطمیہ | فاطمیوں کے زمانہ تک مصر کے نظامِ حکومت میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی، فاطمیوں کے دور میں چند مظاہر سلطانی کا ضرور اضافہ ہوا۔

جوہر نے تسخیرِ مصر کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بڑے بڑے عہدوں پر سے سُنیوں کو ہٹا کر ان کی جگہ بلادِ مغرب کے شیعوں کا تقرر کر دیا۔ اس نے اپنی سیاست کو عمل میں لانے کے لیے سُنّی مذہب کے تمام آثار مٹا دیئے خواہ وہ مذہبی ہوں یا ان کا تعلق تمدن اور تہذیب سے ہو۔ سُنیوں کو وہ "دشمنانِ اسلام" سے زیادہ حیثیت نہ دیتا تھا[1]

بلادِ مصر پر جوہر خلیفہ فاطمی کے قائم مقام کی حیثیت سے حکومت کرتا رہا۔ اس کی سیاسی پالیسی نہایت دور رس اور گہری تھی۔ بلادِ مغرب کے شیعوں کے لیے اس نے وسیع میدانِ عمل پیدا کر دیا تھا تاکہ وہ حکومت کی مشینری پر چھا جائیں۔ اس کی سیاسی پالیسی مختصر الفاظ میں یہ تھی "کوئی محکمہ ایسا نہ ہے جہاں کوئی مغربی شیعہ مشیر کار کی حیثیت سے مسلط نہ ہو[2]"

جوہر نے مصلحتِ وقت کا لحاظ کر کے اپنی اس سیاسی حکمتِ عملی کو رفتہ رفتہ عمل میں لانا مناسب خیال کیا اور کوشش کی کہ ان سُنیوں کو اس کا احساس نہ ہونے پائے جو اس وقت حکومت کے نظم و نسق پر قابض تھے، ڈر یہ تھا کہ ان کا یہ احساس شورش

[1] جوہر صقلی (علی ابراہیم حسن) ص ۳۷ [2] اتعاظ الحنفاء (مقریزی) ص ۸۷

اور بغاوت کی شکل میں نمودار ہو کر حکومت کے نظم و نسق کو تہ و بالا نہ کر دے۔ جوہر اپنی اس سیاسی پالیسی میں ۳۷۹ھ تک پوری طرح کامیاب ہو گیا اس وقت حکومت کے تمام نظم و نسق پر شیعہ کا قبضہ ہو گیا تھا۔ سنّی کہیں خال خال نظر آتے تھے۔ یہ فتح مصر کے بیس سال کے بعد کا ذکر ہے۔ جوہر نے حکومت کے تمام عہدہ داروں پر لازمی قرار دیدیا تھا کہ وہ مذہب شیعہ کے احکام پر عمل درآمد کریں جو حکومت کا مذہب ہے اس حکمت عملی سے مصر کے سُنی عہدہ داروں میں شیعہ مذہب کی اشاعت ہوئی اور اُنہوں نے جبر و استبداد کے خطرہ یا اعلیٰ عہدوں کی امید میں شیعہ مذہب قبول کر لیا۔ یہی حال یہودیوں اور عیسائیوں اور دوسرے غیر مسلموں کا تھا۔

۳۶۳ھ کے اوائل میں حکومت کے نظم و نسق میں چند تبدیلیاں کی گئیں۔ اس وقت محکمہ پولیس قاہرہ منتقل کر دیا گیا اور اس کا افسر اعلیٰ جبر مقرر ہوا۔ خلیفہ معز نے جامع عمرو بن عاص کی خطابت کا منصب بنی عبدالسمیع سے لے لیا اور جعفر بن حسن کو وہاں کا خطیب مقرر کر دیا۔ بنی عبدالسمیع کا خاندان چونسٹھ سال سے اس خطابت پر مامور تھا ۳۷۹ھ میں خلیفہ نے جامع ازہر کا خطیب اپنے بھائی کو مقرر کیا، افسر مالیات کی جگہ محمد بن حسین بن مہذب کا تقرر عمل میں آیا۔ یہ سب کے سب بلادِ مغرب کے شیعہ تھے۔

اس دور میں شیعوں کے قبضہ میں تمام اہم محکمے تھے، ان میں محکمۂ مال، وزارت، عدالت اور احتساب خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ مالیات کا محکمہ یعقوب بن کلس اور علوج بن حسن کی نگرانی میں تھا جو مستقبل میں عہدۂ وزارت پر فائز ہوئے تھے۔

فاطمیوں کے عہد میں متعدد دفاتر یا دواوین تھے جو علیحدہ علیحدہ افسروں کے ماتحت تھے، یہ افسر بہت بڑے عہدہ دار خیال کیے جاتے تھے۔ ان میں قابلِ ذکر یہ تھے

۱؎ الخطط ج ۲۔ ص ۹۹

فوجی دفتر کا افسر، اس کے سامنے فوجیں اور گھوڑے وغیرہ پیش کیے جاتے تھے دفتر لباس، فوجوں کی وردیوں وغیرہ کا انتظام اس کے سپرد تھا، افسر دیوانی اوقاف، افسر مشاہرہ، یہ محکمہ تنخواہوں کو تقسیم کرتا اور ملازموں کی تنخواہیں، کارگذاریوں کی سالانہ رپورٹ مرتب کرتا تھا، یہ رپورٹ خلیفہ کے سامنے پیش کی جاتی تھی[۵]

اس دور کے بڑے بڑے عہدہ داروں میں "صاحب الباب" (شاہی دربان) "حامل مظلۃ الخلیفہ" (چھتری بردار) "صاحب رسالہ" (خلیفہ کے خطوط وزیر اور دوسرے اعلیٰ عہدہ داروں کے پاس پہونچاتا تھا) "افسر مالیات" (عہد حاضر کا وزیر مالیات) اور "حامل دواۃ خلیفہ" تھے۔ مذہبی اعلیٰ عہدہ داروں میں قابلِ ذکر یہ تھے "قاضی القضاۃ" اس کا فرض احکام شرعیہ کا تحفظ اور سکّہ کی نگرانی بھی تھا، "داعی الدعاۃ" قاضی القضاۃ کے قریب قریب ہم رتبہ ہوتا تھا، اس کا منصبی فرض مساجد اور مدارس میں فاطمیوں کی دعوت و تبلیغ کرنا تھا۔ "محتسب" اس کا فرض بازاروں کی نگرانی تھا، یہ قوانینِ بیع و شرا کی پابندی کراتا تھا، پیمانوں اور وزنوں کی جانچ کرتا تھا۔ قرضوں کو وصول کراتا تھا اور قیام امن کے لیے مناسب تدابیر اور کارروائیاں عمل میں لاتا تھا۔ یہ ممتاز اور سربرآوردہ مسلمانوں میں سے منتخب ہوتا تھا، یہ عہدہ بڑی حد تک مذہبی خیال کیا جاتا تھا۔ اس کی تنخواہ تیس دینار یا ۱۵۰ روپیہ ہوتی تھی۔ عہدِ فاطمی میں بڑے عہدہ داروں میں "وکیل بیت المال" اور "نائب صاحب الباب" بھی تھا، اس کا کام سفیروں کا استقبال اور ان کے رہنے سہنے کا انتظام تھا۔ اس عہد میں قاریوں کی ایک بہت بڑی تعداد ملازم تھی، جو مجلس اور جلوس کے وقت خلیفہ کے سامنے قرآن کی تلاوت کرتے، انہیں "قراء الحضرۃ" کہا جاتا تھا۔

مملوکوں کے عہد میں

مملوکوں کے زمانہ میں مصر کے نظام حکومت میں نمایاں تغیرات ہوئے بیبرس نے حکومت کے نظم و نسق میں مقربینِ بارگاہ امرا سے امداد لی

---

[۵] تفصیل دیکھو الخطط - ج ۲ - ص ۹۹ -

اور ان کا بڑے بڑے مناصب پر تقرر کیا، نائب السلطان کا جدید عہدہ قائم کیا گیا، جس کی بنیاد دولتِ ایوبیہ نے ڈالی تھی، اس کی ضرورت اس لیے پڑی تھی کہ جنگوں کی وجہ سے اس زمانہ میں سلطان اکثر دار الحکومت سے باہر رہتا، اس اثنار میں حکومت کے نظم ونسق میں دقت ہوتی تھی، اس عہدہ کے قیام کے بعد جب سلطان خارجی حکومتوں سے نبرد آزما ہوتا تو نائب السلطان سلطان کی جگہ ریاست کا انتظام چلاتا تھا، اسے سیاسی فرماں روائی حاصل تھی اور وہ جاگیریں دینے اور سلطان کی طرح اعلیٰ عہدوں پر تقرر کرنے کا اختیار رکھتا تھا[1]

اس دور میں وزارت عظمیٰ کا اثر و نفوذ نائب السلطان کی وجہ سے کبھی بڑھ نہ سکا تھا، سلطان کے ساتھ سفر میں ایک دوسرا وزیر رہتا تھا جو "وزیر الصحبۃ" کے نام سے معروف تھا۔ وزارت کے عہدہ کو ناصر بن محمد قلاوون نے توڑ دیا تھا، اور حکومت کے نظم ونسق میں "ناظر الدولۃ" سے امداد دیتا تھا جس کی حیثیت وزیر سے کم تھی، اس کا عملہ "مستوفین" کے نام سے موسوم تھا، عملہ کے نگراں افسر کو "مستوفی الصحبۃ" سے خطاب کیا جاتا تھا۔ یہ افسر چھوٹے چھوٹے ملازمین کا تقرر کر سکتا تھا۔

ناصر بن محمد قلاوون نے نائب السلطان کا عہدہ بھی ختم کر دیا تھا اور ایک جدید عہدہ "ناظر الخاصۃ" قائم کیا تھا، ابتدار میں یہ عہدہ دار سلطانی مال و دولت کے انتظامات کے لیے مامور کیا گیا تھا، مگر قربِ سلطانی کی وجہ سے اس کی حیثیت بہت بڑھ گئی تھی، اور سلطان اسے مشورہ میں شریک کرنے لگا تھا[2]

بیبرس نے اپنے دربار میں بہت سے عہدہ داروں کا اضافہ کیا تھا۔ ان میں ممتاز "استادار، دوادار، اور امیر جاندار" تھے۔ پہلے کا کام سلطانی محلات کا انتظام اور دوسرے کا فرض خطوط کو سلطان کی خدمت میں پیش کرنا اور کاغذات پر دستخط کرانا تھا، تیسرا سلطان

[1] حسن المحاضرہ (سیوطی) ج ۲۔ ص ۸۴۔ [2] ایضاً

کے دروازہ پر متعین تھا اور حکومت کے اعلیٰ افسروں اور ارکانِ دولت کا استقبال کرتا تھا[1]

مملوکوں کے عہد میں اور بھی بہت سے عہدے قائم تھے، ان میں "راس نوبۃ الامراء" امیر مجلس اور امیر السلام خاص اہمیت رکھتے تھے۔ "راس نوبۃ الامرائ" امراء دولت کا افسر تھا۔ امیر مجلس کا فرض سلطان کی حفاظت تھا۔ اس کا تقرب اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ اندرونِ قصر بھی حفاظت کے لیے ساتھ جاتا تھا حتیٰ کہ اس کے سونے اور آرام کرنے کے کمرہ میں بھی اس کے ہمراہ رہتا تھا، امیر السلام کا فرض اسلحہ جات، میگزین اور سامان جنگ کا انتظام اور اس کی نگرانی تھا[2]

سلطان کی طرف سے مصر کے مختلف صوبوں میں گورنر مامور تھے، ان کا منصبی فرض سلطانی احکام کا نفاذ اور خراج اور چُنگی وصول کرنا تھا۔ اسکندریہ ... اس وقت نہایت اہم تجارتی بندرگاہ تھی۔ مشرق کی تجارت کا محور اس وقت عیذاب کی سرحد تھی، جو بحر احمر کی ایک مصری سرحد تھی۔ سمندر کے محاذ کا علاقہ چند صوبوں میں تقسیم تھا۔ ان میں اہم صوبے، قوص، اشمونین، بھنسا اور الجیزہ تھے، ساحلی علاقہ کے اہم صوبے بلبیس، منوف محلہ الکبریٰ منہور، قلیوب اور دمیاط تھے[3]

اس دور کے ممتاز عہدوں میں ایک "ولایۃ" کا عہدہ بھی تھا، عہدِ اسلام میں یہ "شرطہ" کے نام سے معروف تھا[4] اس عہدہ دار کا فرضِ منصبی امن و امان کا قیام، مجرموں اور قاتلوں کی گرفتاری اور انہیں کیفر کردار کو پہونچانا اور وہ تمام فرائض تھے جن کا تعلق رعایا کی فلاح و بہبود اور حفظِ جان و مال سے تھا۔ اس منصب کی ذمہ داریاں تین امراء میں تقسیم تھیں۔ ایک کے ذمہ قاہرہ کا قیام امن اور پبلک کی دشواریاں رفع کرنا تھا۔ دوسرے

---

[1] الخطط (مقریزی) ج ۲۔ ص ۲۲۲ [2] صبح الاعشیٰ ج ۴ ص ۱۸ [3] ایضاً ص ۲۶-۲۰
[4] مقریزی۔ ج ۲ ص ۲۲۳۔

کے یہی فرائض فسطاط میں تھے [1]، تیسرے کے فرائض جنازوں کے جلوس کے وقت نظام کو قائم رکھنا اور قبروں کی زیارت کے وقت عام آداب کا تحفظ، عیدوں اور تقریب حج کے موقعہ پر انتظامات اور کفن چوروں سے قبروں کی حفاظت تھی [2]۔

قاہرہ کے کوتوال یا صاحب عسس کے سپرد فائر بریگیڈ کا عملہ بھی تھا۔ یہ عموماً عشاء کی نماز کے بعد فائر بریگیڈ کے ہیڈ کوارٹر میں آجاتا تھا، اُس کے سامنے مشعل رکھی جاتی تھی جو رات بھر روشن رہتی تھی۔ اس وقت سقّے، بڑھئی وغیرہ موجود رہتے تھے۔ اگر کہیں آگ لگ جاتی تھی تو بجھانے کے لیے یہ عملہ دوڑ پڑتا تھا [3]۔ یہ فائر بریگیڈ کا اسٹیشن "سوق حمالون کبیر" میں واقع تھا۔

[1] صبح الاعشیٰ۔ ج ۴۔ ص ۲۳ [2] الظاہر بیبرس (جمال الدین سرور) ص ۱۴۴
[3] الخطط۔ ج ۲۔ ص ۱۰۳

دفاتر

(۱) دفاتر، خلافتِ راشدہ میں

حضرت عمرؓ نے ایک ایرانی مدبّر کے مشورہ سے دفتری نظام قائم کیا تھا، یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب فتوحاتِ اسلامیہ کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا، اور فارس کی بے شمار دولت کی تقسیم اور اُس کے صرف کی ضرورت پیش آئی تھی۔ حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے "صرفِ دولت" کو ایک منظم شکل دینے کے لیے دفاتر کو قائم کیا اور ہر مسلمان کا وظیفہ اور تنخواہ مقرر کر دی۔ اس میں اسلام کی سبقت اور اسلامی خدمات کا لحاظ رکھا تھا۔ دفاتر کے عملہ نے اسی زاویۂ نگاہ سے مختلف افراد اور طبقوں کی ایک فہرست مرتب کی تھی، اس میں سب سے پہلے حضرت عباسؓ عمِ آنحضرتؐ کا نام تھا، پھر بنی ہاشم اور دوسرے حضرات کے نام تھے۔ حضرت عثمانؓ کے ابتدائی دورِ خلافت تک وظائف کا یہی لائحہ عمل تھا۔ بعد میں اس میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی تھی[1]

حضرت عمرؓ نے دفتری نظام ایرانیوں کے طرز پر قائم کیا تھا، یہ دفاتر مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے تھے، ان میں دیوانِ فوج اور دیوانِ خراج امتیازی حیثیت کے حامل تھے دیوانِ فوج میں سپاہیوں اور اُن کی تنخواہوں کی باقاعدہ فہرست رہتی تھی، دیوانِ خراج میں ریاست کی آمدنی اور اُس کے آمد و صرف کا حساب رہتا تھا۔

---

[1] الفخری۔ ص ۷۹۔ ۸۰ اور تفصیل دیکھو الاحکام السلطانیہ۔ ص ۱۹۱ والوزراء الکتاب ص ۱۶۔ ۱۷

دفاتر عہد بنی اُمیّہ میں

تعدادِ دفاتر | عہد بنی امیہ میں حکومت کا نظام چار بڑے بڑے محکموں میں تقسیم تھا۔

(۱) دیوانِ خراج۔

(۲) دیوانِ رسل و رسائل، اس کا افسر صوبوں کے نظم و نسق کی نگرانی اور گورنروں کے نام مناسب ہدایات بھیجتا تھا۔

(۳) غلہ اور دوسری پیداوار کے انتظامات کا محکمہ۔

(۴) دیوانِ خاتم، اس کو سب سے پہلے امیر معاویہؓ نے قائم کیا تھا، حکومت کا یہ سب سے بڑا دفتر تھا، اس میں بہت سے ذمہ دار اشخاص کام کرتے تھے۔ یہ لوگ خلیفہ کے احکام کی نقلیں لیتے اور تاگے سے نتھی کرنے کے بعد ان پر لاکھ کی مہر لگاتے اور پھر یہ احکامات اس محکمہ کے افسر کی مہر ثبت کرنے کے بعد نہایت احتیاط سے دفتر میں محفوظ کر دیئے جاتے تھے۔ اس دیوان کی حیثیت عہدِ جدید کے "رکارڈ آفس" کی تھی۔

ان دفتروں کے علاوہ اور بھی محکمے تھے جن کی اہمیت ان سے کم تھی۔ ان میں پولیس کے اخراجات وغیرہ اور فوج کی تنخواہوں سے متعلق دفاتر ممتاز درجہ رکھتے تھے، بے محل نہ ہوگا اگر دیوانِ خاتم کا ذرا تفصیلی ذکر کر دیا جائے۔

دیوانِ خاتم | اس کے قیام کی ضرورت سب سے پہلے حضرت امیر معاویہؓ نے محسوس کی تھی، وجہ یہ ہوئی کہ امیر معاویہؓ نے اپنے گورنر عراق زیاد بن ربیعہ کے پاس ایک شخص کو ایک لاکھ درہم دینے کے لیے خط دیا تھا۔ اس خط پر مہر نہ تھی۔ اُس شخص نے اسے بڑھا اور ایک لاکھ کی جگہ دو لاکھ بنا دیے اور یہ رقم حاصل کر لی۔ زیاد نے جب اس کا

حساب امیر معاویہؓ کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے کہا میں نے ایک لاکھ کے لیے لکھا تھا، اس واقعہ کے بعد دیوانِ خاتم قائم کر دیا گیا اور اس کے بعد مہر شدہ خطوط جانے لگے تھے۔ [۱]

خطوط اور دستاویزوں پر مہر کا رواج مسلمانوں میں امیر معاویہؓ سے قبل بھی پایا جاتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرقل، قیصر روم کے پاس مہر شدہ والانامہ بھیجا تھا۔ کیونکہ آپؐ کو معلوم ہوا تھا کہ قیصر روم بے مہر کے خطوط قبول نہیں کرتا ہے۔ اس غرض کے لیے آپؐ نے چاندی کی ایک مہر بنوائی تھی اور اس میں "محمد رسول اللہ" کندہ کرایا تھا، اسی مہر سے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ مہر ثبت کرتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے یہ مہر ایک کنویں میں گر پڑی تھی اس کے بعد آپ نے اسی نمونہ کی دوسری مہر بنوائی تھی [۲] دولتِ عباسیہ میں "خاتم سلطان" سے خطوط پر مہر لگائی جاتی تھی۔ یہ مہر سرخ گیلی مٹی سے مس کرکے کاغذات کی تہ کرنے اور جوڑنے کے بعد ایک کونہ پر لگادی جاتی تھی [۳]

دیوانِ خاتم امیر معاویہؓ کے زمانہ سے لے کر عہد عباسیہ کے وسط تک بہت اہم دیوان خیال کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد جب نظم و نسق وزراء کے ہاتھ میں چلا گیا تو یہ محکمہ توڑ دیا گیا، عباسیہ کے دورِ عروج میں مہرِ خلافت کا صد درجہ احترام کیا جاتا تھا، ہارون رشید نے جب فضل کی جگہ اس کے بھائی جعفر کو قلمدانِ وزارت سونپا تھا، اُس وقت اُس نے اُن کے باپ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا "اباجان! میرا ارادہ ہے کہ خاتم کو داہنے ہاتھ سے بائیں ہاتھ میں تبدیل کردوں" خاتم سے ہارون نے وزارت کی طرف اشارہ کیا تھا، خاتم کا اتنا پاسِ ادب تھا کہ جب وزیر کو مہر لگانے کے لیے دی جاتی تھی تو وہ اس کے احترام میں کھڑا ہو جاتا تھا۔

---

[۱] الفخری۔ ص ۱۰۲ [۲] ابن خلدون۔ ص ۲۲۰ [۳] مقدمہ ابن خلدون۔ ص ۲۰۶۔

کسریٰ فارس کے پاس چار مہریں تھیں، ایک جنگ اور شرائط صلح کے لیے تھی جس پر "دفار" کندہ تھا، دوسری "خاتم خراج" تھی، جس پر لکھا تھا "آباد کرنا حکومت کو پائدار بنانا ہے"۔ تیسری ڈاک کی تھی، جس پر "عجلت اور تیز روی" کھدا تھا، اور چوتھی مہر عدالت تھی جس پر "عدل" کندہ تھا۔[1]

ایک اور اہم محکمہ "دیوان طراز" کا ذکر بھی غالباً بے محل نہ ہوگا۔

دیوانِ طراز | یہ دفتر شاہی پارچہ بافی اور ان کے اسماء اور القاب کو خوشنما بُننے کے لیے کارخانوں کا انتظام کرتا تھا۔ جب مسلمانوں نے روم و فارس کا تختہ اُلٹ دیا اور ان کا جاہ و جلال دنیا پر محیط ہوگیا اُس وقت مسلمانوں نے کسریٰ و قیصر کی تقلید کی اور شاہی لباس روم سے بن کر آنے لگا عبدالملک بن مروان کے زمانہ تک شاہی لباس روم سے آتا رہا۔ عبدالملک کے عہد خلافت میں یہ لباس مصر سے آنے لگا تھا، وہاں کے لباس میں، اب، ابن، روح القدس، نقش و نگار کی شکل میں بُنا ہوتا تھا عبدالملک جب اس کے معنی سے واقف ہوا تو اُسے گراں گذرا اور اُس نے اپنے بھائی عبدالعزیز بن مروان گورنر مصر کو لکھا کہ اب، ابن، روح القدس کی جگہ "لا الٰہ الا اللہ" نقش و نگار کی شکل میں بُنا جائے۔ اور اپنے حدود خلافت میں مصری پارچے پہننے اور اور خریدنے کی ممانعت کردی اور خلاف ورزی کی صورت میں سزائیں دی جانے لگیں۔

خلفاء نے اپنے دورِ حکومت میں پارچہ بافی کے کارخانے قائم کیے۔ جو ایک افسر کے ماتحت تھے، یہ افسر تانے بانے اور نقش و نگار کی دیکھ بال کرتا تھا۔ کاری گروں کی تنخواہوں کی تقسیم اور بندوبست بھی اسی کے ذمہ تھا، یہ کارخانے بنی امیہ اور بنی عباسیہ دونوں کے دوروں میں اوجِ کمال پر پہونچ گئے تھے۔

---

[1] کتاب الوزراء والکتّاب۔ ص-۳۰۔

مصری پارچے، جن پر "لا الہ الا اللہ" نقش ونگار کی شکل میں بُنا تھا، جب روم پہونچا تو شہنشاہ روم غیظ وغضب سے پیچ وتاب کھانے لگا۔ اور عبدالملک بن مروان کو لکھا، مصر کے کارخانوں سے روم کے منقش پارچوں کی صنعت کو سخت نقصان پہونچے گا۔ اس لیے مصری کارخانوں کو بند کر دیا جائے۔ عبدالملک نے اس درخواست کو ٹھکرا دیا اس کے بعد قیصر کی طرف سے دو تین بار پھر استدعا کی گئی۔ جس میں تہدید وترغیب دونوں قسم کے عناصر شامل تھے، آخر میں قیصر نے یہ دھمکی دی تھی کہ اگر آپ نے یہ کارخانے بند نہ کرا دیے تو محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں دیناروں میں ناپسندیدہ الفاظ کندہ کیے جائیں گے۔" عبدالملک کو اس سے روحانی اذیت پہونچی اور اس نے خالد بن یزید سے مشورہ کیا، اُس نے رائے دی" رومیوں کا سکّہ اسلامی دائرۂ حکومت میں ممنوع قرار دیجیے اور اپنا سکّہ رائج کر دیجیے۔ عبدالملک یہ مشورہ سُن کر بے حد خوش ہوا اور اسے بہت دعائیں دیں۔

رومیوں نے جب یہ دیکھا کہ عرب کاغذ کے سروں پر بعض آیاتِ قرآنی تحریر کر دیتے ہیں تو حکومتِ روما نے عربوں کے کاغذ کی درآمد بند کر دی، اس کی وجہ سے رومیوں اور عربوں کے تجارتی تعلقات اس وقت منقطع ہو گئے تھے۔

دفتری زبان کی تبدیلی

عبدالملک بن مروان (۶۵ھ ۸۶ھ) نے اپنی سیاسی پالیسی کے ماتحت دفتری زبان یونانی اور فارسی قرار دی تھی، عبدالملک نے دوسرا کام یہ کیا تھا کہ رومی سکّہ کو اپنے دائرۂ حکومت میں بند کر دیا تھا۔ جب قسطنطینِ چہارم اور گسنتیان دوم سے عبدالملک کی جنگ چھڑی اُس وقت سے تمام اسلامی قلمرو میں رومی سکّہ کی ممانعت کر دی گئی۔ کاغذات، فائل وغیرہ عبدالملک کے ابتدائی دور میں شام کے اندر یونانی زبان اور بلادِ فارس کے

اندر فارسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ لیکن یہ لڑائی چھڑنے کے بعد دفتری زبان عربی قرار نہ دی گئی تھی۔

دفاتر کی زبان عربی قرار دینے کا سیاسی اور ادبی دونوں حیثیت سے اثر پڑا اس کی وجہ سے ذمیوں اور غیر عربوں کا اقتدار دفتروں سے کم ہوگیا اور ان کے بڑے بڑے مناصب عربوں کو مل گئے۔ ادبی اثر یہ پڑا کہ بہت سی فارسی اور رومی اصطلاحات عربی زبان میں داخل ہوگئیں۔

عبدالملک کے گورنروں نے بھی عبدالملک کی سیاسی پالیسی پر عمل کیا اور حجاج بن یوسف نے بلادِ عراق کی دفتری زبان فارسی کی جگہ عربی ٹھہرا دی۔ یہ سنہ ۷۸ھ کا واقعہ ہے[1]

اس سے قبل مصر میں دو زبانیں دفتری تھیں، یونانی اور عربی۔ پہلی اس لیے کہ یہاں کی سرکاری زبان مدت سے یونانی تھی، اس زبان میں دفتر کی تمام کارروائیاں اور فائل تھے۔ دوسری زبان اس لیے کہ وہ حاکم وقت کی زبان تھی، محکمہ آثارِ قدیمہ کے لوگوں کو اس زمانہ کی چند تحریریں دستیاب ہوئی ہیں اس سے اندازہ کیا گیا ہے کہ اس وقت قبطی زبان کی حیثیت تیسرے درجہ کی تھی۔

شام و مصر میں دیوانِ خراج کی زبان فارسی اور یونانی عبدالملک بن مروان کے زمانہ تک رہی۔ عبدالملک نے فارس اور شام کے دفاتر کی زبان عربی کر دی، مصر کے دفاتر کی زبان یونانی ولید بن عبدالملک کے عہدِ خلافت تک رہی، ولید خلیفہ ہوا تو اس نے اپنے باپ کی سیاسی پالیسی پر عمل کیا اور دیوانِ خراج کی زبان بھی عربی قرار دی، اس کی اس سیاسی حکمت عملی کو اس کے گورنر عبداللہ بن عبدالملک گورنر مصر عمل میں لایا تھا یہ سنہ ۸۷ھ کا واقعہ ہے۔

[1] دیکھیے تفصیل کتاب الوزراء والکتاب، ص ۳۸۔

سکہ کی اصلاح

سنہ ۷۳ھ میں عبد الملک بن مروان داخلی نظم و نسق اور استحکامات سے فارغ ہوگیا تو رومیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور اُس معاہدہ کو باطل قرار دیدیا جس کی رُو سے اسے ایک ہزار دینار ہفتہ وار کے حساب سے شہنشاہِ روم کی حکومت کو دینا پڑتے تھے، عبد الملک نے غیر ملکی سکہ کی جگہ اپنا سکہ رائج کر دیا، اور اس مقصد کے لیے دمشق میں دار الضرب یا ٹکسال قائم کی۔ یہ سکّے سونے اور چاندی کے ہوتے تھے ان میں آیاتِ قرآنی نقش ہوتی تھیں، عبد الملک نے اپنے سکّہ کے علاوہ تمام دوسرے سکّے اسلامی قلمرو میں ممنوع قرار دیے، اس زمانہ تک مسلمانوں کے ملک میں بیزنطینی دینار اور ایرانی درہم رائج تھے، رومیوں نے جب دیکھا، ہمارا سکہ بند کر دیا گیا اور اپنے سکہ میں آیاتِ قرآنی نقش کر دیں اور ان سکّوں سے ہمارے ساتھ تبادلۂ اشیاء کا کام لیتے ہیں تو انہیں بے حد روحانی کوفت ہوئی اور اسے اپنی حد درجہ بے عزتی خیال کی، یہ احساس بڑھتا رہا اور مستقبل میں اس باہمی کشمکش کا یہ نتیجہ ہوا کہ عربوں اور رومیوں میں جنگ چھڑ گئی۔

دفاتر عہد عباسیہ میں

عہدِ عباسیہ کا نظم و نسق تقسیم کار کے لحاظ سے عہدِ جدید کے نظام سے بہت بہتر تھا، اس دور میں اہم سرکاری دفاتر اور وزارتیں حسب ذیل تھیں۔

دیوانِ خراج، دیوانِ دیۃ، دیوانِ زمام، دیوانِ فوج، دیوانِ موالی و غلام۔ اس میں خلیفہ کے غلاموں کی فہرست رہتی تھی، محکمہ ڈاک، محکمہ زمام نفقات، دیوانِ رسائل، محکمہ تحقیقاتِ مظالم، محکمہ پولیس، محکمہ عطایا و وظائف، ان کے علاوہ ایک مستقل محکمہ

غیر مسلم قوموں کے حقوق کی حفاظت کے لیے قائم تھا، اس کے افسر کو کاتب جہاز کہا جاتا تھا۔

ان بڑے دفاتر کے علاوہ اور بہت سے چھوٹے چھوٹے محکمے تھے، جن کا تعلق تنظیم ملکی، سیاسی انتظامات، اور عدالت سے تھا، ایک محکمہ نہریں جاری کرنے پل تعمیر کرنے اور آب پاشی کی دوسری آسانیاں مہیّا کرنے کے لیے قائم تھا۔

حکومتِ عباسیہ جماعتی معاملات میں زیادہ دخل نہ دیتی تھی، اگرچہ اس پالیسی کی وجہ سے اکثر حکومت کو مالی نقصان بھی اُٹھانا پڑتا تھا، ہاں عباسیہ حکومت ٹیکس کی عدم ادائیگی کے وقت ضرور دخل دیتی، حکومت عباسیہ زراعتی اور آبپاشی کی سہولتوں کے مہیّا کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھتی، اس کا مقصد حکومت کی آمدنی میں اضافہ بھی ہوتا تھا، حضرت امام ابو یوسفؒ قاضی القضاہ نے نہروں کے کھودنے ان کی اصلاح و مرمت، کھیتوں میں پانی کی تقسیم کی نگرانی اور زراعت کی ترقی کی دوسری عملی تدابیر اختیار کی تھیں۔ حضرت امام ابو یوسفؒ نے دریاؤں خصوصًا دجلہ و فرات کے پانی کے کھاری پن کو دور کرنے کے لیے بھی عملی قدم اُٹھایا، یہ کھاری پن کاشت کے لیے سخت مضر ثابت ہوتا تھا۔

دیوانِ زمام (جو اس زمانہ کے دیوانِ محاسبی سے مشابہ تھا۔) کا محکمہ نہایت اہم محکمہ تھا، اسے خلیفہ مہدی نے قائم کیا تھا، اس محکمے کے افسر کا فرض بلادِ عراق اور دوسرے ملکوں کے ٹیکس کی وصولی اور ان کے حسابات پیش کرنا تھا، نوعی ٹیکس (غلّہ اور پیداوار کی شکل میں ٹیکس) کی وصولی اور اس کا انتظام بھی اس کے فرائض میں داخل تھا، اہم محکموں میں ایک محکمہ دیوانِ رسائل بھی تھا جس کے افسر کا کام سرکاری احکام کی تشہیر، سیاسی خطوط کی کتابت، اور ان پر خاتم خلافت ثبت کرنا ہوتا تھا۔[1]

---

[1] SAYED AMEER ALI, P. 415.

دیوانِ زمام ایک بہت بڑا محکمہ تھا، اس کے افسر نے سہولت کے لیے اسے بہت سے چھوٹے چھوٹے محکموں میں تقسیم کر دیا تھا، ان محکموں کا ایک ایک افسر یا نگراں ہوتا تھا، عباسیوں نے ایک اور محکمہ "دیوانِ نظر یا مکاتبات اور مراجعات" کے نام سے قائم کیا تھا، یہ چار حصوں میں تقسیم تھا، دیوانِ فوج، اس میں سپاہیوں کے نام اور ان کی تنخواہوں کے حسابات رکھے جاتے تھے۔

دیوان الاعمال، اس کے ذمہ قومی روایات اور حقوق کی حفاظت ہوتی تھی۔

دیوانِ عمال، اس محکمہ کے ذریعہ گورنروں کا عزل و نصب ہوتا تھا۔

دیوانِ بیت المال۔ اس میں مالیات کے آمد و خرچ کا حساب رکھا جاتا تھا،

(۳) فوج

جہاد اور اُس کا مقصد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ سال مکہ میں لوگوں کو قرآن اور نیک اعمال کی دعوت دیتے رہے، قریش نے اس کا جواب طرح طرح کی تکلیفوں کی شکل میں دیا، خدا نے ان اذیتوں[1] پر آپؐ کو صبر و ضبط کی نصیحت فرمائی اور مزید تسکین کے لیے ارباب صبر کی حکایات بیان فرمائیں۔

جب آنحضرتؐ اور صحابہؓ کے ساتھ قریش کی زیادتیاں حد سے بڑھ گئیں تو خدا نے آپؐ کو مشرکین سے "جہاد" کا حکم دیا، یہ خدا کے راستہ میں جنگ تھی اور صرف خدا کے واسطے تھی، خدا نے جہاد کا یہ حکم چند آیات کے ذریعہ دیا، جن میں سے بعض مکہ میں اور بعض مدینہ میں نازل ہوئیں۔ جہاد کی اجازت چند حالات میں دی گئی۔

(۱) جان کی حفاظت کے لیے،

جن (مومنوں) کے خلاف ظالموں نے جنگ کر رکھی ہے اب انہیں (اس کے جواب میں) جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔ کیونکہ ان پر سراسر ظلم ہو رہا ہے، اور اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے۔

یہ وہ مظلوم ہیں جو ناحق اپنے گھروں سے نکال دیے گئے، ان کا کوئی جرم نہ تھا، اگر تھا تو یہ تھا، کہ وہ کہتے تھے ہمارا پروردگار اللہ ہے۔

(آیت ۳۹۔ سورہ حج)

[1] آیۃ ۳۵۔ سورۃ

اور (دیکھو) جو لوگ تم سے جنگ کر رہے ہیں اللہ کی راہ میں تم بھی اُن سے لڑو، (پیٹھ نہ دکھلاؤ) البتہ کسی طرح کی زیادتی نہ کرو۔ اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو زیادتی کرنے والے ہیں۔ . . . .

اور دیکھو ان لوگوں سے جنگ جاری رکھو۔ یہاں تک کہ فتنہ (یعنی ظلم و فساد) باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو جائے (انسانی ظلم و استبداد کی مداخلت اس میں باقی نہ رہے) پھر اگر ایسا ہو کہ یہ لوگ جنگ سے باز آ جائیں تو تمہیں بھی ہاتھ روک لینا چاہیے۔ کیونکہ) جنگ کا مقصد تشدد کرنا نہیں ہے، مگر صرف انہیں لوگوں کے مقابلہ میں جو ظلم کرنے والے ہیں۔

(سورۂ بقرہ آیۃ ۱۸۶ - ۱۸۹)

(۲) دعوتِ اسلام کے راستہ سے رکاوٹیں دور کرنا، تاکہ جو لوگ اسلام لانا چاہیں انہیں کوئی روکنے اور ان پر سختی کرنے والا نہ رہے اور حضرت عمار بن یاسرؓ اور حضرت بلالؓ کے واقعات کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے۔ جب اہلِ مکہ کے ساتھ دوسرے عربوں نے اشتراکِ عمل کیا تو خدا نے حکم دیا "تمام مشرکین سے جنگ کرو۔ جس طرح وہ تم سے برسرِ پیکار ہیں[1] جب یہودِ مدینہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیے ہوئے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور آپ کے حریف قریش سے عملی اشتراک کیا تو حکم ہوا

اگر ایک گروہ (ابھی میدانِ جنگ میں تو دشمنوں کے ساتھ نہیں نکلا لیکن (اس) سے تمہیں دغا کا اندیشہ ہے تو چاہیے اُن کا عہد اُنہیں پر اُلٹا دو۔ (فسخ کر دو۔)

جہاد کے بدلے میں مسلمانوں کو دنیا میں فتح و کامرانی اور آخرت میں بہشت کی بشارت دی گئی۔

---

[1] آیۃ ۳۶ سورۂ توبہ۔ [2] آیۃ ۵۸ سورۂ انفال۔

جو لوگ آخرت کے بدلہ دنیا کی زندگی (اللہ کے ہاتھ) فروخت کر چکے
ہیں، انہیں چاہیے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کریں اور جو کوئی اللہ کی راہ میں
جنگ کرتا ہے تو خواہ وہ قتل ہوجائے خواہ غالب آئے (ہر حال میں)
ہم اُسے اجرِ عظیم عطا فرمائیں گے۔

(سورہ نساء۔ آیۃ ۷۶)

عرب کے سپاہی کا اہم مقصد فتنہ و فساد، شورش اور بغاوت کو فرو کرنا، غارت گروں سے ملک کو بچانا، ارکانِ اسلام کا قیام اور ناموسِ دین کا تحفظ اور اسلامی دائرۂ عمل کی توسیع تھا اور اسی کے لیے وہ اسلحہ اُٹھاتا تھا۔

فوج آنحضرت صلعم، خلافتِ راشدہ اور بنی امیہ کے زمانہ میں

عہدِ جاہلیت میں عربوں کا کوئی خاص فوجی نظام نہ تھا، اس زمانہ میں تہذیب و تمدن کے لحاظ سے ان کی سطح بہت پست تھی، جنگ کے وقت قبیلہ کے افراد، پیدل، اور سوار، تلواریں، نیزے اور کمانیں لے کر نکلتے اور حریف سے مقابلہ کرتے، جنگ کے خاتمہ کے بعد اپنے اپنے گھروں کو واپس آجاتے اور اپنے کاروبار میں لگ جاتے تھے۔

جب اسلام کا ظہور ہوا تو اس نے عربوں کی شیرازہ بندی کی اور ان میں مرکزی وحدت پیدا کر دی، اب عرب اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے جنگ کرنے لگے اور اسلامی دائرۂ عمل کو وسیع کرنے کے لیے اقوامِ غیر پر چڑھائی شروع کر دی، حضرت عمرؓ سب سے پہلے شخص تھے، جنہوں نے فوج کو ایک منظم شکل دی اور فوجی نظم و نسق کے لیے دیوانِ فوج قائم کی، اس محکمہ کے فرائض میں سپاہیوں کے نام، ان کے اوصاف اُن کی تنخواہوں کی مقدار اور اُن کے کارناموں کے بارے میں مکمل معلومات بہم پہونچانا اور دوسرے انتظامی معاملات داخل تھے، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جنگ مذہبی جذبہ اور اسلام کے لیے ہوتی تھی۔ اس فرض کو مسلمان سپاہی بلا تنخواہ انجام دیتے تھے،

فوجی دفتر کا افسر، اس کے سامنے فوجیں اور گھوڑے وغیرہ پیش کیے جاتے تھے دفتر لباس، فوجوں کی وردیوں وغیرہ کا انتظام اس کے سپرد تھا، افسر دیوانی اوقاف، افسر مشاہرہ، یہ محکمہ تنخواہوں کو تقسیم کرتا اور ملازموں کی تنخواہیں، کارگذاریوں کی سالانہ رپورٹ مرتب کرتا تھا، یہ رپورٹ خلیفہ کے سامنے پیش کی جاتی تھی[۱]

اس دور کے بڑے بڑے عہدہ داروں میں "صاحب الباب" (شاہی دربان) "حامل مظلۃ الخلیفہ" (چھتری بردار) "صاحب رسالہ" (خلیفہ کے خطوط وزیر اور دوسرے اعلیٰ عہدہ داروں کے پاس پہونچاتا تھا) "افسر مالیات" (عہدِ حاضر کا وزیر مالیات) اور "حامل دواۃ خلیفہ" تھے۔ مذہبی اعلیٰ عہدہ داروں میں قابلِ ذکر یہ تھے "قاضی القضاۃ" اس کا فرض احکامِ شرعیہ کا تحفظ اور سکّہ کی نگرانی بھی تھا، "داعی الدعاۃ" قاضی القضاۃ کے قریب قریب ہم رتبہ ہوتا تھا، اس کا منصبی فرض مساجد اور مدارس میں فاطمیوں کی دعوت وتبلیغ کرنا تھا۔ "محتسب" اس کا فرض بازاروں کی نگرانی تھا، یہ قوانینِ بیع وشرا کی پابندی کراتا تھا، پیمانوں اور وزنوں کی جانچ کرتا تھا۔ قرضوں کو وصول کراتا تھا اور قیام امن کے لیے مناسب تدابیر اور کارروائیاں عمل میں لاتا تھا۔ یہ ممتاز اور سربرآوردہ مسلمانوں میں سے منتخب ہوتا تھا، یہ عہدہ بڑی حد تک مذہبی خیال کیا جاتا تھا۔ اس کی تنخواہ تیس دینار یا ۱۵۰ روپیہ ہوتی تھی۔ عہدِ فاطمی میں بڑے عہدہ داروں میں "وکیل بیت المال" اور "نائب صاحب الباب" بھی تھا، اس کا کام سفیروں کا استقبال اور ان کے رہنے سہنے کا انتظام تھا۔ اس عہد میں قاریوں کی ایک بہت بڑی تعداد ملازم تھی، جو مجلس اور جلوس کے وقت خلیفہ کے سامنے قرآن کی تلاوت کرتے، انہیں "قراء الحضرۃ" کہا جاتا تھا۔

مملوکوں کے عہد میں

مملوکوں کے زمانہ میں مصر کے نظام حکومت میں نمایاں تغیرات ہوئے بیبرس نے حکومت کے نظم ونسق میں مقربینِ بارگاہ امراء سے امداد لی

[۱] تفصیل دیکھو الخطط۔ ج ۲۔ ص ۹۹۔

اوران کا بڑے بڑے مناصب پر تقرر کیا، نائب السلطان کا جدید عہدہ قائم کیا گیا، جس کی بنیاد دولتِ ایوبیہ نے ڈالی تھی، اس کی ضرورت اس لیے پڑی تھی کہ جنگوں کی وجہ سے اس زمانہ میں سلطان اکثر دارالحکومت سے باہر رہتا، اس اثناء میں حکومت کے نظم ونسق میں دقت ہوتی تھی، اس عہدہ کے قیام کے بعد جب سلطان خارجی حکومتوں سے نبرد آزما ہوتا تو نائب السلطان سلطان کی جگہ ریاست کا انتظام چلاتا تھا، اسے سیاسی فرماں روائی حاصل تھی اور وہ جاگیریں دینے اور سلطان کی طرح اعلیٰ عہدوں پر تقرر کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔[1]

اس دور میں وزارت عظمیٰ کا اثر و نفوذ نائب السلطان کی وجہ سے کبھی بڑھ نہ سکا تھا، سلطان کے ساتھ سفر میں ایک دوسرا وزیر رہتا تھا جو "وزیر الصحبہ" کے نام سے معروف تھا۔ وزارت کے عہدہ کو ناصر بن محمد قلاوون نے توڑ دیا تھا، اور حکومت کے نظم ونسق میں "ناظر الدولۃ" سے امداد لیتا تھا جس کی حیثیت وزیر سے کم تھی، اس کا عملہ "مستوفین" کے نام سے موسوم تھا، عملہ کے نگراں افسر کو "مستوفی الصحبہ" سے خطاب کیا جاتا تھا۔ یہ افسر چھوٹے چھوٹے ملازمین کا تقرر کر سکتا تھا۔

ناصر بن محمد قلاوون نے نائب السلطان کا عہدہ بھی ختم کر دیا تھا اور ایک جدید عہدہ "ناظر الخاصہ" قائم کیا تھا، ابتداء میں یہ عہدہ دار سلطانی مال و دولت کے انتظامات کے لیے مامور کیا گیا تھا، مگر قرب سلطانی کی وجہ سے اس کی حیثیت بہت بڑھ گئی تھی، اور سلطان اسے مشورہ میں شریک کرنے لگا تھا۔[2]

بیبرس نے اپنے دربار میں بہت سے عہدہ داروں کا اضافہ کیا تھا۔ ان میں ممتاز "استادار، دوادار، اور امیر جاندار" تھے۔ پہلے کا کام سلطانی محلات کا انتظام اور دوسرے کا فرض خطوط کو سلطان کی خدمت میں پیش کرنا اور کاغذات پر دستخط کرانا تھا، تیسرا سلطان

---

[1] حسن المحاضرہ (سیوطیؒ) ج ۲۔ ص ۸۴۔ [2] ایضاً

کے دروازہ پر متعین تھا اور حکومت کے اعلیٰ افسروں اور ارکانِ دولت کا استقبال کرتا تھا۔[١]

مملوکوں کے عہد میں اور بھی بہت سے عہدے قائم تھے، ان میں "راس نوبۃ الامراء" امیر مجلس اور امیر السلام خاص اہمیت رکھتے تھے۔ "راس نوبۃ الامراء" امراء دولت کا افسر تھا۔ امیر مجلس کا فرض سلطان کی حفاظت تھا۔ اس کا تقرب اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ اندرونِ قصر بھی حفاظت کے لیے ساتھ جاتا تھا حتیٰ کہ اس کے سونے اور آرام کرنے کے کمرہ میں بھی اس کے ہمراہ رہتا تھا۔ امیر السلام کا فرض اسلحہ جات، میگزین اور سامان جنگ کا انتظام اور اس کی نگرانی تھا۔[٢]

سلطان کی طرف سے مصر کے مختلف صوبوں میں گورنر مامور تھے، ان کا منصبی فرض سلطانی احکام کا نفاذ اور خراج اور چنگی وصول کرنا تھا۔ اسکندریہ... اس وقت نہایت اہم تجارتی بندرگاہ تھی۔ مشرق کی تجارت کا محور اس وقت عیذاب کی سرحد تھی، جو بحرِ احمر کی ایک مصری سرحد تھی۔ سمندر کے محاذ کا علاقہ چند صوبوں میں تقسیم تھا۔ ان میں اہم صوبے، قوص، اشمونین۔ بھنسا اور الجیزہ تھے، ساحلی علاقہ کے اہم صوبے بلبیس، منوف محلہ الکبریٰ، منہور، تلیوب اور دمیاط تھے۔[٣]

اس دور کے ممتاز عہدوں میں ایک "ولایۃ" کا عہدہ بھی تھا، صدرِ اسلام میں یہ "شرطہ" کے نام سے معروف تھا۔[٤] اس عہدہ دار کا فرضِ منصبی امن و امان کا قیام، مجرموں اور قاتلوں کی گرفتاری اور انہیں کیفر کردار کو پہونچانا اور وہ تمام فرائض تھے جن کا تعلق رعایا کی فلاح و بہبود اور حفظِ جان و مال سے تھا۔ اس منصب کی ذمہ داریاں تین امراء میں تقسیم تھیں۔ ایک کے ذمہ قاہرہ کا قیام امن اور پبلک کی دشواریاں رفع کرنا تھا۔ دوسرے

---

[١] الخطط (مقریزی) ج ٢۔ ص ٢٢٢ [٢] صبح الاعشیٰ ج ٤۔ ص ١٨ [٣] ایضاً ص ٢٦-٢٨
[٤] مقریزی۔ ج ٢ ص ٢٢٣۔

کے یہی فرائض فسطاط میں تھے، تیسرے[1] کے فرائض جنازوں کے جلوس کے وقت نظام کو قائم رکھنا اور قبروں کی زیارت کے وقت عام آداب کا تحفظ، عیدوں اور تقریب حج کے موقعہ پر انتظامات اور کفن چوروں سے قبروں کی حفاظت تھی[2]

قاہرہ کے کوتوال یا صاحب عسس کے سپرد فائر بریگیڈ کا عملہ بھی تھا۔ یہ عموماً عشاء کی نماز کے بعد فائر بریگیڈ کے ہیڈ کوارٹر میں آجاتا تھا، اس کے سامنے مشعل رکھی جاتی تھی جو رات بھر روشن رہتی تھی۔ اس وقت سقّے، بڑھئی وغیرہ موجود رہتے تھے۔ اگر کہیں آگ لگ جاتی تھی تو بجھانے کے لیے یہ عملہ دوڑ پڑتا تھا[3] یہ فائر بریگیڈ کا اسٹیشن "سوق حمالون کبیر" میں واقع تھا۔

---

[1] صبح الاعشیٰ۔ ج ۴۔ ص ۲۳ [2] الظاہر بیبرس (جمال الدین سرور) ص ۱۳۴

[3] الخطط۔ ج ۲۔ ص ۱۰۳

دفاتر

(۱) دفاتر، خلافتِ راشدہ میں

حضرت عمرؓ نے ایک ایرانی مدبر کے مشورہ سے دفتری نظام قائم کیا تھا، یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب فتوحاتِ اسلامیہ کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا تھا، اور فارس کی بے شمار دولت کی تقسیم اور اُس کے صرف کی ضرورت پیش آئی تھی۔ حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے "صرف دولت" کو ایک منظم شکل دینے کے لیے دفاتر کو قائم کیا اور ہر مسلمان کا وظیفہ اور تنخواہ مقرر کر دی۔ اس میں اسلام کی سبقت اور اسلامی خدمات کا لحاظ رکھا تھا۔ دفاتر کے عملہ نے اسی زاویۂ نگاہ سے مختلف افراد اور طبقوں کی ایک فہرست مرتب کی تھی، اس میں سب سے پہلے حضرت عباسؓ عمِ آنحضرتؐ کا نام تھا۔ پھر بنی ہاشم اور دوسرے حضرات کے نام تھے۔ حضرت عثمانؓ کے ابتدائی دورِ خلافت تک وظائف کا یہی لائحہ عمل تھا۔ بعد میں اس میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوگئی تھی[۱]

حضرتِ عمرؓ نے دفتری نظام ایرانیوں کے طرز پر قائم کیا تھا، یہ دفاتر مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے تھے، ان میں دیوانِ فوج اور دیوانِ خراج امتیازی حیثیت کے حامل تھے دیوانِ فوج میں سپاہیوں اور اُن کی تنخواہوں کی باقاعدہ فہرست رہتی تھی، دیوانِ خراج میں ریاست کی آمدنی اور اُس کے آمد و صرف کا حساب رہتا تھا۔

---

[۱] الفخری۔ ص ۷۹۔ ۸۰ اور تفصیل دیکھو الاحکام السلطانیہ۔ ص ۱۹۱ و الوزراء والکتاب ص ۱۶۔ ۱۷

دفاتر عہد بنی امیہ میں

تعدادِ دفاتر | عہد بنی امیہ میں حکومت کا نظام چار بڑے بڑے محکموں میں تقسیم تھا۔

(۱) دیوانِ خراج۔

(۲) دیوانِ رسل و رسائل، اس کا افسر صوبوں کے نظم و نسق کی نگرانی اور گورنروں کے نام مناسب ہدایات بھیجتا تھا۔

(۳) غلّہ اور دوسری پیداوار کے انتظامات کا محکمہ۔

(۴) دیوانِ خاتم، اس کو سب سے پہلے امیر معاویہؓ نے قائم کیا تھا، حکومت کا یہ سب سے بڑا دفتر تھا، اس میں بہت سے ذمہ دار اشخاص کام کرتے تھے۔ یہ لوگ خلیفہ کے احکام کی نقلیں لیتے اور تاگے سے نتھی کرنے کے بعد ان پر لاکھ کی مہر لگاتے اور پھر یہ احکامات اس محکمہ کے افسر کی مہر ثبت کرنے کے بعد نہایت احتیاط سے دفتر میں محفوظ کر دیئے جاتے تھے۔ اس دیوان کی حیثیت عہد جدید کے "رکارڈ آفس" کی تھی۔

ان دفتروں کے علاوہ اور بھی محکمے تھے جن کی اہمیت ان سے کم تھی۔ ان میں پولیس کے اخراجات وغیرہ اور فوج کی تنخواہوں سے متعلق دفاتر ممتاز درجہ رکھتے تھے، بے محل نہ ہوگا اگر دیوانِ خاتم کا ذرا تفصیلی ذکر کر دیا جائے۔

دیوانِ خاتم | اس کے قیام کی ضرورت سب سے پہلے حضرت امیر معاویہؓ نے محسوس کی تھی، وجہ یہ ہوئی کہ امیر معاویہؓ نے اپنے گورنر عراق زیاد بن ربیعہ کے پاس ایک شخص کو ایک لاکھ درہم دینے کے لیے خط دیا تھا۔ اس خط پر مہر نہ تھی۔ اس شخص نے اسے پڑھا اور ایک لاکھ کی جگہ دو لاکھ بنا دیئے اور یہ رقم حاصل کر لی۔ زیاد نے جب اس کا

حساب امیر معاویہؓ کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے کہا میں نے ایک لاکھ کے لیے لکھا تھا، اس واقعہ کے بعد دیوانِ خاتم قائم کر دیا گیا اور اس کے بعد مہر شدہ خطوط جانے لگے تھے۔[۱]

خطوط اور دستاویزوں پر مہر کا رواج مسلمانوں میں امیر معاویہؓ سے قبل بھی پایا جاتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرقل (قیصر روم) کے پاس مہر شدہ والا نامہ بھیجا تھا۔ کیونکہ آپؐ کو معلوم ہوا تھا کہ قیصر روم بے مہر کے خطوط قبول نہیں کرتا ہے۔ اس غرض کے لیے آپؐ نے چاندی کی ایک مہر بنوائی تھی اور اس میں "محمد رسول اللہ" کندہ کرایا تھا، اسی مہر سے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ مہر ثبت کرتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے یہ مہر ایک کنویں میں گر پڑی تھی اس کے بعد آپ نے اسی نمونہ کی دوسری بنوائی تھی[۲] دولتِ عباسیہ میں "خاتم سلطان" سے خطوط پر مہر لگائی جاتی تھی۔ یہ مہر سرخ گیلی مٹی سے مس کر کے کاغذات کی تہ کرنے اور جوڑنے کے بعد ایک کونہ پر لگا دی جاتی تھی[۳]

دیوانِ خاتم امیر معاویہؓ کے زمانہ سے لے کر عہدِ عباسیہ کے وسط تک بہت اہم دیوان خیال کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد جب نظم و نسق وزراء کے ہاتھ میں چلا گیا تو یہ محکمہ توڑ دیا گیا، عباسیہ کے دورِ عروج میں مہرِ خلافت کا حد درجہ احترام کیا جاتا تھا، ہارون رشید نے جب فضل کی جگہ اس کے بھائی جعفر کو قلمدانِ وزارت سونپا تھا، اُس وقت اُس نے اُن کے باپ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا "ابا جان! میرا ارادہ ہے کہ خاتم کو دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ میں تبدیل کر دوں" خاتم سے ہارون نے وزارت کی طرف اشارہ کیا تھا، خاتم کا اتنا پاسِ ادب تھا کہ جب وزیر کو مہر لگانے کے لیے دی جاتی تھی تو وہ اس کے احترام میں کھڑا ہو جاتا تھا۔

---

[۱] الفخری۔ ص ۱۰۲ [۲] ابن خلدون۔ ص ۲۲۰ [۳] مقدمہ ابن خلدون۔ ص ۲۰۶۔

کسریٰ فارس کے پاس چار مہریں تھیں، ایک جنگ اور شرائط صلح کے لیے تھی جس پر "وقار" کندہ تھا، دوسری خاتم خراج" تھی جس پر لکھا تھا" آباد کرنا حکومت کو پائدار بنانا ہے"۔ تیسری ڈاک کی تھی، جس پر "عجلت اور تیز روی" کھدا تھا، اور چوتھی مہر عدالت تھی جس پر "عدل" کندہ تھا۔[۱]

ایک اور اہم محکمہ" دیوانِ طراز" کا ذکر بھی غالباً بے محل نہ ہوگا۔

دیوانِ طراز یہ دفتر شاہی پارچہ بافی اور ان کے اسمار اور القاب کو خوشنما بُننے کے لیے کارخانوں کا انتظام کرتا تھا۔ جب مسلمانوں نے روم و فارس کا تختہ اُلٹ دیا اور ان کا جاہ و جلال دنیا پر محیط ہو گیا اُس وقت مسلمانوں نے کسریٰ و قیصر کی تقلید کی اور شاہی لباس روم سے بن کر آنے لگا عبد الملک بن مروان کے زمانہ تک شاہی لباس روم سے آتا رہا۔ عبد الملک کے عہد خلافت میں یہ لباس مصر سے آنے لگا تھا، وہاں کے لباس میں، اب' ابن' روح القدس، نقش و نگار کی شکل میں بُنا ہوتا تھا عبد الملک جب اس کے معنی سے واقف ہوا تو اُسے گراں گذرا اور اُس نے اپنے بھائی عبد العزیز بن مروان گورنر مصر کو لکھا کہ، اب، ابن، روح القدس کی جگہ" لا الہ الا اللہ" نقش و نگار کی شکل میں بُنا جائے۔ اور اپنے حدود خلافت میں مصری پارچے پہننے اور اور خریدنے کی ممانعت کر دی اور خلاف ورزی کی صورت میں سزائیں دی جانے لگیں۔

خلفار نے اپنے دورِ حکومت میں پارچہ بافی کے کارخانے قائم کیے۔ جو ایک افسر کے ماتحت تھے، یہ افسر تانے بانے اور نقش و نگار کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ کاری گروں کی تنخواہوں کی تقسیم اور بندوبست بھی اسی کے ذمہ تھا، یہ کارخانے بنی امیہ اور بنی عباسیہ دونوں کے دوروں میں اوجِ کمال پر پہونچ گئے تھے۔

---

[۱] کتاب الرزراء والکتاب۔ ص۔ ۳۰۔

مصری پارچے، جن پر "لاالہ الااللہ" نقش ونگار کی شکل میں بُنا تھا، جب روم پہونچا تو شہنشاہِ روم غیظ وغضب سے پیچ وتاؤ کھانے لگا۔ اور عبدالملک بن مروان کو لکھا، مصر کے کارخانوں سے روم کے منقش پارچوں کی صنعت کو سخت نقصان پہونچے گا۔ اس لیے مصری کارخانوں کو بند کردیا جائے۔ عبدالملک نے اس درخواست کو ٹھکرادیا اس کے بعد قیصر کی طرف سے دو تین بار پھر استدعا کی گئی۔ جس میں تہدید وترغیب دونوں قسم کے عناصر شامل تھے، آخر میں قیصر نے یہ دھمکی دی تھی کہ اگر آپ نے یہ کارخانے بند نہ کرا دیے تو محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں دیناروں میں ناپسندیدہ الفاظ کندہ کیے جائیں گے۔" عبدالملک کو اس سے روحانی اذیت پہونچی اور اس نے خالد بن یزید سے مشورہ کیا، اُس نے رائے دی "رومیوں کا سکہ اسلامی دائرۂ حکومت میں ممنوع قرار دیجیے اور اپنا سکہ رائج کر دیجیے۔ عبدالملک یہ مشورہ سُن کر بے حد خوش ہوا اور اسے بہت دعائیں دیں۔

رومیوں نے جب یہ دیکھا کہ عرب کاغذ کے سروں پر بعض آیاتِ قرآنی تحریر کر دیتے ہیں تو حکومت روما نے عربوں کے کاغذ کی درآمد بند کردی، اس کی وجہ سے رومیوں اور عربوں کے تجارتی تعلقات اس وقت منقطع ہو گئے تھے۔

دفتری زبان کی تبدیلی

عبدالملک بن مروان (۶۵ھ ۸۶ھ) نے اپنی سیاسی پالیسی کے ماتحت دفتری زبان یونانی اور فارسی قرار دی تھی، عبدالملک نے دوسرا کام یہ کیا تھا کہ رومی سکہ کو اپنے دائرۂ حکومت میں بند کردیا تھا۔ جب قسطنطین چہارم اور گسنیان روم سے عبدالملک کی جنگ چھڑی اُس وقت سے تمام اسلامی قلمرو میں رومی سکہ کی ممانعت کردی گئی۔ کاغذات، فائل وغیرہ عبدالملک کے ابتدائی دور میں شام کے اندر یونانی زبان اور بلادِ فارس کے

اندر فارسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ لیکن یہ لڑائی چھڑنے کے بعد دفتری زبان عربی قرار دیدی گئی تھی۔

دفاتر کی زبان عربی قرار دینے کا سیاسی اور ادبی دونوں حیثیت سے اثر پڑا اس کی وجہ سے ذمیوں اور غیر عربوں کا اقتدار دفتروں سے کم ہوگیا اور ان کے بڑے بڑے مناصب عربوں کو مل گئے۔ ادبی اثر یہ پڑا کہ بہت سی فارسی اور رومی اصطلاحات عربی زبان میں داخل ہوگئیں۔

عبد الملک کے گورنروں نے بھی عبد الملک کی سیاسی پالیسی پر عمل کیا اور حجاج بن یوسف نے بلادِ عراق کی دفتری زبان فارسی کی جگہ عربی قرار دی۔ یہ سنہ ۷۸ھ کا واقعہ ہے[1]

اس سے قبل مصر میں دو زبانیں دفتری تھیں، یونانی اور عربی۔ پہلی اس لیے کہ یہاں کی سرکاری زبان مدت سے یونانی تھی، اس زبان میں دفتر کی تمام کارروائیاں اور فائل تھے۔ دوسری زبان اس لیے کہ وہ حاکم وقت کی زبان تھی، محکمہ آثارِ قدیمہ کے لوگوں کو اس زمانہ کی چند تحریریں دستیاب ہوئی ہیں اس سے اندازہ کیا گیا ہے کہ اس وقت قبطی زبان کی حیثیت تیسرے درجہ کی تھی۔

شام و مصر میں دیوانِ خراج کی زبان فارسی اور یونانی عبد الملک بن مروان کے زمانہ تک رہی۔ عبد الملک نے فارس اور شام کے دفاتر کی زبان عربی کر دی، مصر کے دفاتر کی زبان یونانی ولید بن عبد الملک کے عہدِ خلافت تک رہی، ولید خلیفہ ہوا تو اس نے اپنے باپ کی سیاسی پالیسی پر عمل کیا اور دیوانِ خراج کی زبان بھی عربی قرار دی، اس کی اس سیاسی حکمت عملی کو اس کے گورنر عبد اللہ بن عبد الملک گورنر مصر عمل میں لایا تھا یہ سنہ ۸۷ھ کا واقعہ ہے۔

[1] دیکھیے تفصیل کتاب الوزراء والکتاب، ص ۳۸۔

سکہ کی اصلاح

۷۳ھ میں عبد الملک بن مروان داخلی نظم و نسق اور استحکامات سے فارغ ہوگیا تو رومیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور اُس معاہدہ کو باطل قرار دیدیا جس کی رُو سے اسے ایک ہزار دینار ہفتہ وار کے حساب سے شہنشاہِ روم کی حکومت کو دینا پڑتے تھے، عبد الملک نے غیر ملکی سکہ کی جگہ اپنا سکہ رائج کر دیا، اور اس مقصد کے لیے دمشق میں دار الضرب یا ٹکسال قائم کی۔ یہ سکے سونے اور چاندی کے ہوتے تھے ان میں آیاتِ قرآنی نقش ہوتی تھیں، عبد الملک نے اپنے سکہ کے علاوہ تمام دوسرے سکے اسلامی قلمرو میں ممنوع قرار دیے، اس زمانہ تک مسلمانوں کے ملک میں بیزنطینی دینار اور ایرانی درہم رائج تھے، رومیوں نے جب دیکھا، ہمارا سکہ بند کر دیا گیا اور اپنے سکہ میں آیاتِ قرآنی نقش کر دیں اور ان سکوں سے ہمارے ساتھ تبادلۂ اشیاء کا کام لیتے ہیں تو انہیں بے حد روحانی کوفت ہوئی اور اسے اپنی حد درجہ بے عزتی خیال کی، یہ احساس بڑھتا رہا اور مستقبل میں اس باہمی کشمکش کا یہ نتیجہ ہوا کہ عربوں اور رومیوں میں جنگ چھڑ گئی۔

دفاتر عہد عباسیہ میں

عہدِ عباسیہ کا نظم و نسق تقسیمِ کار کے لحاظ سے عہدِ جدید کے نظام سے بہت بہتر تھا، اس دور میں اہم سرکاری دفاتر اور وزارتیں حسبِ ذیل تھیں۔

دیوانِ خراج، دیوانِ دیۃ، دیوانِ زمام، دیوانِ فوج، دیوانِ موالی و غلام، اس میں خلیفہ کے غلاموں کی فہرست رہتی تھی، محکمۂ ڈاک، محکمۂ زمام نفقات، دیوانِ رسائل، محکمۂ تحقیقاتِ مظالم، محکمۂ پولیس، محکمۂ عطایہ و ظائف، ان کے علاوہ ایک مستقل محکمہ

غیر مسلم قوموں کے حقوق کی حفاظت کے لیے قائم تھا، اس کے افسر کو کاتب جہابذہ کہا جاتا تھا۔

ان بڑے دفاتر کے علاوہ اور بہت سے چھوٹے چھوٹے محکمے تھے، جن کا تعلق تنظیم ملکی، سیاسی انتظامات، اور عدالت سے تھا، ایک محکمہ نہریں جاری کرنے پُل تعمیر کرنے اور آب پاشی کی دوسری آسانیاں مہیا کرنے کے لیے قائم تھا۔

حکومت عباسیہ جماعتی معاملات میں زیادہ دخل نہ دیتی تھی، اگرچہ اس پالیسی کی وجہ سے اکثر حکومت کو مالی نقصان بھی اُٹھانا پڑتا تھا، ہاں عباسیہ حکومت ٹیکس کی عدم ادائیگی کے وقت ضرور دخل دیتی، حکومت عباسیہ زراعتی اور آبپاشی کی سہولتوں کے مہیا کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھتی، اس کا مقصد حکومت کی آمدنی میں اضافہ بھی ہوتا تھا، حضرت امام ابو یوسفؒ قاضی القضاۃ نے نہروں کے کھودنے ان کی اصلاح و مرمت، کھیتوں میں پانی کی تقسیم کی نگرانی اور زراعت کی ترقی کی دوسری عملی تدابیر اختیار کی تھیں۔ حضرت امام ابو یوسفؒ نے دریاؤں خصوصاً دجلہ و فرات کے پانی کے کھاری پن کو دور کرنے کے لیے بھی عملی قدم اُٹھایا، یہ کھاری پن کاشت کے لیے سخت مضر ثابت ہوتا تھا۔

دیوانِ زمام (جو اس زمانہ کے دیوانِ محاسبی سے مشابہ تھا۔) کا محکمہ نہایت اہم محکمہ تھا، اسے خلیفہ مہدی نے قائم کیا تھا، اس محکمے کے افسر کا فرض بلادِ عراق اور دوسرے ملکوں کے ٹیکس کی وصولی اور ان کے حسابات پیش کرنا تھا، نوعی ٹیکس (غلہ اور پیداوار کی شکل میں ٹیکس) کی وصولی اور اس کا انتظام بھی اس کے فرائض میں داخل تھا۔ اہم محکموں میں ایک محکمہ دیوانِ رسائل بھی تھا جس کے افسر کا کام سرکاری احکام کی تشہیر، سیاسی خطوط کی کتابت، اور ان پر خاتم خلافت ثبت کرنا ہوتا تھا۔[۱]

[۱] SAYED AMEER ALI. P. 415.

دیوانِ زمام ایک بہت بڑا محکمہ تھا، اس کے افسر نے سہولت کے لیے اسے بہت سے چھوٹے چھوٹے محکموں میں تقسیم کر دیا تھا، ان محکموں کا ایک ایک افسر یا نگران ہوتا تھا، عباسیوں نے ایک اور محکمہ" دیوانِ نظر یا مکاتبات اور مراجعات" کے نام سے قائم کیا تھا، یہ چار حصوں میں تقسیم تھا، دیوانِ فوج، اس میں سپاہیوں کے نام اور ان کی تنخواہوں کے حسابات رکھے جاتے تھے۔

دیوان الاعمال، اس کے ذمہ قومی روایات اور حقوق کی حفاظت ہوتی تھی۔

دیوانِ عمّال، اس محکمہ کے ذریعہ گورنروں کا عزل و نصب ہوتا تھا۔

دیوانِ بیت المال۔ اس میں مالیات کے آمد و خرچ کا حساب رکھا جاتا تھا،

(۳) فوج

جہاد اور اُس کا مقصد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ سال مکہ میں لوگوں کو قرآن اور نیک اعمال کی دعوت دیتے رہے، قریش نے اس کا جواب طرح طرح کی تکلیفوں کی شکل میں دیا، خدا نے ان اذیتوں پر آپؐ کو صبر و ضبط کی نصیحت فرمائی اور مزید تسکین کے لیے ارباب صبر کی حکایات بیان فرمائیں۔

جب آنحضرتؐ اور صحابہؓ کے ساتھ قریش کی زیادتیاں حد سے بڑھ گئیں تو خدا نے آپؐ کو مشرکین سے "جہاد" کا حکم دیا، یہ خدا کے راستہ میں جنگ تھی اور صرف خدا کے واسطے تھی، خدا نے جہاد کا یہ حکم چند آیات کے ذریعہ دیا، جن میں سے بعض مکہ میں اور بعض مدینہ میں نازل ہوئیں۔ جہاد کی اجازت چند حالات میں دی گئی۔

(۱) جان کی حفاظت کے لیے،

جن (مومنوں) کے خلاف ظالموں نے جنگ کر رکھی ہے اب انہیں (اس کے جواب میں) جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔ کیونکہ ان پر سراسر ظلم ہو رہا ہے، اور اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے۔

یہ وہ مظلوم ہیں جو ناحق اپنے گھروں سے نکال دیے گئے، ان کا کوئی جرم نہ تھا، اگر تھا تو یہ تھا، کہ وہ کہتے تھے ہمارا پروردگار اللہ ہے۔

(آیت ۳۹۔ سورہ حج)

اور (دیکھو) جو لوگ تم سے جنگ کر رہے ہیں اللہ کی راہ میں تم بھی اُن سے لڑو، (پیٹھ نہ دکھلاؤ) البتہ کسی طرح کی زیادتی نہ کرو۔ اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو زیادتی کرنے والے ہیں۔ . . . .

اور دیکھو ان لوگوں سے جنگ جاری رکھو۔ یہاں تک کہ فتنہ (یعنی ظلم و فساد) باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو جائے (انسانی ظلم و استبداد کی مداخلت اس میں باقی نہ رہے) پھر اگر ایسا ہو کہ یہ لوگ جنگ سے باز آجائیں تو تمہیں بھی ہاتھ روک لینا چاہیے۔ کیونکہ) جنگ کا مقصد تشدد کرنا نہیں ہے، مگر صرف انہیں لوگوں کے مقابلہ میں جو ظلم کرنے والے ہیں۔

(سورہ بقرہ آیۃ ۱۸۶ - ۱۸۹)

(۲) دعوتِ اسلام کے راستہ سے رکاوٹیں دور کرنا، تاکہ جو لوگ اسلام لانا چاہیں انہیں کوئی روکنے اور ان پر سختی کرنے والا نہ رہے اور حضرت عمار بن یاسرؓ اور حضرت بلالؓ کے واقعات کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے۔ جب اہلِ مکہ کے ساتھ دوسرے عربوں نے اشتراکِ عمل کیا تو خدا نے حکم دیا" تمام مشرکین سے جنگ کرو۔ جس طرح وہ تم سے برسرِ پیکار ہیں[1]۔ جب یہودِ مدینہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیے ہوئے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور آپؐ کے حریف قریش سے عملی اشتراک کیا تو حکم ہوا

اگر ایک گروہ (ابھی میدانِ جنگ میں تو دشمنوں کے ساتھ نہیں نکلا لیکن اس) سے تمہیں دغا کا اندیشہ ہے تو چاہیے اُن کا عہد انہیں پر اُٹھا دو۔ (فسخ کر دو)[2]

جہاد کے بدلے میں مسلمانوں کو دنیا میں فتح و کامرانی اور آخرت میں بہشت کی بشارت دی گئی۔

---

[1] آیۃ ۳۶ سورۂ توبہ۔ [2] آیۃ ۵۸ سورۂ انفال۔

جو لوگ آخرت کے بدلہ دنیا کی زندگی (اللہ کے ہاتھ) فروخت کر چکے ہیں، انہیں چاہیے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کریں اور جو کوئی اللہ کی راہ میں جنگ کرتا ہے تو خواہ وہ قتل ہوجائے خواہ غالب آئے (ہر حال میں) ہم اُسے اجرِ عظیم عطا فرمائیں گے۔

(سورہ نساء۔ آیۃ ۷۶)

عرب کے سپاہی کا اہم مقصد فتنہ وفساد، شورش اور بغاوت کو فرو کرنا، غارت گروں سے ملک کو بچانا، ارکانِ اسلام کا قیام اور ناموسِ دین کا تحفظ اور اسلامی دائرۂ عمل کی توسیع تھا اور اسی کے لیے وہ اسلحہ اُٹھاتا تھا۔

فوج آنحضرت صلعم، خلافتِ راشدہ اور بنی امیہ کے زمانہ میں

عہدِ جاہلیت میں عربوں کا کوئی خاص فوجی نظام نہ تھا، اس زمانہ میں تہذیب وتمدن کے لحاظ سے ان کی سطح بہت پست تھی، جنگ کے وقت قبیلے کے افراد، پیدل، ورسوار، تلواریں، نیزے اور کمانیں لے کر نکلتے اور حریف سے مقابلہ کرتے، جنگ کے خاتمہ کے بعد اپنے اپنے گھروں کو واپس آجاتے اور اپنے کاروبار میں لگ جاتے تھے۔

جب اسلام کا ظہور ہوا تو اس نے عربوں کی شیرازہ بندی کی اور ان میں مرکزی وحدت پیدا کر دی، اب عرب اسلام کی نشر واشاعت کے لیے جنگ کرنے لگے اور اسلامی دائرۂ عمل کو وسیع کرنے کے لیے اقوامِ غیر پر چڑھائی شروع کر دی، حضرت عمرؓ سب سے پہلے شخص تھے، جنہوں نے فوج کو ایک منظم شکل دی اور فوجی نظم ونسق کے لیے دیوانِ فوج قائم کی، اس محکمہ کے فرائض میں سپاہیوں کے نام، ان کے اوصاف اُن کی تنخواہوں کی مقدار اور اُن کے کارناموں کے بارے میں مکمل معلومات بہم پہنچانا اور دوسرے انتظامی معاملات داخل تھے، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جنگ مذہبی جذبہ اور اسلام کے لیے ہوتی تھی۔ اس فرض کو مسلمان سپاہی بلا تنخواہ انجام دیتے تھے،

مثلاً حافظیہ (خلیفہ فاطمی حافظ لدین اللہ) آمریہ (آمر باحکام اللہ خلیفہ فاطمی) اور بعض وزراء کے نام سے منسوب تھے، مثلاً جیوشیہ (امیر الجیوش بدر جمالی وزیر اعظم) افضلیہ (وزیر اعظم افضل بدر جمالی)۔[1]

مستنصر باللہ کے عہد میں "جبر خلیج" جو فوجی مظاہرہ ہوا تھا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ فاطمیہ کے عہد کی فوجیں منظم صف بندی کی شکل میں یکے بعد دیگرے چلتی تھیں، آگے بربر ہوتے تھے، ان کے بعد مغاربہ ہوتے تھے، ان کے پیچھے مشرقیوں یا ترکوں اور ایرانیوں کے فوجی دستے ہوتے تھے اور ان کے پیچھے حجازی اور سوڈانی فوجیں ہوتی تھیں۔

خلفاء کا معمول تھا کہ وہ فوجوں کی روانگی کا منظر "باب فتوح" کے دیدبان سے دیکھا کرتے تھے اور ان فوجوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے جو فوجیں بلادِ شام اور فلسطین کو بھیجی گئی تھیں، جہاں کے لوگ فاطمیوں کے اقتدار کے خلاف شورشیں اور بغاوتیں کرتے رہتے تھے، فاطمی خلفاء نے ان کی خاص طور سے حوصلہ افزائی کی تھی، فوجوں کی روانگی کے وقت سپہ سالار کو خلیفہ کے سامنے کھڑے ہونے کی عزت نصیب ہوتی تھی، اس وقت خلیفہ سپہ سالار کو خلعت دیتا تھا، جنگی سازوسامان، خورد ونوش وغیرہ کا سامان اور دوسری ضروری چیزیں، وزیر بیت المال اس وقت سپہ سالار کے حوالہ کرتا تھا۔ فوج کی روانگی کے وقت دیدبان کی، کھڑکیاں کھلی ہوتی تھیں جب فوج کو خلیفہ کا چہرہ نظر آتا تھا تو وہ زمین بوس ہوجاتی تھی، پھر خلیفہ اشارہ کرتا تھا اور لشکر آگے بڑھ جاتا تھا، جب یہ فوجی مظاہرہ ختم ہوجاتا، تو امیر البحر خلیفہ کے سامنے حاضر ہوتا اور اسے خلعت دی جاتی۔ پھر بیڑا روانہ ہوجاتا تھا۔[2]

ایوبیوں کے دورِ حکومت میں صلاح الدین ایوبی نے کُردوں کی ایک عظیم الشان فوج بنائی تھی، یہ فوج دولتِ ایوبی کے لیے وجہ استحکام ثابت ہوئی	ایوبیوں اور مملوکوں کا عہد

[1] صبح الاعشیٰ، ج ۳۔ ص ۴۸۲ [2] ایضاً ص ۵۲۳ - ۵۲۴

تھی[۱]۔ اس فوج نے بڑی وفاداری سے دولتِ ایوبی کی بنیادیں مستحکم رکھی تھیں، ملک صالح نجم الدین ایوب نے اپنے زمانہ میں ایک بہت بڑا لشکر جمع کیا، ان میں ترکوں کی تعداد زیادہ تھی[۲]۔ یہ ترکوں کے احسان کا عملی اعتراف تھا، صالح اور اس کے بھائی عادل میں جب حکومت کے بارے میں حریفانہ کشمکش تھی اور عادل نے صالح کو کرک کے قلعہ میں نظر بند کر دیا تھا اس وقت مملوکوں نے انتہائی وفاداری کا ثبوت دیا تھا اور رہائی کے وقت تک یہ برابر رفاقت کا حق ادا کرتے رہے تھے، ان مملوکوں کی تعداد کوئی اسی تھی۔ جب صالح اپنے بھائی عادل کے بعد بادشاہ ہوا تو اس نے ان مملوکوں کے ساتھ بہت احسانات کیے اسے ان کی وفاداری اور صبر وضبط کا اندازہ ہو گیا تھا اس نے انہیں کثرت سے خریدا[۳] اور ان کے لیے "جزیرہ روضہ" میں ایک قلعہ بنایا جس میں بہت بڑی مقدار جنگی ساز وسامان، اسلحہ جات، اور سامانِ خورد ونوش کی مہیا کی اور وہاں ایک محل تعمیر کرا دیا جس میں ساٹھ برج تھے، محل بننے کے بعد اپنے حرم اور خاندان کے ساتھ وہیں آکر رہنے لگا، یہیں اس کا بحری عملہ بھی قیام پذیر تھا،

قلعۂ روضہ ایوبیوں کے زوال تک ان مملوکوں سے آباد رہا، جب معز ایبک نے مصر فتح کیا اس وقت اس نے اس قلعہ کو منہدم کرا دیا، اور اس کے تمام ساز وسامان کو قلعۂ جبل میں منتقل کر دیا،۔ ظاہر بیبرس کے زمانہ تک یہ کس مپرسی کے عالم میں پڑا رہا بیبرس نے اس کی از سر نو تعمیر کرائی اور اسے اسی معیار پر پہونچا دیا جس پر صالح نجم الدین ایوب کے زمانہ میں تھا، جب عمارت کی تکمیل ہو گئی تو امراء اس کے برجوں میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔

[۱] بدائع الظہور (ابن ایاس) ج ۱ ص ۷۰۔

[۲] STANTEY LANE, POOLE, A HISTORY OF EGYPT IN THE MIDDLE AGES. P. 243.

[۳] الخطط ج ۲ ص ۲۳۰

جب منصور قلاوون (۶۷۸ھ، ۶۸۹ھ = ۱۲۸۰ء، ۱۲۹۰ء) مصر کا فرماں روا ہوا تو اس نے مملوکوں کو قلعہ جبل میں منتقل کر دیا اور وہ ہمیشہ ان کا خیال رکھتا اور ان کے ساتھ روزانہ دو چار لقمہ کھانا ضرور کھاتا تھا، ان مملوکوں کو شبانہ روز میں کسی وقت قلعہ چھوڑنے کی اجازت نہیں تھی، جب خلیل بن قلاوون (۶۸۹ھ، ۶۹۳ھ = ۱۲۹۰ء، ۱۲۹۳ء) تخت پر بیٹھا تو اس نے دن میں قلعہ سے باہر جانے کی اجازت دیدی، مگر شب کو باہر رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے بعد ناصر بن محمد قلاوون نے قلعہ جبل کے اندر ایک وسیع میدان کا انتظام کیا اور شاہی مملوکوں کا اسے مرکز قرار دیا، اس زمانہ میں مملوکوں کو اس کی اجازت تھی کہ ہفتہ میں ایک بار خدام کے ساتھ حمام جائیں اور غروب آفتاب سے قبل قلعہ میں واپس آجائیں۔

ظاہر بیبرس نے اپنے دشمنوں سے مقابلہ کے لیے ایک عظیم الشان فوج جمع کی تھی، بیبرس نے کثرت سے مملوکوں کو خریدا تھا اور اس زمانہ کے مطابق جنگ اور دفاع کی نہایت اعلیٰ تربیت دلائی تھی، یہ وقت صلیبی جنگوں اور مغلوں کی لڑائیوں کا تھا بیبرس نے ان کی فوجی ٹریننگ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا، فوج کے ہر دستے کے لیے ایک فقیہ مقرر تھا، یہ قرآن، اصولِ اسلام اور نوشت و خواند کی تعلیم دیتا تھا، مملوکوں کے سنِ بلوغ تک یہ تعلیم جاری رہتی، اس کے بعد فوجی تربیت دی جاتی تھی، جب اس کی تکمیل ہوجاتی تھی تو وہ شاہی فوج میں داخل کر لیے جاتے تھے[1]۔

بیبرس کی فوج شاہی مملوکوں اور "جنود حلقہ" پر مشتمل تھی، ان دونوں کا یونیفارم اور ان کا مرتبہ مختلف تھا، شاہی مملوک مرتبہ اور قدر و منزلت کے لحاظ سے "جنود حلقہ" سے بڑھے ہوئے تھے، انہیں شاہی تقرب حاصل تھا، امراء دربار انہیں میں سے مقرر کیے جاتے تھے، "جنود حلقہ" میں ہر چالیس سپاہیوں پر ایک سپاہی افسر ہوتا تھا، اسے مقدم کہتے

---

[1] الخطط ج ۲ ص ۲۱۳ - ۲۱۴۔

جنگ وقتال کے وقت حاصل ہوتا تھا، ان کی فوجی ترتیب اور صف بندی بھی جنگ کے وقت اسی افسر کے ذمہ ہوتی تھی، لیکن یہ افسر سلطان یا قائم مقام سلطان کی اجازت کے بغیر کسی فوجی کو برخاست نہیں کر سکتا تھا[۱]

فوج کے یہ دونوں طبقے اپنے سروں پر زرد کلاہ بغیر صافہ کے اور جسموں پر سفید بعلبکی سوتی قبائیں پہنتے تھے جن کے جیب و گریبان تنگ ہوتے تھے، بعض وقت یہ سرخ اور نیلی بھی ہوتی تھیں، اور ان میں روئی کی گھنڈیاں لگی ہوتی تھیں[۲]

جنگوں میں مملوک عام طور سے تلوار، نیزہ، تیر و کمان کا استعمال کرتے تھے، ان کے علاوہ مملوکوں نے صلیبی اور تاتاری جنگوں میں منجنیق، ہلکے ٹینک اور گوپھنیں وغیرہ بھی استعمال کی تھیں۔

امراء اور فوج کے مخصوص مراتب اور امتیازات تھے، سلطان کی طرف سے ان امراء کو جاگیریں عطا کی جاتی تھیں، جہاں جاگیردار جا کر رہتے تھے اور اس کی پیداوار سے فائدہ اٹھاتے تھے، جب جاگیر کے پٹّہ کی مدت ختم ہو جاتی تھی یا جاگیردار مر جاتا تھا تو یہ جاگیر حکومت کی ہو جاتی تھی۔ سلطان وفادار اور معتمد امراء کے ساتھ یہ رعایت کرتا تھا کہ ان جاگیروں کو موروثی قرار دیدیتا تھا، فوج اور امراء کے لیے صرف یہ جاگیریں ہی نہیں ہوتی تھیں بلکہ مالِ غنیمت سے بھی ان کے حصے مقرر تھے، اور جاگیروں کے علاوہ حکومت کی طرف سے خورد و نوش وغیرہ کا الاؤنس علیحدہ ملتا تھا۔ کبھی یہ الاؤنس ان امراء کی اولاد کو بھی ملتا تھا جن کے پاس جاگیریں نہیں ہوتی تھیں[۳]

بیبرس سب سے پہلا سلطان تھا، جس نے مملوکوں کی فوج کو منظم کیا، یہ ان کا ممتاز جنرل تھا، اس نے منصورہ کی جنگ میں غیر معمولی فوجی بصیرت کا مظاہرہ کیا تھا۔

---

[۱] صبح الاعشیٰ ج ۴ - ص ۱۴ - ۱۵ [۲] الخطط ج ۲ ص ۹۸

[۳] صبح الاعشیٰ ج ۴ ص ۵۰ - ۵۱

اس کا جانشین عزالدین ایبک (شجرۃ الدر کا شوہر، بیبرس کا کمانڈر انچیف) ہوا تھا، مملوکوں کی فوج معمولاً خصوصاً مؤید کے زمانہ میں تین طبقوں میں تقسیم تھی: باقاعدہ فوج، جس کے اخراجات حکومت برداشت کرتی تھی، سلطان کے مملوک، جن کے مصارف سلطان ذاتی طور پر برداشت کرتا تھا، یہ مملوک سلطان کے باڈی گارڈ کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ یہ مملوک نہایت ذی ثروت تھے، ان کا اثر و رسوخ، سلطانی تقرب اور شاہی نوازشوں کی وجہ سے بہت بڑھا ہوا تھا، تیسرے اُمراء کے مملوک تھے جن کے اخراجات اُمراء برداشت کرتے تھے، یہ اُمراء کے باڈی گارڈ ہوتے تھے اور دشمنوں سے جنگ کے وقت اُن کے پشتِ پناہ ہوتے تھے، مملوکوں میں اس وقت بھی فوجی اسپرٹ باقی تھی جب ان پر سلطان سلیم اوّل کا سیاسی اقتدار تھا، مملوک جنگوں میں اپنی فوج کی تنظیم اور ترتیب مربع شکل میں قائم کرتے تھے ان کی سوار فوج قلب میں ہوتی تھی جو بغیر کسی قسم کی ترتیب اور نظم کے میدانِ جنگ میں دشمنوں پر ٹوٹ پڑتی تھی یہی وجہ تھی کہ مملوکوں کی غیر معمولی شجاعت کے باوجود انہیں شکست دینا کوئی دشوار کام نہیں تھا[1]

فوج عثمانیوں کے عہد میں

دولتِ عثمانیہ کی فوج انکشاریہ (جدید فوج) سے مرکب تھی، یہ فوج سب سے پہلے اورخاں نے بھرتی کی تھی اور وہ ایک مدت تک عثمانیوں کی قوتِ بازو رہی، سلطان سلیمان قانونی کے زمانہ میں اس فوج کی جاں نثاری کا یہ حال تھا کہ وہ سلطان کے ایک اشارہ پر کٹ مرنے کو طیار رہتی تھی، لیکن سلطان سلیمان کے بعد سلطنت کی مدافعت میں اس فوج نے سہل انگاری سے کام لیا اور اس کی سرگرمیوں اور جدّ وجہد کا دائرہ بڑے بڑے مرتبے حاصل کرنے تک محدود ہو گیا اور رعایا کو ان انکشاری عناصر نے لوٹنا کھسوٹنا شروع کر دیا اور بہت جلد سلاطین پر چھا گئے تھے، سیاست میں ان کا عمل دخل تھا، اس وقت اِس فوج کے لوگ عیش و عشرت میں سرمست تھے۔

[1] دیکھیے الظاہر بیبرس وحضارۃ مصر فی عصرہ (جمال الدین سرور) ص ۱۴۰-۱۴۳

اور جنگ سے کنارہ کش ہو گئے تھے، اور جاہ و جلال اور شان و شکوہ کے تمام مظاہر اختیار کر رکھے تھے، سچ پوچھیے تو اب سلطنت عثمانیہ کے لیے یہ لوگ ایک وبالِ جان ہو گئے تھے، سلطان محمود ثانی نے ۱۸۲۶ء میں انہیں چُن چُن کر موت کے گھاٹ اُتار دیا اور ان کی جگہ ایک نئی فوج بھرتی کی جس کی تنظیم اور تربیت کے لیے غیر ملکی افسر بلائے گئے اور "آستانہ" میں ایک فوجی کالج قائم کیا گیا، جب سلطان عبد المجید ان کے جانشین ہوئے تو انہوں نے جبری فوجی بھرتی کا قانون نافذ کیا اور فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں ایک باقاعدہ اور منظم فوج تھی، دوسری احتیاطی اور ہنگامی فوج تھی، اس زمانہ میں ترکوں کی فوجی کمزوری کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سلاطینِ عثمانیہ نے اپنی سلطنت کی شورشوں کو دبانے کے لیے مصر کے محمد علی پاشا سے امداد کی درخواست کی تھی۔

بحری نظام

مسلمان اور بحری نظام اسلام کے ابتدائی دور تک عرب، بحری جنگوں کے خوگر نہ تھے، وجہ یہ تھی کہ وہ تہذیب و تمدن سے دور تھے اس وقت تک بحری سفروں کا بھی انہیں کم اتفاق پڑا تھا، سب سے پہلے حضرت عمرؓ کے عہد (۱۳ھ، ۲۳ھ) میں گورنر بحرین علاء حضرمیؓ نے حضرت عمرؓ کی اجازت کے بغیر سمندری راستہ سے بلادِ فارس پر بارہ ہزار مسلمانوں کے لشکر سے چڑھائی کی تھی، مسلمان اس مہم سے واپس لوٹے تو کثرت سے مالِ غنیمت ان کے پاس تھا، مگر جن جہازوں پر سوار ہو کر گئے تھے وہ برباد ہو گئے تھے، حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو ابی العلاء پر ناراض ہوئے اور انہیں معزول کر دیا گیا۔ یہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا کہ حضرت عمرؓ بحری جنگوں کو ناپسند کرتے تھے۔

شام کی جنگوں میں عربوں نے رومیوں کے جہاز دیکھے تھے، اس وقت سے انہوں نے جہاز رانی سیکھنا شروع کر دی تھی۔ امیر معاویہؓ نے حضرت عمرؓ سے بحری راستے سے بلادِ روم پر چڑھائی کی اجازت مانگی کیونکہ اس راستے سے یہ بلاد بہت قریب پڑتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے عمرو بن عاصؓ سے بحری حالات دریافت کیے، حضرت عمرو بن عاصؓ نے جواب دیا " کامیابی سے زیادہ ناکامی کا اندیشہ ہے" حضرت عمرؓ نے یہ جواب سن کر امیر معاویہؓ کو لکھ دیا " بخدا! میں قیامت تک بحری جنگ کی اجازت نہیں دوں گا"

اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ بحری جنگوں کو کتنا خطرانگیز خیال کرتے تھے۔ جب عمرو بن عاصؓ نے مصر فتح کیا اور رومیوں کو وہاں سے (۲۰ھ ۶۴۰ء) جلاوطن کیا گیا اس وقت عمرو بن عاصؓ کا ارادہ ہوا کہ اسکندریہ کو ان بلاد کا دارالسلطنت بنا دیا جائے، کیونکہ یہ سکندر مقدونی کے (۳۳۲ق م) زمانہ سے پایۂ تخت رہا تھا اس زمانہ میں بھی یہ شہر آبادی سے معمور تھا، اس لیے عمرو بن عاصؓ کو دارالسلطنت بنانے کا اور بھی خیال پیدا ہوا۔ حضرت عمرؓ سے اس کی اجازت مانگی آپ نے قاصد سے دریافت کیا " کیا وہاں کے مسلمانوں اور میرے درمیان سمندر تو حائل نہیں ہے؟" اس نے جواب دیا " اگر دریائے نیل جاری ہو تو سمندر حائل ہو جاتا ہے" آپ نے عمرو بن عاصؓ کو جواب میں لکھ دیا " میں اسے ناپسند کرتا ہوں کہ مسلمان کسی ایسی جگہ قیام گزیں ہوں جہاں ان کے، میرے درمیان کسی موسم میں بھی سمندر حائل ہو۔ میرے اور اپنے درمیان میں سمندر حائل مت کرو۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اگر میں اونٹنی پر بیٹھ کر آنا چاہوں تو آسکوں" حضرت عمرؓ نہایت دوربیں انسان تھے، انہیں علم تھا کہ عرب جہاز رانی اور بحری جنگوں میں کوئی خاص فوقیت نہیں رکھتے ہیں اس لیے آپ نے مصری بلاد کا دارالسلطنت اسکندریہ کو بنانا سیاسی تدبر کے خلاف سمجھا تھا

ابن خلدون نے بحری سفر سے عربوں کے احتراز کی یہ وجہ بیان کی ہے۔

عربوں کو اسلام سے قبل خانہ بدوشی اور تہذیب و تمدن میں کم مائگی کی وجہ سے بحری سفروں اور جنگوں کا اتفاق نہیں ہوا تھا لیکن رومیوں اور افرنگیوں کو ان کا بہت سابقہ پڑا تھا اس لیے انہیں صدہا تجربات تھے، ان کی تہذیب و تمدن کی ترقی بحری جنگوں میں اور زیادہ مہارت کا سبب ہوئی تھی، جب عربوں نے روم و ایران کا تختہ اُلٹ دیا، بحری قوموں پر اقتدار قائم کیا، بحری فنونِ جنگ میں غیر معمولی بصیرت پیدا کر لی، اور سیاسی، اقتصادی اور صنعتی مرکزیت انہیں حاصل ہو گئی اُس وقت عربوں کو بحری جہاد کا شوق پیدا ہوا اور اُنہوں نے کشتیاں، جہاز اور جنگی جہاز بنائے، آدمیوں کا بیڑا طیار کیا اور سمندر پار کی غیر مسلم قوموں سے جنگ کرنے کے لیے بحری راستہ سے فوجیں روانہ کیں، پہلے ان ملکوں اور سرحدوں پر چڑھائی کی گئی جو سمندر سے قریب تھیں، مثلاً شام، افریقہ، بلادِ مغرب اور اندلس۔[1]

حضرت عثمانؓ جب خلیفہ ہوئے تو امیر معاویہؓ نے ان سے بحری جنگوں کی اجازت مانگی اور اصرار کیا، حضرت عثمانؓ نے اجازت دیدی مگر یہ قید لگا دی کہ اس کے لیے کسی کو مجبور نہ کیا جائے، ہر شخص کو اختیار ہو جائے یا نہ جائے، امیر معاویہؓ اور مسلمانوں کو اس اجازت سے بے حد مسرت ہوئی اور بحری راستہ سے رومیوں پر چڑھائی کر دی، بحری حملوں کی غرض سے اس وقت کثرت سے جہاز بنائے گئے اور انہیں مسلح کیا گیا، بحری قوت کا دولت اسلامی کے دائرہ کو وسیع کرنے میں بہت دخل تھا،

حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں گورنر مصر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے قسطنطین بن ہرقل سے بحر روم میں جنگ کی اور "ذات سواری" (جہازوں کی کثرت اور اہل جہاز کی کثرت کی وجہ سے یہ نام پڑا) کے مقام پر اسے شکست دی، مسلمانوں کے جہاز اس جنگ

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۲۲۰-۲۲۲

ہیں دو سو سے زیادہ نہ تھے اور دشمن کے ایک ہزار سے کم نہ تھے، عربوں نے بحرِ روم کے اور بہت سے بڑے بڑے جزیرے فتح کیے جن میں صقلیہ، روڈس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، یہ جزیرے بیزنطی حکومت سے عربوں نے چھینے تھے، حکومت اسلامی کے لیے بحری بیڑا بنانے کا سہرا حضرت عثمانؓ کے سر ہے اس کے بعد سے اسلامی بیڑے کی حیثیت تاریخ میں ہمیشہ امتیازی رہی ہے۔

امیر معاویہؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں جنگی جہاز بنائے، یہ وہ وقت تھا جب بیزنطی فوجوں کی غارت گری بلادِ اسلامی پر جاری تھی، آپ نے ہر موسم میں ان کا دنداں شکن جواب دینے کی ٹھان لی اور ایک فوج کو گرمیوں میں حملہ کرنے کے لیے بحری راستہ سے اور دوسری فوج کو خشکی کے راستہ سے یورش کرنے کے لیے طیار کیا اور گرمی اور سردی دونوں موسموں میں جنگ جاری رکھنے کا لائحہ عمل اور نظام مرتب کیا۔ امیر معاویہؓ کے زمانہ میں شام کے بحری بیڑے میں سترہ سو جہاز تھے، آپ کے عہد میں عقبہ بن عامر نے جزیرہ روڈس پر حملہ کیا اور ۵۳ھ میں برلس میں رومیوں سے جنگ ہوئی جہاں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد شہید ہوئی، اس جنگ میں مسلمانوں کا سپہ سالار وردان بھی شہید ہوا جو حضرت عمرو بن عاصؓ کا آزاد کردہ غلام تھا، یہ مسلمہ بن مخلد (۴۷ھ۔ ۶۲ھ) گورنر مصر کے زمانہ کا واقعہ ہے، اس الم انگیز واقعہ کے بعد مصر کے حاکموں نے جہاز سازی کی صنعت کی طرف پوری توجہ کی اور سب سے پہلی دفعہ جزیرہ "روضہ" میں ۵۴ھ کے اندر جہاز سازی کا کارخانہ قائم کیا گیا[1] اور اسلامی بحری بیڑے کو نہایت مضبوط اور مستحکم بنایا گیا، یہ بیڑا اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ عباسیوں کے ابتدائی عہد تک باقی رہا جب مشرق و مغرب میں اسلامی حکومت کا انحطاط اور زوال شروع ہوا اُس وقت بحری قوت میں بھی انحطاط شروع ہو گیا تھا۔

---

[1] الخطط مقریزی ج ۲ ص ۱۹۰۔ ۱۹۱

بحری بیڑے کا اقتدار

عربوں نے جب بلادِ شام، بلادِ فلسطین اور بلادِ مصر فتح کیے تو سرحدی تحفظ اور دشمنوں سے مقابلہ کے لیے ناگزیر تھا کہ بحری بیڑا اور بحری قوت کو مہیا کیا جائے، عربوں نے اسی ضرورت سے بہت بڑا بحری بیڑا طیار کیا، تاریخ شاہد ہے عربوں کا یہ بیڑا کتنا مستحکم اور زبردست تھا، شروع میں فینیقی ملکوں سے یہ عرب بحری راستہ سے تجارت کرتے تھے، پھر سوریہ، مصر، اور ایشیائے کوچک کے ساحلوں پر بھی ان کی آمد و رفت ہو گئی تھی ۲۸ھ میں عربوں کے بیڑے نے جزیرہ قبرص پر تسلط قائم کر لیا، ۳۴ھ میں گورنر مصر دو سو جہازوں کا بیڑا لے کر بیزنطینوں کی مدافعت کے لیے نکلا، اس نے لاذقیہ کے ساحل کے پاس دشمن کے چھ سو جہازوں سے مقابلہ کیا اس میں مسلمانوں کو نمایاں کامیابی ہوئی، مسلمانوں نے اس جنگ میں پہلے ایک ایک جہاز سے انفرادی طور پر مقابلہ کیا تھا لیکن جب اس طرح اپنی شکست کے آثار دیکھے تو دفعۃً ایک ساتھ دشمن کے جہازوں پر ٹوٹ پڑے اور ان کے بادبان پھاڑ دیے اور تلواروں اور نیزوں سے دست بدست لڑائی لڑنے لگے[1] اس وقت جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور مسلمانوں کو زبردست کامیابی ہوئی اور بیزنطی بیڑا تباہ ہو گیا اور ان کا امیر البحر بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگ سکا، اُس وقت سے مسلمانوں نے بحری اور بری جنگوں میں انفرادی مقابلہ کی جگہ اجتماعی حملہ کو اختیار کیا، یہ بحری بیڑا عموماً سوریہ اور مصر کی سرحدوں پر موجود رہتا تھا، عربوں کے جہاز بیزنطینوں سے ہلکے نہ سہی مگر اُن کے جہازوں سے زیادہ مضبوط ہوتے

[1] A SHORT HISTORY OF THE SARACEUS. P. 492-493.

تھے، عربوں کے پاس تجارتی جہاز بھی کافی تعداد میں تھے جس کی وجہ سے تجارتی کاروبار نہایت آسانی سے کرتے تھے، ہر بحری سرحد پر ایک روشنی کا منارہ ہوتا تھا جسے "خشب" کہتے تھے، حکومت کے پاس جنگی جہاز صرف دار السلطنت اور اہم علاقوں کی حفاظت کے لیے نہ تھے بلکہ ایک بڑی تعداد ان جہازوں کی بھی موجود رہتی تھی جو ضرورت کے وقت فوراً سرحدوں اور صوبوں میں روانہ کر دیے جاتے تھے، یہ انتظام فاطمیوں اور سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے زمانہ میں تھا، ہر جنگی جہاز کا ایک افسر ہوتا تھا۔ جس کا فرض سپاہیوں کو ٹریننگ دینا اور ضروری ساز و سامان اور جنگی اسلحہ کا فراہم کرنا تھا، ایک دوسرا افسر اور ہوتا تھا جسے رئیس یا جہاز کا کپتان کہا جاتا تھا۔ لفظ Admiral اسی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

بیزنطیوں سے، عربوں نے بحری فنونِ جنگ کی تعلیم حاصل کی تھی، پھر تھوڑی ہی مدت میں اتنی ترقی کی کہ یورپ کے استاد بن گئے، یہ ان کی فطری شجاعت اور جنگ سے غیر معمولی شیفتگی کا نتیجہ تھا، یورپ میں اس وقت بھی عربوں کی بہت سی بحری اصطلاحات مستعمل ہیں۔ عربوں کا اثر بحر روم کی بسنے والی قوموں پر یورپ کی دوسری اقوام سے زیادہ گہرا پڑا تھا، فان کریمر PON KREMER کے الفاظ میں "قدیم عربوں کا بحری بیڑا عیسائی دنیا کے لیے نمونہ تھا، عربوں کی کثیر بحری اصطلاحات اس وقت بھی جنوبی یورپ میں زبان زد ہیں، مثلاً CARLE بحری تار، عربی لفظ "حبل" کے مترادف ہے۔ ARSENEL. (اطالوی زبان میں DARSENEL.) عربی لفظ "دار الصناعۃ" کے ہم معنی ہے، اسی طرح لفظ CORYETTE عربی لفظ "غراب" (ایک قسم کا جہاز) اور ADMIRAL. امیر البحر کی مسخ شدہ صورت ہے۔[۱]

---

[۱] ORIENT UNDER THE CALIPHS. P. 356.

مصر کا بحری نظام

دورِ اسلامی میں مصر دریائے نیل میں چلنے والے جہازوں کی صنعت میں مشہور تھا یہ جہاز دریائے نیل کے پار آتے جاتے تھے اور بلادِ مصر کی پیداوار کو ایک طرف سے دوسری طرف پہونچاتے تھے، مصر میں اس وقت بحری بیڑا بھی موجود تھا اور جہاز سازی کی صنعت بھی پائی جاتی تھی، یہ جہاز مسلح ہوتے تھے اور مشرقی بلاد روما پر اسکندریہ، دمیاط، تینس (بحیرہ منزلہ کے شمال مشرق میں ایک چھوٹا سا جزیرہ) اور خرم (بحر روم کے ساحل پر بحیرہ منزلہ کے مشرق میں ایک شہر) کے راستہ سے یورش کرتے رہتے تھے،

احمد بن طولون (۲۵۴ھ ۔ ۲۷۰ھ) مؤسس دولت طولونیہ (۲۵۴ھ ۔ ۲۹۲ھ) جنگی جہازوں کی صنعت کو ترقی دینے میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے، اس نے "جزیرہ روضہ" کے قریب چند کارخانے قائم کیے تھے۔ جو "صناعۃ الجزیرہ" کے نام سے معروف تھے، اور محمد بن طغج خشید (۳۲۳ھ ۳۳۴ھ) بانیِ دولتِ خشیدیہ (۳۲۳ھ ۳۵۸ھ) کے عہد تک یہ کارخانے قائم رہے، محمد بن طغج خشید کے زمانہ میں جنگی اور دریائے نیل کے باربردار جہاز "صناعہ مصر" اور "صناعۃ الجزیرہ" دونوں جگہ کے کارخانوں میں بنائے جاتے تھے،

فاطمیوں نے بلادِ شام کے چند اہم شہروں انطاکیہ، اور حلب وغیرہ پر قبضہ کر لینے کے بعد محسوس کیا کہ اب بیزنطی حکومت کے خطرہ اور دباؤ کی وجہ سے بہت بڑے بحری بیڑے کی ضرورت ہے، اس اندیشہ سے معز الدین فاطمی اور اُس کے جانشینوں

نے جنگی جہاز سازی کے کارخانے مصر، اسکندریہ اور دمیاط میں قائم کیے ان جہازوں کا بدرقہ اور بیڑا شامی سرحدوں عکہ، صور اور عسقلان کی حفاظت کے لیے مامور رہتا تھا۔

معز الدین نے "مقس" میں جہاز سازی کا بہت بڑا کارخانہ قائم کیا تھا، جس میں چھ سو جہاز طیار کیے گئے تھے یہ جہاز مورخ مصر مسبحی (محمد بن ابی قاسم عبید اللہ بن احمد متوفی ۴۲۰ھ) کے الفاظ میں "اتنے عظیم الشان، مضبوط اور عمدہ تھے کہ اس سے قبل اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی ہے" مقریزی کا بیان ہے اس عہد میں مصر کے بحری بیڑے کے دس قائد تھے ان کے افسر (قائد القواد) کو عہد فاطمی میں "امیر الجیش" اور مملوکوں کے زمانہ میں "ناظر الجیش" کہا جاتا تھا، ان قائدوں کی مختلف تنخواہیں تھیں، جو بیس دینار ماہانہ (۱۰۰ روپیہ) سے زیادہ نہ تھیں، اس بحری بیڑے کے لیے بجٹ میں بہت بڑی رقم رکھی جاتی تھی جو مخصوص جاگیروں کے خراج سے پوری کی جاتی تھی، مصری بیڑے کے اہتمام پر ہمیشہ فاطمیوں نے پوری توجہ مرکوز رکھی تھی۔

صلیبیوں کی جنگ میں عاضد عبداللہ فاطمی کے وزیر اعظم ابو شجاع شاور بن مجیر کے حکم سے مصر کے بحری بیڑے میں آگ دیدی گئی تھی اور وہ خاک کا ڈھیر ہو گیا تھا اس کارروائی کا مقصد یہ تھا کہ دشمن ان سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔

۵۶۷ھ میں جب دولت فاطمی کا آفتاب غروب ہو گیا اور سلطان صلاح الدین ایوبی نے سلطنت ایوبیہ کی بنیاد ڈالی اس وقت بحری بیڑہ کی طرف انتہائی توجہ مرکوز کی گئی تاکہ صلیبیوں کو ممالک اسلامیہ کی حدود پر یورش کرنے سے روکا جا سکے سلطان نے اس بیڑے کے نظم و نسق اور دوسری ضروریات کے لیے ایک مستقل دفتر قائم کیا تھا، جسے "دیوان اسطول" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، اس محکمہ کا افسر سلطان کا بھائی عادل تھا۔

ایوبیوں کے دور میں لوگ بحری جنگوں سے عام طور پر گریز کرنے لگے تھے اور سلاطین کو بحری خدمات کے لیے لوگوں پر جبر کرنا پڑتا تھا، اس وقت بحری خدمات کو باعث ننگ خیال کیا جاتا تھا اگر کسی کو "یا اسطولی!" یعنی بحری محکمہ کا ملازم کہہ دیا جاتا تھا تو غیظ و غضب میں وہ پیچ و تاب کھانے لگتا تھا، یا اسطولی کا مطلب وہ یہ لیتا تھا کہ میں اُس شخص کی طرح ہوں جو صلیبی دشمنوں کے بیڑے میں آیا ہے، یہ بیان کرنے کی غالباً ضرورت نہیں کہ صلیبی جنگوں کا ہدف مصر خاص طور پر تھا۔

مصر جب مملوکوں کے اقتدار (۶۴۸ھ - ۹۲۲ھ - ء - ء) میں آیا تو بحری بیڑے میں نئے سرے سے زندگی پیدا ہوئی، ظاہر بیبرس (۶۵۸ھ - ۶۷۶ھ) نے بحری قوت کو نہایت زبردست بنا دیا تھا، غرض یہ تھی کہ بحری راستہ سے دشمنوں کی غارت گری کی روک تھام کی جائے، اس دور کا بحری بیڑا الملک صالح نجم الدین ایوب کے زمانہ سے کسی طرح کم نہ تھا، بیبرس نے تمام ان لکڑیوں کے استعمال کی ممانعت کر دی تھی جو جہاز سازی کے کام آسکتی تھیں، اسکندریہ اور دمیاط کی سرحدوں پر جنگی جہازوں کے بنانے کے لیے نئے کارخانے قائم کیے گئے اور سلطان اکثر صناعۃ الجزیرہ کا معائنہ کرتا رہتا تھا، اور اس کے لیے ہر طرح کی سہولتیں مہیا کرتا تھا، سلطان نے جہازوں کا ایک بیڑا ۶۶۹ھ میں جزیرہ قبرص روانہ کیا تھا، یہ بیڑا چالیس جنگی ڈونگیوں پر مشتمل تھا۔ جزیرہ کے قریب یہ بیڑا برباد ہو گیا تھا، بیبرس کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے اُس وقت تک دم نہ لیا جب تک برباد شدہ بیڑے کی تلافی نہ کر لی اور اتنا ہی زبردست بیڑا طیار نہیں کر لیا،

بحری بیڑے کو ترقی دینے میں بیبرس کا اشرف خلیل بن قلادون (۶۸۹ھ - ۶۹۳ھ مطابق ۱۲۹۰ء - ۱۲۹۳ء) صحیح جانشین تھا اس نے ساٹھ عظیم الشان جنگی جہاز بنوائے تھے جو اسلحہ جات اور دوسرے جنگی ساز و سامان سے لیس تھے۔ جب یہ جہاز طیار ہوئے تھے اس وقت اشرف نے جزیرہ روضہ کے کارخانہ کا جائزہ لیا تھا اور اس تقریب

میں ایک عظیم الشان دربار منعقد کیا تھا دریائے نیل اور جزیرہ روضہ کے آس پاس لوگوں کی رہائش کے لیے کثرت سے خیمے نصب کیے گئے تھے، سلطان جب ورود فرما ہوا تو جنگی جہازوں (جس میں روشن دان تھے ان سے دشمنوں پر تیر اندازی کی جاتی) اور ہلکے جہازوں کو یکے بعد دیگرے اس کے سامنے پیش کیا گیا، ہر جنگی جہاز میں برج اور قلعہ تھا بحری فوجوں نے اس وقت اپنے کمالات اور بحری فنونِ جنگ کا حیرت انگیز مظاہرہ کیا تھا[۱] اس کے بعد سلطان قلعہ واپس آ گیا تھا اور لوگ تین شبانہ روز جشنِ مسرت میں مصروف رہے تھے۔

اس سرسری جائزہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلامی مصر ازمنۂ وسطیٰ میں بحری اور تجارتی جہاز سازی کی صنعت میں کتنا ترقی کر گیا تھا اور امراء اور سلاطین نے جنگی اور تجارتی بحری بیڑے کو ترقی دینے میں کتنی غیر معمولی جدوجہد سے کام لیا تھا، اس زمانہ میں بحری بیڑے کے ملازموں کو نہایت احترام اور عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور مجاہدین فی سبیل اللہ غزاۃ فی اعداء اللہ وغیرہ سے انہیں خطاب کیا جاتا تھا اور جوشِ احترام اور عقیدت میں ان سے دعا کی درخواست کی جاتی تھی، حکومت کے ساتھ شہری، فوجوں اور بیڑے کی ترقی اور حوصلہ افزائی کے کاموں میں پورا اشتراکِ عمل کرتے تھے، ان باتوں کا بھی مصر کے بحری بیڑے کی ترقی و عروج میں بہت بڑا حصّہ تھا۔

---

[۱] الخطط ج ۲ ص ۱۹۴-۱۹۵

(۵) ڈاک کا نظام

ڈاک پہونچانے کے لیے تیز رفتار گھوڑے ۲۲-۱۲ میل کے فاصلہ پر متعین تھے ایک گھوڑے کا سوار منزل پر پہونچ کر ڈاک کا تھیلہ دوسرے کو دیدیتا تھا، دوسرا سوار بھی اسی طرح کرتا تھا۔ اور یہ سلسلہ آخر تک قائم رہتا تھا۔[۱]

عہد بنی اُمیّہ میں ڈاک کا نظام

عربوں نے ڈاک کا نظام قیصر و کسریٰ کی حکومتوں سے سیکھا تھا، اسلام میں سب سے پہلے ڈاک کا محکمہ امیر معاویہؓ نے قائم کیا اس وقت وہ شام کے گورنر تھے، جہاں انہیں رومیوں کے تہذیب و تمدن کے مطالعہ کا موقع ملا تھا، عبدالملک بن مروان (۶۵ھ - ۸۶ھ) نے اس محکمہ میں بہت سی اصلاحات کیں اور اسے حکومت کا نہایت اہم شعبہ بنادیا، عبدالملک بن مروان نے حاجب کو ہدایت کر دی تھی کہ شبانہ روز میں کسی وقت بھی ڈاکیہ کو میرے پاس آنے سے روکا نہ جائے۔[۲]

عباسیوں کے زمانہ میں بغداد میں ڈاک کا بہت بڑا محکمہ قائم تھا اور طول و عرض میں اس کی شاخیں تھیں، معتصم کے زمانہ تک ڈاک رسانی کا کام نامہ بر کبوتروں سے لیا جاتا تھا، اس وقت تک ڈاک کا یہ نظام حکومت کے خطوط اور مراسلات تک محدود تھا اور اس کا دائرۂ عمل شہریوں تک وسیع نہ تھا، اس لیے یہ ایک خالص سرکاری شعبہ تھا، ڈاک کے افسروں کا فرض تھا کہ وہ گورنروں کی نگرانی کریں اور دشمنوں کی کارروائیوں کی مرکزی حکومت کو اطلاع دیں، آخر زمانہ میں صوبوں کے افسروں کے فرائض میں

---

[۱] الفخری فی الاداب السلطانیہ۔ ص ۱۰۱-۱۰۳ [۲] قلقشندی۔ ج ۱۴ ص ۳۶۷-۳۶۸

جاسوسی بھی داخل تھی اور وہ گورنروں کی کارروائیوں کی خفیہ اطلاعات خلیفہ کو بھیجتے تھے مرکزی ڈاک کے افسروں کا کام خلیفہ کے احکامات سے گورنروں کو اطلاع دینا ہوتا تھا۔[1]

عہدِ عباسیہ میں

عباسیوں نے ڈاک کے نظام کی ترقی و اصلاح کی طرف کافی توجہ کی تھی، منصور کا قول تھا "حکومت کے عناصر ترکیبی میں چار عناصر نہایت اہم ہیں، ان کا انتخاب بہت غور و فکر کے بعد کرنا چاہیے، قاضی[1] جو نہایت بیباک اور نڈر ہو۔ دنیا کی کسی طاقت سے مرعوب نہ ہو سکے، پولیس کا افسر[2] جس میں کمزور کی حمایت اور طاقت ور کے بل نکال دینے کی قوت ہو، خراج کا افسر[3]، جو نہایت دیانت دار ہو، ظلم و جور سے اسے طبعی نفرت ہو۔ ڈاک[4] کا افسر (یہ لفظ منصور نے تین بار کہا اور انگشت کو دانتوں کے نیچے دبا کر کہا تھا) جو صحیح حالات سے بے کم و کاست اطلاع دے اور اپنی طرف سے کوئی کتر بیونت نہ کرے۔[2]

منصور نہایت بیدار مغز فرماں روا گذرا ہے وہ اپنے گورنروں اور وزراء کے حالات سے ہمیشہ باخبر رہتا تھا، محکمۂ ڈاک کے افسر نے ایک دفعہ اُسے اطلاع دی کہ حضر موت کا گورنر شکار کو کثرت سے جاتا ہے، منصور نے گورنر کو لکھا "کم بخت! یہ ساز و سامان وحشی جانوروں پر صرف کرنے کے لیے نہیں ہے (تیر و کمان کے مصارف) مسلمانوں کی فلاح و بہبودی میں صرف کرنے کے لیے ہے اور تو اسے جنگلی جانوروں پر صرف کر رہا ہے۔ فلاں ابن فلاں کو اپنی گورنری کا چارج دیدے، خدا تجھے اور تیرے خاندان کو برباد کرے۔[3]

KHUDA BOKHSH, ORIENT UNDR THE CALIPHS. P. 233. [1]

AT SEQ. HELL, P. 72.

[2] طبری۔ ج ۹۔ ص ۲۹۷ [3] ایضاً ص ۳۱۴

منصور نے ڈاک کے افسروں سے جاسوسی کی خدمات بھی لی تھیں، یہ افسر حکومت کے نظم ونسق کے لیے اس کے دست وباز ثابت ہوئے تھے، اور وہ پوری سلطنت کے گورنروں، قاضیوں، خراج کے افسروں اور دوسرے محکموں کے افسروں کے حالات سے باخبر رہتا تھا، ڈاک کے افسروں کا یہ بھی فرض تھا کہ گندم، غلّہ، چمڑے اور خورد و نوش کی اشیاء کے بھاؤ کے بارے میں اطلاع دیں اور اس کی نگرانی رکھیں کہ حکومت کے مقرر کردہ نرخ سے زیادہ قیمت پر خرید و فروخت تو نہیں ہو رہی ہے۔

منصور کے زمانہ میں ڈاک کے افسر دن میں دو دفعہ تمام سلطنت کی خبریں اس کے سامنے پیش کرتے تھے، مغرب کی نماز کے بعد دن بھر کے واقعات کی اطلاعات اور صبح کی نماز کے بعد رات بھر کی تمام اہم خبروں سے اطلاع دیتے تھے، اس نظام کی وجہ سے منصور تمام اسلامی سلطنت کے حالات سے واقف رہتا تھا، اور قاضی کے ظلم وجور، حکومت کے حدود میں بھاؤ کے اُتار چڑھاؤ، کسی بات سے وہ بے خبر نہ رہتا تھا۔

طبری نے ۲۲۰ھ کے حوادثات میں بیان کیا ہے۔ جمادی الآخریٰ ۲۲۰ھ میں معتصم نے عجیف بن عنبر کو زطّ (سندھ کا ایک سیاہ رُو حبشی قسم کا خاندان ہے، زطی کپڑے انہی کی طرف منسوب ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ سوڈان اور ہندوؤں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔) سے جنگ کرنے کے لیے روانہ کیا تھا، ان لٹیروں نے بصرہ کے راستہ کو غیر مامون کر دیا تھا اور غلّہ کے خرمن لوٹ لیا کرتے تھے، اور کسکر اور بصرہ تک اُدھم مچا رکھا تھا اور راستہ کو پُرخطر بنا دیا تھا، اس جنگ کے دوران میں عجیف نے گھوڑوں کو باقاعدہ جگہ جگہ متعین کر دیا تھا، جو فوراً ڈاک کو لے کر آگے بڑھ جاتے تھے اور عجیف کے پاس سے خبر نکلتے ہی معتصم کے پاس اسی روز پہونچ جاتی تھی۔[1]

[1] تاریخ التمدن الاسلامی ج ۱ ص ۲۲۱۔

اکثر سلاطین اور امرا نے اپنے اور ڈاک کے افسروں کے درمیان خفیہ اشارات مقرر کر رکھے تھے، اگر ان اشارات کے معیار پر وہ خطوط پورے اترتے تھے تو قابلِ اعتماد خیال کیے جاتے تھے ورنہ نہیں، چنانچہ ابو مسلم خراسانی کو خراسان سے جب منصور نے بغداد بلایا تھا تو ابو مسلم کھٹکا تھا اور اس نے ابو نصر مالک بن ہیثم سے کہا تھا جب تک میرا خط تمہارے پاس نہ آئے اُس وقت تک تم قیادت کرنا میرے خط کی پہچان یہ ہوگی کہ نصف مہر لگی ہوگی اگر پوری مہر لگی ہو تو سمجھ لینا کہ میرا خط نہیں ہے میری طرف سے لکھا گیا ہے۔ ابو مسلم جب مدائن پہونچا اور منصور نے اسے قتل کرا دیا اور اس کے بعد ابو مسلم کی طرف سے ابو نصر کو خط لکھا جس میں حکم دیا تھا کہ جو کچھ ابو مسلم کا مال و دولت ہے، وہ لے کر فوراً یہاں پہونچے، ابو نصر نے جب دیکھا کہ پوری مہر لگی ہوئی ہے تو سمجھ گیا کہ ابو مسلم نے نہیں لکھا ہے۔[1]

فان کریمر (FAN KREMER) عہدِ عباسیہ کے نظام ڈاک کے بارے میں لکھتا ہے "بڑے بڑے صوبوں میں ڈاک کے محکمہ کا ایک اعلیٰ افسر ہوتا تھا، اس کا منصبی فرض تھا کہ ریاست کی اہم خبروں سے خلیفہ کو اطلاع دے اور گورنروں کے حالات کی نگرانی کرے، دوسرے الفاظ میں وہ مرکزی حکومت کا نمائندہ اور معتمد ہوتا تھا، باوجود ان تمام انتظامات کے بڑے بڑے صوبوں کے گورنر رفتہ رفتہ خود مختار ہوتے رہے یہاں تک کہ صوبے موروثی ہونے لگے اور اپنی طرف سے گورنر اپنا ولی عہد اور جانشین مقرر کرنے لگے اور آہستہ آہستہ خلفاء کے دائرۂ اقتدار سے نکلتے گئے۔"[2]

مصر میں ڈاک کا نظام | مصر میں ڈاک کا نظام مملوکوں کے دور میں خصوصاً بیبرس کے عہد میں

---

[1] تاریخ التمدن الاسلامی۔ ج ۱۔ ص ۲۲۱۔

[2] ORIENT UNDER THE CALIPHS, P.

نہایت اعلیٰ پیمانہ پر قائم تھا، بیبرس نے ملک کے چپہ چپہ میں بری اور فضائی ڈاک کا نظام قائم کیا تھا اور ایک جال سا بچھا دیا تھا، اس محکمہ کا مرکز قلعہ جبل تھا[1] یہاں سے ڈاک کے چار بڑی راستے جاتے تھے، ایک راستہ قوص تک، دوسرا عیذاب تک (یہ بندرگاہ بحر احمر کے قریب ہے، یمن، حبش، اور ہندوستان کے جہاز یہاں آتے تھے زمانۂ ماضی میں مصر سے حاجی آتے تھے، پھر یہاں سے سمندری راستہ سے جدّہ پہونچتے تھے) تیسرا راستہ اسکندریہ تک، چوتھا دمیاط اور غزہ تک جاتا تھا، اس مرکز سے سلطانی احکامات تمام سلطنت کے اطراف میں بھیجے جاتے اور گورنروں کے خطوط بھی اسی جگہ پہونچتے تھے۔

بیبرس کے عہد میں، مصر میں ہفتہ میں دو بار ڈاک آتی تھی۔

بیبرس نے ڈاک کے مرکزوں میں ہر ممکن آرام اور سہولت مہیا کی تھی، چنانچہ انسانوں اور جانوروں کے خورد و نوش اور دوسری ضروریات افراط سے موجود رہتی تھیں، ڈاک خانہ قائم کرنے میں اس کا لحاظ رکھا جاتا تھا کہ قرب و جوار میں پانی کی کثرت ہو اور کوئی گاؤں بھی آباد ہو، ہر ڈاک خانہ میں گھوڑے موجود رہتے تھے، ان گھوڑوں کے لیے سلطانی نشان ضروری تھا[2]۔

محکمۂ ڈاک کا نگراں دیوان انشاء کا افسر ہوتا تھا، وہ ڈاک کی تختیاں دفتر میں محفوظ رکھتا تھا اور جب کوئی ڈاکیہ ڈاک لے کسی مقام پر جاتا تھا اس وقت ایک تختی اسے دے دی جاتی تھی، وہ یہ تختی آمد و رفت کے دوران میں گلے میں ڈالے رہتا تھا، یہ تختیاں

---

[1] نجوم زاہرہ ج ٦ ص ٥٤۔ لکھا ہے کہ قلعہ جبل کے کھنڈرات اور آثار شکستہ اس وقت بھی قاہرہ کے مشرق میں جبل مقطم کے پاس موجود ہیں۔ اس قلعہ کو ٥٧٢ھ میں ناصر صلاح الدین نے تعمیر کیا تھا اور چند روز وہاں قیام فرما بھی رہا تھا۔

[2] صبح الاعشیٰ۔ ج ١٤۔ ص ٣٧٢، بدائع الزہور۔ فی وقائع الدہور۔ ج ١ ص ١٠٨۔

چاندی کی ہوتی تھیں۔ تختی کے ایک طرف لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ، وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْہِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ ضرب بالقاہرۃ المحروسۃ لکھا ہوتا تھا، دوسری طرف عن المولانا السلطان ...... سلطان الاسلام والمسلمین تحریر ہوتا تھا۔[1]

بیبرس نے نامہ بر کبوتروں سے بھی ڈاک رسانی کا کام لیا تھا، ان کبوتروں کے رہنے کے لیے قلعہ جبل میں برج بنے تھے، اور بری ڈاک کی طرح ان کی بھی مختلف مقامات پر شاخیں اور مرکز قائم تھے لیکن مسافت کے اعتبار سے یہ بری ڈاک سے ذرا زیادہ فاصلہ پر ہوتے تھے جب کبوتر نامے لے کر دوسرے مرکز دل میں پہونچتا تھا تو برج کا نگراں نامے کر دوسرے کبوتر کے بازو یا پروں میں باندھ دیتا تھا، اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔[2]

نامہ بر کبوتروں کے ذریعہ خطوط رسانی میں انتہائی اختصار کا لحاظ رکھا جاتا تھا، بسم اللہ، طویل تمہیدوں اور بے شمار القابوں سے جو اس زمانہ کے خطوط کی خصوصیت تھی، احتراز کیا جاتا تھا اور صرف تار کی طرح ضروری اشارات پر اکتفا کیا جاتا تھا، اس میں تاریخ اور وقت ضرور لکھا جاتا تھا، یہ خطوط بازو یا پروں کے نیچے باندھ دیے جاتے تھے معمول یہ تھا کہ دو خط ایک مفہوم کے دو کبوتروں کے ذریعہ بھیجے جاتے تھے اور دوسرے کبوتر کو پہلے کبوتر کے روانہ ہونے کے دو گھنٹہ بعد چھوڑا جاتا تھا، مقصد یہ تھا کہ اگر ایک کبوتر کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آجائے تو دوسرا پہونچا دے، یہ بھی معمول تھا کہ بارش کے وقت اور پیٹ بھر کھلائے بغیر کبوتر کو روانہ نہیں کیا جاتا تھا[3] خاص سلطان کے نام کا خط لانے

---

[1] صبح الاعشیٰ۔ ج ۱۴۔ ص ۳۷۱۔ [2] ایضاً ص ۳۹۱۔

[3] الخطط۔ ج ۲ ص ۲۳۱ — ۲۳۲۔ تاریخ البریدنی مصر۔ ص ۴۳ - ۴۴۔

والے کبوتر کے چند امتیازی نشانات تھے یعنی خاص قسم سے اس کی چونچ پر نشان لگا دیا جاتا خاص طرح سے اس کے پروں کو کتر دیا جاتا۔ جب یہ کبوتر قلعہ جبل میں خط لے کر پہونچتا تو سلطان اسے خود وصول کرتا تھا[1]

[1] STANEBY LANE, POOLE, A HISTORY OF EGYPT IN THE MIDDLE AGES. 246

[2] کتاب الظاہر بیبرس۔ ص ۱۳۵۔ ۱۳۶

(۵) پولیس کا نظام

پولیس کا کام، امن و امان اور نظم و نسق قائم کرنا اور قائم رکھنا تھا، پولس کا عملہ سرکشوں اور مجرموں کو سزائیں دیتا، تاکہ شہریوں کو سکون و اطمینان حاصل ہو۔ سب سے پہلے حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے شب کی چوکیداری کے لیے نظام عسس قائم کیا تھا پھر حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں باقاعدہ پولس کا نظام قائم ہوا، اس محکمہ کے سب سے بڑے افسر کو "صاحبِ شرطہ" یا پولس افسر کہا جاتا تھا۔ یہ خلیفہ کا عموماً قریبی رشتہ دار ہوتا تھا اور صاحب عصبیت اور صاحب قوت ہونا اس کے لیے ضروری خیال کیا جاتا تھا، وہ اس زمانہ کے فوجی پولس افسر سے زیادہ مشابہ تھا، ابتدا میں پولس کا محکمہ عدالت کے ماتحت ہوتا تھا، اس کا فرض عدالت کے احکام کا نفاذ اور حدود شرع کو عمل میں لانا تھا، مگر کچھ عرصہ بعد یہ مستقل محکمہ ہوگیا اور جرائم پیشہ لوگوں کو براہ راست سزائیں دینے لگا۔ ہشام بن عبدالملک (۱۰۵ھ۔ ۱۲۵ھ) نے "نظام احداث" کو اسی محکمہ سے وابستہ کر دیا تھا، اس کے افسر کے فرائض پولس افسر اور سپہ سالار کے فرائض کے بین بین ہوتے تھے[1]

پولس افسر کے فرائض عموماً بڑے بڑے جنرلوں اور آزاد کردہ غلاموں (عہد عباسیہ میں) کے سپرد کیے جاتے تھے، پولس افسر کے اختیارات کا دائرہ عمل رعایا کے تمام طبقوں تک وسیع نہ تھا۔ صرف بڑے بڑے امرار، بڑے بڑے عہدہ داروں، غنڈوں اور

[1] SAYED AMEER ALI. P. 63.

سرکشوں کی سرکوب مجدود تھا۔

اندلس کے اموی خلفاء کے عہد میں پولیس کے نظام نے بہت ترقی کر لی تھی اندلس میں پولیس کے محکمہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا، بڑا محکمہ، اور چھوٹا محکمہ، بڑے محکمہ کے افسر شاہی ملازمین، خاندانِ شاہی اور بڑے بڑے رتبہ کے لوگوں پر اقتدار رکھتے تھے اور چھوٹے محکمہ کے افسر عام رعایا پر اختیارات رکھتے تھے، بڑے محکمہ کے افسر کے لیے دربار شاہی میں ایک خاص اعزازی کرسی ہوتی تھی، اور دوسرے امراء حکومت پر اس کا اقتدار و اثر ہوتا تھا، اور وہ وزیر اور حاجب کے قریب قریب ہم پلہ ہوتا تھا۔[1]

مصر میں عربوں کی حکومت کے زمانہ میں پولس افسر بہت بڑا عہدہ دار خیال کیا جاتا تھا، جب امیر یا گورنر دار السلطنت سے باہر جاتا تھا تو پولس افسر اس کا قائم مقام ہوتا تھا اس لیے اس عہدہ کو دار السلطنت (فسطاط) کی خلافت بھی کہتے تھے، پولس افسر سلطان اور گورنر کی طرف سے اس کی غیر حاضری میں امامت بھی کرتا تھا، فوج کی تنخواہوں وغیرہ کے معاملات بھی اسی کے سپرد تھے، پولس کا محکمہ عربوں کے مصر فتح کرنے کے بعد شہر فسطاط میں قائم کیا گیا تھا، جب شہر "عسکر" کی بنیاد رکھی گئی تو اس میں باقاعدہ کوتوالی بھی بنائی گئی، اس وقت پولس کا محکمہ دو حصوں میں تقسیم تھا۔

(۱) ادنی پولس (سفلی) اس کا مرکز شہر فسطاط تھا۔

(۲) اعلیٰ پولس، اس کا مستقر شہر عسکر تھا۔

اعلیٰ پولس نام رکھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا مستقر ادنیٰ پولس کے مرکز فسطاط سے بلند مقام عسکر پر واقع تھا جس کی عمارتیں لشکر اور طولون کے پہاڑ و نیز پر تھیں۔[2] جب جوہر صقلی نے مصر فتح کیا اس وقت اس نے پولس اعلیٰ کے محکمہ کو عسکر سے قاہرہ میں منتقل کر دیا تھا۔[3]

---

[1] مقدمہ ابن خلدون، ص ۲۱۸ - ۲۱۹ - [2] ابن میسر ص ۴۵

[3] تاریخ جوہر صقلی دکلی ابراہیم حسن ص ۱۰۲

یہ عجیب اتفاق تھا کہ جس روز جوہر صقلی نے مصر فتح کیا، اُسی روز پولیس افسر کا انتقال ہوا تھا۔ جوہر نے اس کی جگہ جبز کو پولیس افسر مقرر کر دیا تھا۔ اور فی پولیس کا محکمہ فسطاط ہی میں قائم رہا[1] اور جوہر نے اس کا افسر عروبہ بن ابراہیم اور شبلی معرض کو مقرر کیا تھا۔[2]

بلادِ افریقہ (موجودہ بلادِ تونس) میں ابن خلدون کے زمانہ (۸۰۸ھ) تک پولیس افسر "حاکم" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، بلادِ اندلس میں "صاحب مدینہ" (کوتوال) اور مملوکوں کے عہد میں "والی" کے نام سے اسے مخاطب کیا جاتا تھا۔[3]

غرض مسلمانوں کے ابتدائی دور میں پولیس کا محکمہ عدالت کے ماتحت تھا، اس کے فرائض عدالت کے احکام نافذ کرنا اور حدودِ شرعی کو عمل میں لانا تھا، کچھ عرصہ بعد پولیس کا محکمہ ایک مستقل محکمہ بن گیا تھا اور براہِ راست مجرموں کو سزائیں دینا اس کے اختیار میں تھا، اس وقت پولیس افسر کی حیثیت حاجب اور وزیر کے قریباً ہم پلہ تھی۔

[1] ابن دقماق - ج ۴ - ص ۱۱ [2] اتعاظ الحنفا، ص ۹۵ [3] مقدمہ ص ۲۱۸

باب سوم

نظام مالیات

۱۔ بیت المال کے ذرائع آمدنی اور مصارف

۲۔ مصر کا نظام مالیات

مسلمانوں کا نظامِ مالیات

تاریخی نقطۂ نظر سے

مالیات کا صحیح نظام اور آمد و صرف میں توازن ریاست (STATE) کا اہم عنصر ہے ارباب سیاست اس سے ناواقف نہیں، مسلمانوں نے اپنی حکومت کے ابتدائی زمانہ سے مالیات کا شعبہ (بیت المال) قائم کیا اور اس کے نظام کی سطح بلند کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، اس شعبہ کی حیثیت موجودہ "وزارتِ مالیہ" کی تھی اور اس شعبہ کے افسر کی ذمہ داریاں ایک وزیر مال سے کسی طرح کم نہ تھیں۔

ذرائع آمدنی بیت المال کے اہم ذرائع آمدنی، خراج، جزیہ، زکوٰۃ، فیٔ، مالِ غنیمت اور عُشر تھے ذیل میں ان پر ایک اجمالی نظر ڈالی گئی ہے۔

خراج خراج نقد یا پیداوار کی ایک معین مقدار کا نام ہے جو غیر مسلموں کی اُن زمینوں سے لیا جاتا تھا جن پر مسلمانوں نے مقابلہ کے بعد یا صرف صلح کے بعد تسلّط قائم کیا تھا، یہ ضروری تھا کہ مجاہدین کی اجازت سے ان زمینوں کو امیر نے مفادِ عامّہ کے لیے وقف کر دیا ہو، اور ان میں تقسیم نہ کیا ہو، ورنہ خراج کی جگہ عشر (۱/۱۰) لیا جاتا تھا۔[۱]

---

[۱] دیکھیے تفصیل الاحکام السلطانیہ (للماوردی) ص ۱۳۲

خراج وصول کرنے کے دو طریقے تھے، ایک پیمائش کا طریقہ تھا۔ اس میں زمین کی پیمائش یا تخمینہ کے بعد نقد یا پیداوار کی ایک خاص مقدار مقرر کر دی جاتی تھی، اس سے غرض نہ تھی کیا بویا گیا؟ کتنا پیدا ہوا؟ حضرت عمرؓ نے ارضِ سوادؔ کا خراج اسی پیمائش کے طریقہ پر مقرر کیا تھا۔

دوسرا طریقہ بٹوارے کا تھا، اس میں پیداوار کا ایک معین حصہ مقرر کر دیا جاتا تھا یہ طریقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پایا جاتا تھا۔ آپؐ نے اہلِ خیبر سے وہاں کی نصف پیداوار پر مصالحت فرمائی تھی۔

خراج کی مقدار خلافت راشدہ میں زمین کی پیداوار، زرخیزی اور وسائلِ آب پاشی کی آسانیوں کا لحاظ کر کے مقرر کی جاتی تھی، حالات کے اعتبار سے اس میں ردّ و بدل بھی ہوتا رہتا تھا۔

دیوانِ خراج مسلمانوں سے قبل روم وفارس کی حکومتوں میں ٹیکس کا محکمہ قائم تھا، ہر صوبہ میں ایک افسر کے ماتحت بہت بڑا عملہ کام کرتا تھا۔ اس افسر کو ضروری مصارف کا اختیار حاصل تھا لیکن اس کا فرض تھا کہ آمد و خرچ میں توازن کا خیال رکھے۔

مسلمانوں نے روم وفارس پر اقتدار قائم کرنے کے بعد ان محکموں کو باقی رکھا، دفتری زبان تک نہیں بدلی۔ عبدالملک بن مروان کے زمانہ تک شام میں اغریقی، فارس میں فارسی، اور مصر میں قبطی، دفتری زبانیں رائج تھیں، عبدالملک بن مروان نے شام وفارس کی دفتری زبان عربی قرار دیدی تھی، ۸۷ھ میں مصر کی دفتری زبان قبطی کی جگہ عربی عبداللہ بن عبدالملک گورنر مصر نے ولید بن عبدالملک کے حکم سے کر دی تھی[۲]

خراج وصول کرنے کے لیے باقاعدہ افسر مقرر تھے، یہ عموماً گورنر یا سپہ سالار

---

[۱] موصل سے عبادان تک طول میں اور مغرب میں قادسیہ سے حلوان تک۔ تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۔ ص ۲۴۔ [۲] دیکھیے تفصیل مقریزی۔ ج ۱۔ ص ۲۸

ہوتے تھے، ان کا فرض تھا کہ وہ مفادِ عامّہ اور فوجی مصارف کے علاوہ باقی رقم بیت المال کو بھیج دیں، امام ابو یوسفؒ کے الفاظ میں "خراج کا افسر فقیہ ہو، عالم ہو، پاک باز ہو، منصف مزاج ہو، متدین ہو اور خود رائی سے احتراز کرتا ہو"[1]

خلافتِ راشدہ کا زمانہ عدل و انصاف سے معمور تھا، خراج کی وصولی میں گورنروں کو بے اعتدالیوں کی جرأت نہ ہوتی تھی، اس دور میں پیمائش کے طریقے سے خراج وصول کیا جاتا تھا اور زمین کی زرخیزی اور پیداوار کی نوعیت کا لحاظ رکھا جاتا تھا، پورا خراج نقد کی صورت میں ادا کرنا ضروری نہ تھا، پیداوار کی شکل میں بھی دیا جا سکتا تھا۔ ناگہانی آفات اور پیداوار کی کمی کے وقت معاف کر دیا جاتا تھا یا اس میں کچھ تخفیف کر دی جاتی تھی۔ گورنروں کا فرض تھا کہ آب پاشی کی سہولتیں مہیا کریں اور ترقیِ زراعت کی دوسری تدابیر عمل میں لائیں۔

نظامِ محاسبہ حکومت کی طرف سے خراج کے افسروں کا نہایت سختی سے محاسبہ کیا جاتا تھا، حضرت عمرؓ نے احتساب کا ایک مستقل محکمہ قائم کر دیا تھا، اس محکمہ کے افسر، محکمۂ خراج کے عہدہ داروں کی مالی حالت کا جائزہ لیتے رہتے تھے اور اس بات کی سخت نگرانی رکھتے تھے کہ کہیں کسی عہدہ دار کا خرچ اس کی آمدنی سے زیادہ تو نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تھا تو فوراً تفتیش کی جاتی تھی کہ اس عہدہ دار نے خراج کی رقم میں خورد برد تو شروع نہیں کر دی۔ خراج کی رقم میں خرد برد کرنے پر اگر کسی افسر کو معزول کر دیا جاتا تھا تو اُسے دورانِ منصب کی جمع کی ہوئی نصف دولت بیت المال میں داخل کرنی پڑتی تھی، اس میں کسی قسم کی رعایت نہیں کی جاتی تھی، حضرت عمرؓ کو اگر خراج کے کسی افسر کی دولت مندی پر شبہ ہو جاتا تھا تو نہایت سختی سے اس کی تحقیق کراتے تھے، ایک مرتبہ حضرت عمرو بن عاصؓ کی غیر معمولی ثروت پر آپ کو شبہ ہو گیا تو آپ نے اُن کی رعایت نہیں کی اور نہایت سختی سے محمد بن مسلمہؓ کے ذریعہ تفتیش

---

[1] کتاب الخراج للامام ابی یوسفؒ ص ۱۸

کرائی[1]

بنو امیہ نے خراج کا نظم و نسق اعلیٰ پیمانے پر قائم کیا تھا، عبد الملک بن مروان خراج کے بد دیانت افسروں کو برطرف کرنے کے بعد نہایت سختی سے ان کی ثروت کا جائزہ لیتا تھا، اور جن لوگوں پر یہ شبہ ہو جاتا تھا کہ خراج کے افسروں کی امانتیں ان کے پاس رکھی ہیں اُن سے اعتراف کرانے کے لیے اُنہیں سنگین سزائیں دی جاتی تھیں اور ان سے مال و دولت لے کر بیت المال میں داخل کر دیا جاتا تھا، یہ سزائیں اکثر حد و دِ شرع سے متجاوز ہو جاتی تھیں، ان لوگوں کے دلوں میں امانت رکھنے والے افسروں کی طرف سے فطری طور پر نفرت اور دشمنی پیدا ہو جاتی تھی، جو بعض دفعہ نازک صورت اختیار کر لیتی تھی، بنی اُمیہ کا آخر زمانہ فتنہ و فساد کا دور تھا، اس میں خراج کا نظام بھی ابتر ہو گیا تھا، جبر و استبداد، رشوت ستانی اور شخصی عداوت کا دور دورہ تھا، گورنروں میں آمریت کی شان پائی جاتی تھی، نیا گورنر اپنے سابق گورنر کے عملہ کو گرفتار کر لیتا تھا اور اس کی جگہ اپنے ہوا خواہ افراد کو مقرر کر دیا کرتا تھا، بنی امیہ کی تباہی میں اس کا بھی بہت بڑا دخل تھا۔

نظامِ جاگیرداری یہ نظام اپنی ابتدائی شکل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پایا جاتا ہے آپؐ نے مزینہ کے چند آدمیوں کو ایک زمین دی تھی کہ وہ اسے جوتیں بوئیں، اُنہوں نے بے التفاتی سے اسے بے کار پڑا رہنے دیا اور دوسرے لوگ اسے جوتنے بونے لگے، تھوڑی مدت کے بعد مزینہ کے لوگوں نے اسے واپس لینا چاہا تو دونوں میں نزاع پیدا ہوا، قضیہ حضرت عمرؓ کی عدالت میں پیش ہوا، آپ نے فیصلہ کیا، جو شخص زمین کو تین سال تک بے کار پڑا رہنے دے اس کے بعد اگر کوئی دوسرا اسے جوتنے بونے لگے تو وہی اس زمین کا زیادہ حقدار ہے، حضرت عثمانؓ نے عبد اللہ بن مسعودؓ کو نہرین اور سعد بن ابی وقاصؓ کو ہرمز کا جاگیردار بنایا تھا، ان جاگیرداروں کا فرض تھا کہ فوجی

---

[1] دیکھیے تفصیلات طبری ج ۱ ص ۴۴-۶۸۔ [2] ایضاً ج ۲ ص ۵۰۲

اور دوسری ضرورتوں سے بچی ہوئی رقم بیت المال میں داخل کر دیں[1]

منصور نے اپنے چند خاص ارکانِ حکومت کو جاگیردار بنایا تھا یہ ان کی خدماتِ جلیلہ کا اعتراف اور صلہ تھا۔ یہ جاگیریں نہایت سرعت کے ساتھ آبادی سے معمور ہو گئی تھیں اور اسٹیٹ کی فلاح وبہبود پر اس کا نہایت اچھا اثر پڑا تھا، احمد بن طولون نے جب دیکھا کہ فسطاط اور عسکر آبادی اور فوجوں کی کثرت کے لیے ناکافی ہیں تو منصور کی طرح اس نے بھی امراء کو جاگیریں دیدیں کہ انہیں جاکر آباد کریں اور حکومت کے ذرائع آمدنی میں اضافہ کریں۔

جاگیرداری کا یہ جدید نظام عیوب سے خالی نہ تھا، جاگیردار کا مطمحِ نظر زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنا ہوتا تھا تاکہ حکومت کی مال گذاری ادا کرنے کے بعد اپنے لیے بھی کافی رقم بچا سکے، جاگیردار کو اپنی جاگیر پر پورا اختیار ہوتا تھا۔ اور وہ حسبِ خواہش کاشتکاروں پر لگان لگا دیتا تھا اور اسے کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ تھا، کاشتکار شبانہ روز کی مسلسل محنت سے "قبر کا اُگلا ہوا مُردہ" نظر آنے لگتا تھا لیکن وہ لگان بھی بمشکل ادا کرسکتا تھا۔ مرکزی حکومت تک ان بےچاروں کی رسائی نہیں ہوسکتی تھی کہ ان کے خلاف احتجاج کریں، سچ پوچھیے تو جاگیرداروں کے مزید جور و استبداد کے خطرہ سے انہیں اس کی جرأت بھی نہیں ہوتی تھی۔[2]

ڈاکٹر گروہان اڈولف (GRAH MAN ADOLEFE) نے جاگیرداری کے نظام پر بصیرت افروز بحث کرتے ہوئے ایک[3] جگہ لکھا ہے، جاگیر کے پٹہ کی مدت چار سال سے زیادہ نہیں ہوتی تھی، جاگیردار کی ذمہ داریوں میں نہ صرف کاشت وغیرہ کرانا داخل تھا

---

[1] تفصیل ملاحظہ ہو مقریزی ج ۱۔ ص ۹۷۔ الخطط۔ ج ۱۔ ص ۸۲ اور الاحکام السلطانیہ ص ۱۸۵۔ ۱۸۱

[2] تفصیلات ملاحظہ ہوں کتاب الخراج (امام یوسفؒ) ص ۷۱۔ ۷۰۔ ۶۱۔ ۱۸۔

[3] ARABIC PAPERI IN THE EGYPTIAN LIBRARY, VOL. II, P. 64

بلکہ پلوں کی مرمت، آب پاشی کی سہولتیں مہیا کرنا اور زمین کی اصلاح بھی شامل تھی، مدت کی قلت اور مصارف کی زیادتی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جاگیردار ان جاگیروں سے یہ اخراجات پورے کرتے تھے ان جاگیرداروں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اتنی آمدنی حاصل ہوجائے کہ حکومت کا ٹیکس ادا کرنے کے بعد ان کی "دلچسپیوں" کے لیے بھی کافی رقم بچ رہے بیچارے محکوم کاشت کار درمیان میں پستے تھے،

جاگیرداری کا یہ نظام عالم گیر تھا دسویں اور گیارھویں صدی عیسوی کے یورپ نے بھی مسلمانوں کے اس نظام کی تقلید کی تھی۔

جزیہ جزیہ کی رقم ایک معین مقدار کا نام ہے جو ذمیوں سے لی جاتی تھی اور مسلمان ہونے کے بعد ساقط ہوجاتی تھی، خراج اور جزیہ میں اتنا فرق تھا کہ خراج زمین سے لیا جاتا تھا اور مسلمان ہونے سے اس پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا، اور جزیہ جانوں کا ٹیکس تھا اور اسلام لانے سے معاف ہوجاتا تھا، دوسرے جزیہ کی بنیاد "نص قرآنی" پر قائم ہے اور خراج کی اساس "اجتہاد" پر ہے۔

جزیہ ذمیوں پر زکوٰۃ کی جگہ مقرر تھا مسلمان اور ذمی دونوں ایک ریاست (STATE) کے شہری خیال کیے جاتے تھے ان کے حقوق میں کسی قسم کا امتیاز نہ تھا مسلم ریاست ان کے جان ومال کا ذمہ لیتی تھی اور ضروری تھا کہ جزیہ کی رقم ذمیوں کی فلاح وبہبود، تعلیم وترقی اور ان کی دوسری ضروریات پر صرف کی جائے[۵] شریعت نے جزیہ انہیں ذمیوں پر واجب قرار دیا تھا جو اگر مسلمان ہوتے تو ان پر "جہاد" فرض ہوتا۔

جزیہ کی مقدار حسب ذیل تھی۔

(۱) دولت مندوں سے۔ ۴۸ درہم سالانہ (= بارہ روپیہ)

(۲) متوسط طبقہ سے۔ ۲۴ درہم سالانہ (= چھ روپیہ)

(۳) ادنیٰ طبقہ سے ۱۲ درہم سالانہ (= تین روپیہ)

[۵] الاحکام السلطانیہ ص ۱۳۷

غریبوں، بے بسوں، اندھوں، اپاہجوں، مجنونوں اور دوسرے معذور افراد سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا، راہب اگر متمول نہ ہوتے تو انہیں جزیہ ادا نہ کرنا پڑتا تھا، یہ صرف عاقل بالغ اور آزاد مردوں پر واجب تھا، عورتوں اور بچوں سے نہ لیا جاتا تھا[1]

جزیہ اسلام کا جدید تخیل نہ تھا بلکہ یونانیوں نے اسے سب سے پہلے ایشیائے کوچک کے باشندوں پر ۵۰۰ ق م عائد کیا تھا، رومیوں اور ایرانیوں نے ان کی تقلید کی تھی اور اپنی مفتوحہ قوموں پر اسے لازمی قرار دیا تھا، مسلمانوں کا نظام جزیہ ایرانیوں کے نظام جزیہ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے

مسلمان فرماں روا جزیہ وصول کرنے میں عدل وانصاف اور نرمی کا برتاؤ کرتے تھے، اسلام کا قانون تھا کہ جزیہ وصول کرنے کے لیے کسی ذمی کو زدوکوب نہ کیا جائے، نہ دھوپ میں کھڑا کیا جائے۔ نہ بدن داغ کر یا کسی دوسری طرح جسمانی اذیت پہونچائی جائے سہل انکاری کی حالت میں صرف حوالات میں بند کیا جا سکتا ہے مگر ادائیگی کے بعد فوراً رہا کر دیا جائے۔

قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) امام ابو یوسفؒ نے ہارون رشید کو خط میں لکھا تھا، "آپ کا فرض ہے، ذمیوں سے رواداری برتیں، یہ ابن عم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا، ان کی ضرورتوں سے بے خبر نہ رہیے، ان پہ جبر وجور اور زیادتی نہ ہونے پائے جزیہ کے علاوہ اوران کا مال نہ لیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ان آخری الفاظ سے آپ ناواقف نہ ہونگے" ذمیوں سے بھلائی کرنا، ان سے رواداری برتنا، انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دینا[2]" عہد عباسیہ میں ذمیوں کے حقوق کے تحفظ اوران کی دوسری ضروریات کا لحاظ رکھنے کے لیے ایک مستقل محکمہ قائم تھا[3]

---

[1] کتاب الخراج ص ۶۹-۷۲، الجامع لاحکام القرآن قرطبی۔ ج ۸ ص ۱۰۸، الاحکام السلطانیہ ص ۱۳۹

[2] ایضاً ص ۱۳۶، [3] SAYED AMEER ALI, A, SHART HISTORY OF THE - SARACEUS. P. 415

زکوٰۃ

انواعِ زکوٰۃ پانچ ہیں:۔

(۱) سونا، چاندی، سونا بیس مثقال اور چاندی ۲۰۰ درہم ہو، اور ان پر سال گذر جائے تو ۱/۴۰ حصہ دینا پڑتا تھا۔

(۲) مویشی۔ ان میں اونٹ، گائے، بیل اور بھیڑ بکری داخل ہیں، یہ ضروری تھا کہ وہ باربرداری، گھی، دودھ اور افزائشِ نسل کے لیے پالے گئے ہوں، اور سال کی اکثر مدت میں چرتے رہے ہوں، گھوڑے، گدھے اور خچر اگر تجارت کے لیے نہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے [۱]

(۳) سامانِ تجارت۔ تجارت کا سامان اگر سونے چاندی کے "نصاب" تک پہونچ جاتا اور اس پر ایک سال بھی پورا گذر جاتا تو ۱/۴۰ دینا پڑتا تھا۔

(۴) سونے، چاندی کی کان اور خزانہ۔ قانونِ شریعت میں ان دونوں کی ایک حیثیت تھی اگر دار الحرب ہوتا تو ۱/۵ حصہ ریاست کا تھا، ارضِ صلح میں ۱/۴۰ حصہ ریاست کا تھا اور باقی پانے والے کا حق تھا۔ [۲]

(۵) غلہ اور پھل۔ اگر زمینیں بارش اور قدرتی نالیوں کے ذریعہ سیراب ہوتیں تو اُن کی پیداوار کا ۱/۱۰ حصہ لیا جاتا۔ ۱/۲۰ اس وقت لیا جاتا جب اُنہیں سینچنا پڑا ہو اور نشوونما میں کاوشیں اُٹھانی پڑی ہوں۔ [۳]

فے | محارب قوموں کا جو مال بغیر کسی قسم کی جنگ وجدال کے ہاتھ آئے وہ "فی" کہلاتا ہے۔

---

[۱] دیکھیے تفصیل کتب فقہ میں۔ [۲] صحیح بخاری۔ [۳] صحیح بخاری، الجامع الاحکام القرآن۔ ج ۷. ص ۹۹۔ الفقہ علی مذاہب الاربعہ۔

فئے کا ⅕ حصہ، پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاتا، ایک حصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تک آپ کا ہوتا تھا اور باقی چار حصے آپ کے قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور بے زادراہ مسافروں کو دیدیے جاتے تھے ⅘ حصہ حضرت عمرؓ کے ابتدائی دور تک فوج میں سامان جنگ خریدنے کے لیے تقسیم کر دیا جاتا، جب حضرت عمرؓ نے سامانِ جنگ فراہم کرنے کا باقاعدہ انتظام حکومت کی طرف سے کر دیا تو یہ مال بیت المال میں داخل کر دیا جاتا تھا۔

غنیمت مالِ غنیمت، اس مال و دولت کو کہا جاتا تھا، جو مسلمانوں نے غیر مسلموں سے مقابلہ کے بعد حاصل کیا ہو، یہ چار قسم کا ہوتا تھا، مرد قیدی عورتیں اور بچے، زمین اور مال و دولت قیدیوں کے بارے میں امیر کو اختیار تھا کہ فدیہ لے کر رہا کر دے، قتل کر دے یا انہیں مجاہدین میں تقسیم کر دے، اہلِ کتاب کی عورتوں اور بچوں کو مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا اور ان کا قتل جائز نہ تھا، اگر یہ مشرک اور دہریہ ہوتے تھے اور اسلام لانے سے انکار کر دیتے تھے اس صورت میں امیر کو اختیار تھا کہ انہیں غلام بنا لیا جائے یا قتل کر دیا جائے، تقسیم کے وقت یہ خیال رکھا جاتا تھا کہ ماں سے بچہ جدا نہ کیا جائے۔

زمینیں، جن کے مالک قتل، قید یا جلاوطنی کی وجہ سے انہیں خیر باد کہہ گئے ہوں مجاہدین میں تقسیم کر دی جاتیں یا ان کی اجازت سے مفادِ عامہ کے لیے وقف کر دیا جاتا

مال و دولت کا ⅕ حصہ فئی کی طرح پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا اور ⅘ حصہ مجاہدین کا حق سمجھا جاتا، تقسیم میں، سوار کو پیدل سے دُگنا دیا جاتا تھا۔[1]

عشر سامان کا 1/10 حصہ ان غیر مسلم تاجروں سے لیا جاتا تھا جو دار الحرب سے دارالاسلام میں تجارت کرنے آتے، اسے عشر کہا جاتا، یہ سال میں ایک دفعہ ادا کرنا پڑتا تھا۔

---

[1] دیکھیے تفصیل الجامع الاحکام القرآن ج ۸ ص ۱-۲۰۔ ج ۴ ص ۲۳۴ - ۲۳۵ - ۲۳۶، احکام القرآن (ابن عربیؒ) ج ۱ ص ۳۵۴۔ الاحکام السلطانیہ ص ۱۳۵ [2] صبح الاعشیٰ ج ۳ ص ۲۹۲۔

بیت المال کے وسائلِ آمدنی میں گرا پڑا مال، لاوارثی دولت اور زرِ مصالحت بھی داخل تھا۔ خلافتِ راشدہ کے ذرائع آمدنی کا یہ اجمالی خاکہ ہے۔

عہدِ بنی امیہ: بنی امیہ کے دور میں نہ صرف جزیہ کی مقدار بڑھا دی گئی بلکہ اور نئے ٹیکس بھی لگا دیے گئے، امیر معاویہؓ نے اپنے گورنر مصر، وردان کو لکھا تھا "ہر قبطی مرد پر ایک قیراط بڑھا دو" حجاج بن یوسف کے بھائی نے یمن[۱] کی زمینوں پر عشر کے علاوہ ایک اور ٹیکس لگا دیا تھا، عبد الملک بن مروان نے تمام خراسان کی مردم شماری کرائی تھی اور ہر فرد پر ایک جدید ٹیکس لگا دیا تھا اور اسی پر اکتفا نہ کیا تھا بلکہ مقررہ جزیہ کی مقدار میں تین دینار کا اضافہ کر دیا تھا۔[۲] اسی طرح عراق کے باشندوں پر نئے ٹیکس عائد کر دیے گئے تھے، یہ وہ وقت تھا جب انہیں پچھلے ٹیکس ادا کرنے بھی دوبھر تھے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے خراج کے افسروں کے نام حکم جاری کیا تھا، "خراج کے درہموں کی مالیت ۷/۱۴ قیراط سے زیادہ نہ ہو" یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس زمانہ میں مختلف مالیت کے درہم رائج تھے اس لیے افسروں کو اس کا موقع ملتا تھا کہ زیادہ مالیت کے درہم شہریوں سے وصول کریں اور انہیں بدل کر کم مالیت کے درہم بیت المال میں داخل کر دیں۔[۱]

عبید اللہ بن زیاد گورنر عراق نے خراج کے عرب افسروں کی جگہ ایرانی افسر مقرر کر دیے تھے، یہ بڑے بڑے زمیندار تھے اور تجربہ نے بتا دیا تھا کہ وہ زیادہ ایماندار اور صاحبِ بصیرت ہوتے تھے۔[۳]

عبد الملک بن مروان نے اپنے غیر معمولی سیاسی تدبر سے ٹیکس کا نظام نہایت بلند معیار پر پہونچا دیا تھا اور ٹیکس کے افسران کو ایک پائی بھی غبن کرنے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔

---

[۱] کتاب الخراج ص ۲۳۔ [۲] تفصیل ملاحظہ ہو۔ تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۲۵۸
[۳] طبری ج ۲ قسم ثانی۔ ص ۴۵۸ — ۹۹۵۔

وہ نہایت سختی سے ان کا محاسبہ کرتا تھا، رشوت خور اور بددیانت افسروں کو معزول کرکے انہیں لرزہ خیز سزائیں دیتا تھا اور ان سے ایک ایک حبّہ اُگلوا لیتا تھا۔

بنی امیہ کے زوال کے ساتھ ان کا نظام مالیات بھی ابتر ہوگیا تھا، انتہا یہ تھی کہ ۱۳۲ھ = ۷۵۰ء میں جب وہ عباسیوں کے ساتھ موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھے اُس وقت فوج کی تنخواہیں ادا کرنے میں سہل انکاری برتی گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی فوج عباسیوں کے ساتھ مل گئی اور دمشق کے قلعوں پر بنی اُمیہ کی جگہ عباسیوں کا سیاہ پرچم لہرانے لگا۔ یہ آخر ۱۳۲ھ کا واقعہ ہے۔

عہدِ عباسیہ

عباسیوں نے زراعت کی ترقی کو اپنا نصب العین قرار دیا تھا اس کی وجہ سے ریاست کی مالیات پر نہایت اچھا اثر پڑا تھا، اس دور میں، ۱۳۶ھ تک لگان پیمائشی طریقہ سے وصول کیا جاتا رہا، منصور نے اس میں اتنی ترمیم کی کہ گندم اور جو کی پیداوار کے لیے بٹوارہ کا طریقہ نافذ کردیا اور میوہ کے باغات کے لیے پیمائش کا قدیم دستور جاری رہا مہدی نے جب افسروں کی بدعنوانیوں کا ہدف باغات کو دیکھا تو بٹوارہ کے طریقہ کو ہمہ گیر کردیا، زمین اگر بے حد زرخیز ہوتی اور آب پاشی کی دقتوں کا سامنا زیادہ نہ کرنا پڑتا تو پیداوار کا ½ حصہ ریاست کا حق ہوتا ورنہ ⅓، ¼ یا ⅕ حصہ زمین کی نوعیت کے لحاظ سے ادا کرنا پڑتا تھا۔

باغات کے پھلوں کی قیمت کا تخمینہ لگایا جاتا تھا اور ⅓ یا ¼ ریاست کو دینا پڑتا تھا۔ ۲۰۴ھ = ۸۱۹ء ۔ ۸۲۰ء میں مامون نے زرخیز زمین کے ½ حصہ لگان میں تخفیف کرکے ⅖ کر دیا تھا، بابل، کلدان، عراق، الجزیرہ اور فارس کی سرزمینوں سے صلح نامہ کے مطابق ٹیکس وصول کیا جاتا تھا، اس کی وجہ سے وہ افسروں کی بے اعتدالیوں سے مامون تھے شمالی فارس اور خراسان کے باشندے بھی "مصالحانہ ٹیکس" ادا کرتے تھے، خشک سالی اور دوسری آفات کے وقت لگان میں تخفیف کردی جاتی تھی،

مستکفی کے زمانہ میں جب الم انگیز قحط پڑا تھا تو لگان کا ⅓ معاف کر دیا گیا تھا اور ادا کرنے کے لیے ۱۷ر جنوری کی جگہ ۱۵ر مارچ تک مہلت دیدی گئی تھی، پھر اس میعاد کو ۲۱ر جولائی تک بڑھا دیا گیا تھا۔

عباسیہ کے دورِ عروج میں زراعت کی ترقی کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہارون کے زمانہ میں ریاست کی سالانہ آمدنی ۲۷۲ ملین[1] درہم اور ۴ ½ ملین دینار تھی اور مامون کا صرف خرچ ۶ ہزار دینار یومیہ یا (۲،۱۹۰) دینار سالانہ تھا۔[2]

عباسیوں نے خراج کے نظم و نسق میں اپنے سیاسی شعور کا ثبوت دیا تھا، ہارون کے عہد میں امام ابو یوسفؒ نے "خراج" کا ایک شرعی لائحہ عمل بنایا تھا جو سرکاری قانون قرار دیا گیا تھا، اس میں تنظیم خراج آمد و صرف اور مالیات کے دوسرے اہم عناصر کو اسلامی نقطۂ نظر سے بیان کیا گیا تھا۔

دستور کا اجمالی خاکہ یہ تھا۔

(۱) بیت المال کے وسائلِ آمدنی، یہ تین شعبوں میں تقسیم تھے۔

(۱) مالِ غنیمت کا ⅕ حصہ۔

(۲) خراج۔ اس باب میں عشر اور جزیہ کا بیان بھی داخل تھا۔

(۳) صدقات۔

(۲) خراج وصول کرنے کا طریقۂ کار۔

(۳) بیت المال کے ضروری مصارف۔

عباسیوں نے امام ابو یوسفؒ کے اس آئینِ مالیات کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا اور اس پر عمل کرنے کی حتی الامکان کوشش کی تھی۔

---

[1] ۱ ۔ ملین = ۱۰ لاکھ ، ۱ ۔ درہم = ۴ر ، ۱ ۔ دینار = ۵ر

[2] Sayed Ameer Ali, A Short History of the Saraceus, P. 426 Soqs.

بنی امیہ کے عہد حکومت میں لگان نوروز (بیساکھ کی پہلی تاریخ) سے ایک ماہ قبل وصول کیا جاتا تھا، اس وقت تک فصل تیار نہ ہوتی تھی اس لیے کاشت کاروں کو ادائیگی میں بڑی پریشانی اٹھانا پڑتی تھی، ان کا ایک وفد ہشام بن عبد الملک کے پاس آیا تھا، اور درخواست کی تھی کہ اس کی میعاد ایک ماہ بڑھا کر نوروز کر دی جائے، مگر ہشام نے انکار کر دیا تھا، عباسیہ کے زمانہ میں اس کی میعاد نوروز مقرر تھی، ہارون کے دور میں ارباب زراعت یحییٰ بن خالد برمکی وزیر اعظم کے پاس یہ التجا لے کر آئے تھے کہ لگان کی میعاد میں دو ماہ کا اور اضافہ کر دیا جائے یحییٰ نے اس اندیشہ سے رد کر دیا تھا کہ اسے مجوسیت کا تعصب خیال کیا جائے گا۔[1]

متوکل کے عہد میں یہ قضیہ دوبارہ پیش ہوا تو اس نے میعاد میں دو ماہ کا اضافہ کر دیا لیکن مستنصر نے اپنے زمانہ میں وہی میعاد مقرر کر دی تھی جو متوکل سے قبل تھی، معتضد نے اپنے دور حکومت میں متوکل کے زمانہ کی میعاد کو سولہ روز پہلے کر دیا تھا۔

ہارون کے زمانہ میں لگان کی نقد آمدنی تقریباً ۴۲ لاکھ طلائی دینار سالانہ تھی، اس میں خام اشیاء اور دوسری "فتوحات" داخل نہیں تھیں، جن کی قیمت کم و بیش ۵ لاکھ درہم اور ۱۰ لاکھ دینار ہوتی تھی۔[2]

عباسیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ ریاست کی آمدنی میں بھی انحطاط شروع ہوا اور چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں اس کی آمدنی ہارون کے عہد سے ⅓ سے بھی کم رہ گئی تھی آئے دن کے جنگی اخراجات مالیات پر ایک بار گراں تھے، ریاست کے مضمحل اعضا کو ان کی وجہ سے اور بھی سکون نہ تھا۔[3]

[1] البیرونی کتاب الآثار الباقیہ ترجمہ EDWARD — SACHAN. P. 37.

[2] دیکھیے صبح الاعشیٰ ج ۳ ص ۲۷۰ مقدمہ ابن خلدون ص ۲۴۲، حضارۃ الاسلام فی دار الاسلام ۱۸۸۔ کتاب الخراج (ابن قدامہ؟)

[3] CAMBRIDGE MEDIEVAL HISTORY, VOL, IV - P, 151.

ابن خلدون نے عہد مامون کے سرکاری کاغذات سے ٹیکس کی آمدنی کا ایک نقشہ مرتب کیا تھا، اسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے، اس سے عہد مامونی کے شعبہ مالیات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

نمبر شمار	اقلیم	زر نقد	خام پیداوار اور دوسری اشیاء
۱	ارض اسود	۲۷،۸۰۰،۰۰۰ درہم	نجرانی پارچے ۲۰۰
۲	حلوان	۴،۸۰۰،۰۰۰ "	مہر لگانے کی مٹی ۲۴۰ رطل[1]
۳	کسکر	۱۱،۶۰۰،۰۰۰ "	
۴	دجلہ کے اضلاع	۲۰،۸۰۰،۰۰۰ "	
۵	اہواز	۲۵،۰۰۰،۰۰۰ "	شکر ۳۰،۰۰۰ رطل
۶	فارس	۲۷،۰۰۰،۰۰۰ "	عرق گلاب کی بوتلیں ۳۰،۰۰۰ عدد روغن زیتون سیاہ ۲۰،۰۰۰ رطل
۷	کرمان	۴،۰۰۰،۰۰۰ "	یمنی کپڑے کے تھان ۵۰۰ کھجور ۲۰،۰۰۰ رطل
۸	مکران	۴۰۰،۰۰۰ "	
۹	سندھ کا علاقہ	۱۱،۵۰۰،۰۰۰ "	عود ہندی ۱۵۰ رطل
۱۰	سجستان	۴،۰۰۰،۰۰۰ "	خاص وضع کے تھان ۳۰۰ ۲۰ رطل
۱۱	خراسان	۲۸،۰۰۰،۰۰۰ "	نقرہ ۲،۰۰۰ ۴،۰۰۰ عدد ترکی گھوڑے ۱،۰۰۰ غلام ۲۰،۰۰۰ کپڑے کے تھان ۳۰،۰۰۰ رطل بلیلہ۔
۱۲	جرجان	۱۲،۰۰۰،۰۰۰ "	ریشم ۱،۰۰۰ شقہ۔

[1] تقریباً آدھ سیر

نمبر شمار	اقلیم	زر نقد	خام پیداوار اور دوسری اشیاء
۱۳	قومس	۱،۵۰۰،۰۰۰ درہم	۱،۰۰۰ نقرہ
۱۴	طبرستان، ریان اور ماوند	۶،۳۰۰،۰۰۰ "	طبرستانی فرش ۶۰۰ چادریں ۲۰۰ تھان ۵۰۰ رومال ۳۰۰ جام (پیالہ) ۳۰۰
۱۵	ریّ	۱۲،۰۰۰،۰۰۰ "	۲۰،۰۰۰ رطل شہد
۱۶	ہمدان	۱۱،۳۰۰،۰۰۰ "	رب الرّیان ۱،۰۰۰ رطل شہد ۱۲،۰۰۰ رطل
۱۷	بصرہ و کوفہ کا وسطی علاقہ	۱۰،۷۰۰،۰۰۰ "	
۱۸	ما ان		
۱۹	شہرزور	۶،۷۰۰،۰۰۰ "	
۲۰	موصل	۲۴،۰۰۰،۰۰۰ "	شہد ۲۰،۰۰۰ رطل
۲۱	آذربائیجان	۴،۰۰۰،۰۰۰ "	
۲۲	الجزیرہ اور فرات کے اضلاع	۳۴،۰۰۰،۰۰۰ "	غلام ۱،۰۰۰ شہد ۱۲،۰۰۰ مشکیزے چادریں ۲۰ باز ۱۰
۲۳	آرمینیہ	۱۳،۰۰۰،۰۰۰ "	فرش خاص قسم کے ۲۰۔ رقم (ایک مچھلی) ۵۳۰ رطل، سوکاہی ۱۰،۰۰۰ رطل، صونج ۱۰،۰۰۰ رطل، خچر ۲۰۰، بچھیرے ۳۰ عدد
۲۴	برقہ	۱،۰۰۰،۰۰۰ "	
۲۵	افریقہ	۱۳،۰۰۰،۰۰۰ "	فرش ۱۲۰

خام پیداوار اور دوسری اشیاء	زر نقد	اقلیم	نمبر شمار
روغن زیتون ۱,۰۰۰ رطل	۴۰۰,۰۰۰ درہم	قنسرین	۲۶
	۴۲۰,۰۰۰ "	دمشق	۲۷
	۹۷,۰۰۰ "	اردن	۲۸
روغن زیتون ۳۰۰,۰۰۰ رطل	۳۱۰,۰۰۰ "	فلسطین	۲۹
	۲,۹۲۰,۰۰۰ "	مصر	۳۰
یمنی اشیاء آتی تھیں، مگر تفصیل ان کی نہیں ملی۔	۳۷۰,۰۰۰ "	یمن	۳۱
	۳۰۰,۰۰۰ "	حجاز	۳۲
	۳۹۰,۸۵۵,۰۰۰ "	میزان کل	

مامون کے بعد یہ آمدنی گھٹنا شروع ہوئی، اور معتصم کے زمانہ میں ۳۵۰، ۳۸۸، ۲۹۱ درہم، اور تیسری صدی ہجری کے وسط میں ۳۴۰، ۲۹۹،۲۶۵ درہم سے بھی کم رہ گئی تھی۔

بیت المال کے مصارف فرماں روا بیت المال کی آمدنی کو ریاست اور فلاح عامہ کی ضرورتوں پر حسب مصلحت صرف کرتا تھا۔ اہم مصارف یہ تھے،

(۱) گورنروں، قاضیوں، کلکٹروں، بیت المال کے افسر اور ریاست کے دوسرے عہدہ داروں کی تنخواہیں۔

(۲) فوج کی تنخواہیں، یہ تنخواہیں ان اوقات کی ہوتی تھیں جن میں وہ فوجی خدمات انجام

دیتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ اوقات غیر محدود تھے، اور فوجیوں کی تنخواہیں بھی غیر معین تھیں، ان فوجیوں میں مال غنیمت کا ۴/۵ حصہ اور خراج کی آمدنی مساویانہ طور سے تقسیم کردی جاتی تھی۔

حضرت ابوبکرؓ نے بھی اپنے دورِ خلافت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مساویانہ تقسیم کو لائحہ عمل بنایا تھا، حضرت عمرؓ نے اس تقسیم میں اسلام کی سبقت، مرتبہ اور اسلامی خدمات کا لحاظ کر کے تفریق کی تھی، یہ تفریق حسبِ ذیل تھی،

امہات المومنین، اور حضرت عباسؓ کو انفرادی طور سے ۱۰،۰۰۰ درہم سالانہ صرف حضرت عائشہؓ کی یہ خصوصیت تھی کہ آپ کو ۱۲،۰۰۰ درہم سالانہ دیے جاتے تھے امتیازی سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ان کی قدر و منزلت اور ان کے والد حضرت ابوبکرؓ کی اسلامی خدمات اور ان کا اعزاز تھا۔[1] اصحابِ بدرؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ ۵۰۰۰ درہم، اصحابِ بدرؓ کے ہم پایہ مسلمانوں کو ۴۰۰۰ درہم، حضرت عبداللہ بن عمرؓ انصار و مہاجرین کے بعض دوسرے صاحبزادوں کو ۳۰۰۰ درہم، عام صاحبزادوں کو ۲۰۰ درہم، عام مسلمانوں کو حسبِ مراتب ۳۰۰، ۴۰۰ درہم کے درمیان، انصار و مہاجرین کی عورتوں کے حسبِ مرتبہ ۲۰۰۔ ۳۰۰ اور ۴۰۰ اور ۶۰۰ درہم مقرر تھے، یہ وظائف سالانہ تھے اور انفرادی حیثیت سے دیے جاتے تھے

فوج کے افسروں کی تنخواہیں ۷۰۰۰۔ ۸۰۰۰ اور ۹۰۰۰ درہم سالانہ، ان کی خدمات اور فوجی صلاحیت کے لحاظ سے مقرر تھی، ان کی بیویوں اور اولاد کے وظائف

---

[1] تدبیر الاحکام فی تدبیر اہل اسلام بعدی الدین بن جماعۃ المنشور بالعدد الرابع من المجلۃ (۱۹۳۴ء) ص ۳۸۴ - نیز دیکھیے -
ISLAMIEA VON KREMER CULTURGES-
-CHIEBTE DES BVIENTS, TRANS, DQS.
KHUDA BUKHSH. P. 57.

ان میں داخل نہ تھے، ہر افسر کو ڈیڑھ بیگہ گندم کی پیداوار بھی دی جاتی۔

خلافت راشدہ میں فوجوں کی تنخواہوں کا یہی معمول رہا، امیر معاویہؓ نے سیاسی مصلحت کے زیر اثر فوج کی تعداد کے ساتھ ساتھ سپاہیوں کی تنخواہوں میں بھی اضافہ کر دیا تھا، ان کی فوج کی تعداد ساٹھ ہزار تھی اور ۶۰ ملین درہم سالانہ اس پر صرف ہوتا تھا، خلافت بنی امیہ کی بنیادیں جب ذرا مستحکم ہو گئیں تو اس مصرف میں تخفیف کر دی گئی تھی۔[1]

زراعت میں آسانیاں پیدا کرنے کے لیے نہریں کھدوانا۔ بھی بیت المال کے ذمہ تھا، دجلہ و فرات سے بڑی بڑی نہریں کاٹ کر ریاست کے دور دراز حصوں میں آب رسانی کی سہولتیں مہیا کی جاتی تھیں۔

(۴) قیدیوں کے خورد و نوش، لباس اور تجہیز و تکفین کے مصارف۔

(۵) اسلحہ جنگ اور دوسرے جنگی سازوسامان کے اخراجات۔

(۶) ارباب علم و فضل اور علماء کے وظائف

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں باقاعدہ وظیفہ یاب افراد کے نام حکومت کے دفتر میں درج تھے۔ اس وقت ان افراد کی تعداد محدود تھی۔ اس لیے عرب غیر عرب کی تخصیص نہ تھی اور ان وظائف کا دائرہ عمل عجم کے ان نمبرداروں تک وسیع تھا جو ضرورت کے وقت عربوں کی جنگوں میں امداد کیا کرتے تھے، حضرت علیؓ کے زمانہ تک یہی طریقہ عمل رہا تھا۔

بنی امیہ نے عداوت کی وجہ سے علویوں کے وظائف بند کر دیے تھے یا ان میں تخفیف کر دی تھی اور اپنے خاندان کے گراں قدر وظائف مقرر کر دیے تھے، اور ریاست کی آمدنی کا بڑا حصہ ان خاندانی وظائف کی بھینٹ چڑھ جاتا تھا، بنی امیہ کی یہ دور اندیشانہ پالیسی تھی، مقصد اس سیاسی بحران کا مقابلہ تھا جو علویوں اور ان کے حامیوں کے وظائف بند کرنے سے پیدا ہوا تھا۔

[1] تفصیل دیکھیے الاحکام السلطانیہ ص ۱۹۴-۱۹۶- فتوح البلدان ۶۱۴۔ تاریخ یعقوبی۔ ج ۲ ص ۲۱۳

عربوں کو اپنی انفرادیت کا ہمیشہ خیال رہتا تھا اور انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ مفتوحہ ممالک کی جاگیریں عجمی مسلمانوں میں مساویانہ طور پہ تقسیم کی جائیں خطرہ یہ تھا کہ ان کی اکثریت عربوں کی اقلیت پہ مستقبل میں معاشی، سیاسی اور تمدنی لحاظ سے کہیں حاوی نہ ہو جائے۔

مغرب کے ارباب سیاست نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی اصلاحات پہ تفصیل سے بحث کی ہے ان اصلاحات میں آپ نے عرب اور عجم کے مسلمانوں کے معاشی، سیاسی اور تمدنی حقوق مساوی قرار دیے تھے، عربوں کی طرح عجمی مسلمانوں کے وظائف بھی مقرر کر دیے گئے تھے اور اس جزیہ کو معاف کر دیا گیا تھا جسے بنی امیہ کے فرماں رواؤں نے عجمیوں کے مسلمان ہو جانے کے باوجود معاف کرنا سیاسی پالیسی کے خلاف سمجھا تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی ان اصلاحات کا مالیات پر یہ اثر پڑا کہ وظائف کی زیادتی اور جزیہ کی آمدنی بند ہو جانے کی وجہ سے عراق کے بیت المال میں خاک اڑنے لگی، ان کی وفات کے بعد ہشام بن عبدالملک نے مالیات کے شعبہ کی آمدنی کو اعتدال پہ لانے کے لیے جو جابرانہ پالیسی اختیار کی اس کی وجہ سے شورشیں اٹھیں اور ان ہنگاموں نے بنی امیہ کے مستقبل پر بہت برا اثر ڈالا۔

فان فلوتن (Van Vloten) ان اصلاحات پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتا ہے" بنی امیہ کے زوال کا سب سے اہم سبب یہ تھا کہ عرب اور غیر عرب عناصر میں تفریق کی گئی تھی عجمی عنصر سیاسی، تمدنی اور معاشی حقوق میں عرب عنصر کا ہم پلہ قرار نہ دیا گیا تھا، یہ اسلامی آئینِ مساوات کے خلاف تھا۔ بنی امیہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے سب سے پہلے داخلی اصلاحات کی طرف عملی قدم اٹھایا، آپ نے عرب و عجم کے مسلمانوں کے تمام حقوق مساوی قرار دیے، عربوں کی طرح عجمیوں کے وظائف مقرر کر دیے، عجمی مسلمانوں کا قانونِ شریعت کے مطابق جزیہ معاف کر دیا، اندرونی اصلاحات

میں انہماک کی وجہ سے جدید فتوحات کا دروازہ بند ہوگیا اور فوجیں بھی بیت المال پر ایک بار ہوگئیں، ان باتوں کا مالیات کے شعبہ پر بہت برا اثر پڑا اور آمد وصرف میں توازن قائم نہ رہا نتیجہ یہ ہوا کہ آمدنی سے خرچ بڑھ گیا اور حکومت مالی دقتوں میں مبتلا ہوگئی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے زمینوں کو سپاہیوں کی ملکیت سے خارج کر دیا تھا حالانکہ وقت کا تقاضا یہ تھا کہ مزید زمینیں انہیں دی جائیں تاکہ وہ غلہ وغیرہ کی پیداوار سے اپنی ضرورتیں پوری کرتے اور لگان کے ذریعہ حکومت کی آمدنی میں اضافہ کرتے، اس طرح سے مالیات کا بوجھ بڑی حد تک ہلکا ہو سکتا تھا، یہ وقت جدید وظائف مقرر کرنے کا نہ تھا بلکہ ضرورت اس کی تھی کہ عربوں کے وظائف بھی بند کر دیے جاتے، اس وقت بیت المال کی حالت وظائف کی متحمل نہ تھی، امویوں کے سیاسی دشمن مدت سے وقت کے منتظر بیٹھے تھے، ہشام بن عبدالملک نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی اصلاحات کی ناکامی کے بعد مالیات کی حالت کو اعتدال پر لانے کے لیے جو سخت گیرانہ پالیسی اختیار کی اس کی وجہ سے امویوں کے خلاف سازشیں کرنے کا اور موقع ملا۔ یہ وہ وقت تھا جب بنی امیہ کی سیاسی کمزوریوں کی وجہ سے ہشام کے سر پر تاجِ خلافت لرز رہا تھا۔[1]

---

[1] REEHERS SURLA DOMINATION ARABE. P. 50–60.

نیز دیکھیے تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۳۷۵،

۲۔ مصر کا نظامِ مالیات

عربوں کی تسخیر سے عہدِ طولون تک

حضرت عمرؓ نے مصر کی آراضی کو مسلمانوں کی ناقابلِ تقسیم ملکیت قرار دیا تھا اور یہ زمینیں کاشت کاروں کو لگان پر دیدی گئی تھیں، قبطیوں کو مصر کا شہری تسلیم کیا تھا، اور ان پر جزیہ لگادیا تھا، بلادِ مصر کے رومی باشندے محارب قوم کی حیثیت سے مقابلہ پہ آئے تھے اس لیے مسلمانوں نے ایک ایک کر کے انہیں وہاں سے نکال باہر کیا تھا۔

۹۶ھ = ۷۱۵ء میں ولید بن عبد الملک کی طرف سے ابن رفاعہ کی سرکردگی میں ایک کمیشن مصر کی مردم شماری اور جزیہ ادا کرنے والوں کے صحیح اعداد وشمار پیش کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا، اس کمیشن نے مختلف مقامات کا دورہ کیا تھا اور مسلسل نو ماہ کی کوششوں کے بعد اپنی رپورٹ پیش کی تھی، اس میں بیان کیا گیا تھا، مصر کی بستیوں کی تعداد دس ہزار سے اوپر ہے اور کوئی بستی ایسی نہیں ہے جس کے باشندوں میں سے پانچ سو سے کم آدمی جزیہ ادا کرتے ہوں۔

ابن رفاعہ کی رپورٹ کے مطابق جزیہ ادا کرنے والوں کی تعداد حسبِ ذیل ہوگی

۱۰،۰۰۰ × ۵۰۰ = ۵ ملین نفوس، یہ تعداد مصر کی آبادی کا ۱/۳ حصہ تھی۔[۱]

---

[۱] کتاب فتوح مصر (ابن عبد الحکیم) ص ۱۵۶

حضرت عمرؓو بن عاص کے زمانہ میں ہر ذمی پر دو دینار = ۱۰ روپیہ عائد کیے گئے تھے، بچہ بوڑھے، عورتیں اور معذور مستثنیٰ تھے، اس وقت جزیہ ادا کرنے والوں کی تعداد ۸ ملین نفوس تھی۔[1]

اس جگہ یہ خلجان پیدا ہوتا ہے کہ اس حساب سے جزیہ کی رقم ۱۶ ملین دینار ہوئی اور یہ مسلّم ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس جزیہ کی آمدنی ۱۲ ملین دینار پہونچتی تھی، ممکن ہے اس کا یہ جواب دیا جائے "حضرت عمرؓو بن عاص ۴ ملین فوجی مصارف اور ان جدید اصلاحات کے لیے رکھ لیتے تھے، جنہیں وہ مصر میں مستقبل قریب میں جاری کرنا چاہتے تھے"۔

یہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا کہ خلافتِ راشدہ اور بنی امیہ کے زمانہ میں بلادِ مصر کی مجموعی آبادی ۱۵ - ۱۸ ملین نفوس کے مابین تھی۔[2]

حضرت عمرؓو بن عاص مصر کے ذمیوں سے مصالحت کی شروط کے مطابق دو دینار فی کس جزیہ وصول کرتے تھے، جو موجودہ سکہ کے حساب سے ملیم، قرش، گنی تھا۔ سٹانلی لین پول (STANLEY LANE POOL) نے اپنی کتاب (COMIS AND MEDELS) میں تحقیق پیش کی ہے کہ ایک دینار = ۱۱۵ ملیم کا تھا۔

حضرت عمرؓو بن عاصؓ لگان وصول کرنے کے وقت دریائے نیل کے مدّ و جزر اور پانی کی کثرت اور قلت کا لحاظ رکھتے تھے خراج کی زیادتی اور تخفیف کا اسی پر دار و مدار تھا، ان غیر اختیاری مجبوریوں کی وجہ سے بعض دفعہ لگان کی وصولی میں تاخیر ہوجاتی تھی، اور وہ مدینہ کو خراج کی رقم دیر میں بھیجتے تھے، یہ تاخیر حضرت عمرؓ کو بہت ناگوار تھی، آپ خراج کے معاملہ میں نہایت سخت تھے، حضرت عمرؓو بن عاصؓ نے پہلے سال ۱۰ ملین دینار خراج روانہ کیا تو انہیں کوئی خوشی نہ ہوئی۔ دوسرے سال ۱۲ ملین دینار بھیجے، اُس وقت بھی اُنہیں کوئی خاص

---

[1] کتاب فتوح مصر ص ۸۷
[2] دیکھیے ملن MILNE کی کتاب EGYPT UNDER ROMAN RULE.

مسرت نہ ہوئی انہیں معلوم ہوا تھا کہ مقوقس (حضرت عمرو بن عاصؓ سے قبل رومیوں کی طرف سے مصر کا گورنر) کے دور میں مصر کا خراج ۲۰ ملین دینار تھا، فراعنہ مصر کے زمانہ میں مصر کا خراج بعض مورخین نے ۴۰۰۰۰۰ر ۴۲ دینار بیان کیا ہے، ریان بن ولید جو حضرت یوسف (علیہ السلام) کے زمانہ کا فرعون مصر تھا۔ کے دور میں ۲۷۰ ملین دینار بیان کیا جاتا۔ لیکن یہ تحقیق اُس قیامت خیز قحط کا تصور کرتے ہوئے، جو حضرت یوسف (علیہ السلام) کے زمانہ میں مسلسل سات برس تک مسلط رہا تھا ایک افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ہے۔

اگر حضرت عمرؓ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ مصر کے باشندے قبل اسلام جو خراج ادا کرتے تھے اب اس کا ½ بھی نہیں ادا کرتے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، حضرت عمرؓ کو حضرت عمرو بن عاصؓ پر شبہ ہوا، یہ شبہ طبعی تھا، بعض مورخین نے اس قرینہ سے اسے مزید تقویت دی ہے کہ حضرت عمرو بن عاصؓ نے وفات کے بعد ترکہ میں قریبًا ۷۵ جریب خالص سونا چھوڑا تھا۔

حضرت عمرؓ اور حضرت عمرو بن عاصؓ کی اس سلسلہ میں طویل خط و کتابت[1] ہوئی آپ نے ان سے اپنے شک و شبہ کا اظہار کیا، حضرت عمرو بن عاصؓ نے رفع کرنے کی کوشش کی، اگر ہم اس کا تصور کریں کہ خراج کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ فوجوں کی تنخواہوں اور مفادِ عامہ مثلاً نہریں کھدوانا، پل تعمیر کرانا وغیرہ میں صرف ہو جاتا تھا تو حضرت عمرو بن عاصؓ پر شبہ کی گنجائش نہیں رہتی، وہ سیاسی ماحول کی مصلحتوں سے خوب واقف تھے اور اسی زاویۂ نظر سے اخراجات میں کبھی بخل نہ کرتے تھے، حضرت عمرؓ کے ان الفاظ سے "اب ½ حصہ خراج بھی قبل اسلام کے اعتبار سے مصر ادا نہیں کرتا ہے" یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرو بن عاصؓ نے رومیوں کے عائد کیے ہوئے ان بے شمار بھاری ٹیکسوں میں تخفیف کر دی تھی، جو مدت سے ان کے لیے ناقابلِ تحمل تھے، ملن کی نظر میں حضرت

[1] دیکھیے ابن عبد الحکیم۔ ص ۱۵۸

عمرو بن عاصؓ کے زمانہ میں خراج کی آمدنی کے کم ہونے کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے بہت سے ٹیکس معاف کر دیئے تھے اور وہ اپنے دور میں ہر ایسا کام کرنے سے احتیاط کرتے تھے جس سے مصریوں میں انتشار پیدا ہو۔

حضرت عمرؓ کے سامنے ایک قبطی مدبر نے اسلامی دور میں خراج کی آمدنی کی قلت کا ایک سبب یہ بیان کیا تھا "آپ کا گورنر (حضرت عمرو بن عاصؓ) ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے۔ زمین کی اصلاح و ترقی کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا، جو کچھ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے اس سے خراج وصول کر لیتا ہے گویا اس کا ارادہ ایک سال سے زیادہ وہاں رہنے کا نہیں ہے"۔

عہد اسلام میں غیر مسلموں سے آمدنی کے دو ذریعے تھے، ۱۔ شخصی ٹیکس یہ جزیہ تھا ۲۔ اراضی کا ٹیکس، ان دونوں کی مجموعی آمدنی کو خراج کہا جاتا تھا۔

اگر بعض مورخین کے قول کے مطابق خراج کے دائرہ عمل کو جزیہ تک محدود کر دیا جائے، تو مصر کی آبادی کا فتح اسلام کے وقت متعین کرنا کتنا دشوار ہے اس کا اندازہ دو بلند پایہ مورخین کی روایات سے کیجیے، ان میں ایک ابن عبد الحکیم (متوفی ۲۶۷ھ ۸۷۱ء) مصنف "فتوح مصر و المغرب" کی روایت ہے جو اسلامی مصر کا سب سے پہلا مورخ ہے، دوسری بلاذری (متوفی ۲۷۹ھ ۸۹۲ء) مصنف "فتوح البلدان" کی ہے جو ابن عبد الحکیم کا ہم عصر تھا۔

ابن عبد الحکیم نے بیان کیا ہے، حضرت عمرو بن عاصؓ کے زمانہ میں بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو چھوڑ کر ۸ ملین افراد پر جزیہ لگایا گیا تھا، اس بیان کے مطابق اگر جزیہ ادا کرنے والوں کی تعداد ⅓ حصہ خیال کی جائے تو مصر کی آبادی ۲۴ ملین نفوس پر ہوگی اور اس کو تسلیم کرنا دشوار ہے کیونکہ اگر یہ صحیح مان لیا جائے تو صرف جزیہ کی آمدنی ۱۶ ملین دینار ہوگی حالانکہ مورخین کا اتفاق ہے کہ جزیہ اور لگان دونوں کی مجموعی آمدنی حضرت عمرو بن عاصؓ

کی گورنری کے پہلے سال ۱۰ ملین دینار تھی اور دوسرے سال ۱۲ ملین دینار سے زیادہ نہ بڑھی تھی۔

بلاذری نے بیان کیا ہے، حضرت عمرو بن عاص نے ہر مصری پر عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو چھوڑ کر دو دینار عائد کیے تھے، اس وقت مصر کا خراج جس میں جزیہ کی آمدنی بھی شامل تھی، ۲۰ ملین دینار تک پہونچ گیا تھا، اگر ہم یہ مان لیں کہ اس میں جزیہ کی آمدنی ایک ملین دینار تھی تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ۵ لاکھ نفوس جزیہ ادا کرتے تھے اس تخمینہ پر مصر کی آبادی ۲ ملین نفوس سے زیادہ نہیں ہوتی ہے۔

مصر کے خراج کا نظام غیر تغیر پذیر نہ تھا، بلکہ حالات کے اعتبار سے اس میں تبدیلی ہوتی رہتی تھی، جزیہ کی آمدنی مصریوں کے کثرت سے مسلمان ہونے کی وجہ سے برابر گھٹتی رہی تھی دوسری طرف زمینوں کا لگان موسمی حالات، پلوں کی تعمیر اور زمین وغیرہ کی اصلاح و مرمت اور دوسری زراعتی سہولتوں کے اعتبار سے گھٹتی بڑھتی رہتی تھی، ان امور کی وجہ سے "آمدنی" سے "آبادی" کی صحیح تعداد نہیں معلوم کی جاسکتی ہے۔

حضرت عثمان نے اپنی خلافت میں حضرت عمرو بن عاص کو معزول کر دیا تھا اور ان کی جگہ ان کے رضاعی بھائی عبداللہ بن ابی سرح کو گورنر مقرر کیا تھا، ابن سرح نے نہایت سختی سے خراج وصول کیا اور اس سختی کی وجہ سے خراج کی مقدار ۱۴ ملین دینار تک پہونچ گئی حضرت عثمان نے طنزاً حضرت ابن عاص سے کہا تھا "مصر کی دودھار اونٹنی کا سمجھ دار دودھ والا دیکھا؟ حضرت ابن عاص نے جواب دیا تھا "جی ہاں! سچ ہے لیکن اس نے اس کے معصوم بچہ کو باندھ کر دوہا ہے"، ابن ابی سرح نے ہر ذمی پر دو دینار کی جگہ تین دینار لگا دیے تھے، اگر اس زمانہ میں بہت سے مصری مسلمان نہو جاتے تو ممکن تھا کہ ۱۶ ملین دینار تک خراج کی مقدار پہونچ جاتی۔

حضرت امیر معاویہ کے زمانہ میں جب دوبارہ حضرت عمرو بن عاص مصر کے گورنر

مقرر ہوئے، اُس وقت جزیہ کی آمدنی ۹ ملین دینار رہ گئی تھی[1] یہ آمدنی مصریوں کے کثرت سے مسلمان ہونے کی وجہ سے برابر گھٹتی رہی حتیٰ کہ حضرت عمرو بن عاصؓ کے آخری زمانہ میں صرف ۵ ملین دینار سالانہ رہ گئی تھی۔

خلافت راشدہ اور امویوں کے زمانہ میں مصر کا مزروعہ رقبہ قریب قریب ۷ ملین فدان تھا (ایک فدان = ۵۹۲۹ گز) اس میں سے ۲/۳ حصہ پر گندم اور جو کی کاشت ہوتی تھی، ایک فدان کی پیداوار ۷ کیلات (ا۔ کیلہ = ۲ مد۔ ایک مد = ۵۶ تولہ ۹ ماشہ) تھی اس حساب سے کل رقبہ کی پیداوار یہ ہوگی،

(فدان ۷ × کیلہ ۴) / ۱۲ = ۲،۳۳۳،۳۳۳ ارداب (ایک اردب = ۲۴ صاع۔ ایک صاع ۲۳۴ تولہ) اگر ہم زمین کا لگان ۲٪ حساب سے فرض کریں تو حکومت کا حصہ اس پیداوار میں سے (۲،۳۳۳،۳۳۳ × ۲) / ۱۰۰ = ۴۶۶۶۶۶۶ اردب ہوگا۔

زمین کا لگان ۲٪ تھا، اس پر ایک ہلکی سی روشنی یعقوبی[2] کے یہ الفاظ ڈالتے ہیں "حضرت عمرو بن عاصؓ نے اسکندریہ اور مصر کے دوسرے صوبوں پر قبضہ کرنے کے بعد پہلے سال باشندوں سے پیداوار کا دو فیصدی وصول کیا تھا"[3]

خلافت راشدہ اور امویوں کا زمانہ مجموعی حیثیت سے عدل و انصاف اور رواداری کا زمانہ تھا۔ اس دور میں جزیہ کے وصول کرنے میں گورنروں کی طرف سے معمولاً سخت گیری نہیں برتی گئی، اور خلفاء کے دل میں مال و دولت کی غیر معمولی ہوس نہ تھی، امویوں کا آخر دور اس سے مستثنیٰ ہے اس زمانہ میں بدعنوانیاں پائی جاتی ہیں، مثلاً سلیمان بن عبد الملک

---

[1] کتاب البلدان (یعقوبی) ص ۳۳۹ [2] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۷۶ - ۱۷۷ [3] مزید تفصیل کے لیے دیکھیے فتوح البلدان۔ بلاذری ص ۲۱۴ - ۲۱۵

(۹۶ - ۹۹ ھ) کے زمانہ میں خراج کے افسر اسامہ بن زید نے خراج نہایت سختی سے وصول کیا تھا اس کی وجہ سے مصر کا خراج دس ملین دینار تک پہونچ گیا تھا[1]

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ایوب بن شرحبیل[2] کو مصر کا گورنر مقرر کیا تھا، اس نے آپ سے درخواست کی تھی "اجازت ہو تو مسلمان ہونے کے بعد بھی جزیہ معاف نہ کیا جائے لوگ محض جزیہ کی وجہ سے مسلمان ہو جاتے ہیں اس کا تعلق دل سے نہیں ہوتا" حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے نہایت سختی اور حقارت سے اس درخواست کو ٹھکرا دیا تھا۔

کندی[3] نے لکھا ہے، ہشام بن عبد الملک کے زمانہ میں جب ابن حجاب گورنر مصر نے دریائے نیل سے سیراب ہونے والے تمام رقبہ کی پیمائش کرائی تھی تو یہ آراضی ۳۰ ملین فدان نکلی تھی، یہ بیان مبالغہ سے خالی نہیں ہے، مقریزی نے اور کمال کیا ہے اس کی تحقیق ہے یہ پیمائش شدہ زمین سو ملین فدان تھی۔

مصر کے گورنروں نے جزیہ کی آمدنی میں روز بروز انحطاط دیکھا تو انہیں آمدنی بڑھانے کا خیال پیدا ہوا اور زراعتی ترقی کی طرف متوجہ ہوئے، اور اراضی کی تعمیر و اصلاح، آب رسانی کا انتظام اور دوسری ترقی زراعت کی تدابیر اختیار کیں، مقصد یہ تھا کہ اس سے حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہو، اور وہ جزیہ کی طرح غیر مستقل نہ ہو، یہ کام حکومت کا بہت بڑا شعبہ بن گیا، اور زمین کی پیمائش اور پیداوار کی نگرانی کے لیے جدید دفاتر کا قیام عمل میں آیا، ان دفاتر میں صدہا اشخاص کام کرتے تھے، جن کی تنخواہوں پر اس صیغہ کی آمدنی کا ایک بہت بڑا حصہ صرف ہو جاتا تھا اور کچھ زیادہ بچت نہ ہوتی، مقریزی[4] کا بیان ہے، صرف ہارون رشید کے زمانہ میں اس صیغہ سے ۱۰۸۰۰۰ دینار کی بچت ہوتی

---

[1] الخطط ج ۱ ص ۹۹ [2] ایضاً (مقریزی)۔ تاریخ التمدن اور الادارۃ الاسلامیہ میں حیان بن شریح کا نام ملتا ہے۔ [3] کتاب الولاۃ ص ۳۰۱
[4] الخطط ج ۱ ص ۷۵

بن عیسیٰ ہاشمی نے کی تھی ورنہ معمولاً خرچ آمدنی کے برابر ہو جاتا تھا۔

مدینہ (خلافت راشدہ) اور دمشق (بنی امیہ) کی حکومتوں نے، حکومت روما کی طرح پیداوار کی تنظیم اور پیداوار کی ہر نوع پر ٹیکس نہ لگایا تھا، حکومت مدینہ نے صرف گندم پر ٹیکس عائد کیا تھا، حالانکہ حکومت روما نے قلیل سے قلیل نوع پیداوار کو بھی ٹیکس سے مستثنیٰ نہ کیا تھا، ان کے دور میں ابریشم تک پر ٹیکس تھا، دوسرے اسلامی حکومت نے صرف ۲ ٪ ٹیکس لگایا تھا اور رومیوں کے ہاں کم سے کم ٹیکس کی مقدار ۱۰ ٪ تھی، اس کی وجہ سے مسلمانوں کی دولت سے بے نیازی نہ تھی، حضرت عمرؓ کی خراج کے معاملہ میں سختی سب جانتے ہیں، سچ پوچھیے تو اس کا سبب مسلمانوں کے دفتری نظم و نسق کی ابتری اور زراعت کی اصلاح و ترقی میں عملی حصہ لینے سے گریز تھا، ان کا دفتری نظام رومیوں کی طرح باقاعدہ نہ تھا ان کا مطمح نظر صرف یہ تھا کہ خراج کی پوری مقدار وصول ہو جائے، انہیں اس سے کوئی مطلب نہ تھا کیا بویا گیا؟ کب بویا گیا؟ دوسری طرف حکومت روما ہر کام میں دخل دیتی تھی، کاشت کاروں کو مشورہ دیتی، زراعت کی عملی تعلیم دیتی، اصلاح و ترقی سے غیر معمولی دلچسپی لیتی، اور اس کی نظر میں رہتا کہ کیا بویا گیا، کیسے بویا گیا؟ کتنا بویا گیا؟ وغیرہ وغیرہ۔

اسلامی حکومتوں کی بلادِ مصر میں زراعت کی اصلاح و تنظیم سے غفلت، زیادہ سے "زیادہ خراج کی وصولی سے دلچسپی" کا انجام یہ ہوا کہ بعض خلفاء گورنروں کے جبر و استبداد کی پرواہ نہ کرتے تھے، ان کے نزدیک وہ بے اعتدالیاں درخورِ التفات نہ تھیں جن کا گورنر خراج وصول کرتے وقت مظاہرہ کرتے تھے، مرکزی حکومت کی اس بے نیازی کی وجہ سے وہ نہایت اطمینان سے اتنا سرمایہ جمع کر لیتے تھے جو معزول ہونے کے بعد ان کی دلچسپیوں میں کوئی تخفیف نہ پیدا ہونے دیتا، یہ وہ وقت تھا جب گورنر صبح و شام معزولی کے منتظر رہتے تھے۔

نظام مالیات

طولونیوں اور اخشیدیوں کے دور میں

عباسی خلیفہ، متوکل کے زمانہ میں احمد بن مدبر، مصر کا افسر خراج مقرر کیا گیا، اس نے بہت سے جدید ٹیکس عائد کر دیے اور نہایت سختی سے انہیں وصول کیا، اس جدید افسر نے بلادِ مصر کی آراضی کا ٹیکس دو جنسوں میں تقسیم کر دیا، خراجی، ہلالی، خراجی میں غلّہ کھجوروں، انگور کی بیلوں اور میوہ جات کے باغات کی پیداوار کا ٹیکس داخل تھا، اس میں ان "فتوحات" کا شمار نہ تھا جو کاشت کاروں سے بطور ہدیہ کے لی جاتی تھیں، مثلاً بکریاں، مرغیاں وغیرہ، ہلالی، گھاس اور مچھلی وغیرہ کا ٹیکس تھا، یہ جدید ٹیکس علم وفن کی ترقی آب پاشی کی سہولتیں مہیا کرنے اور دوسرے مفاد عامہ کے لیے تعمیری کاموں کے نام سے عائد کیے گئے، جو کبھی شرمندہ عمل نہ ہوئے اور فکر وعمل کا دائرہ خراج وصول کرنے تک محدود رہا، جزیہ کی آمدنی دار الخلافت روانہ کر دی جاتی، باقی رقم جن مدوں میں اٹھتی تھی انہیں مفاد عامہ سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا،

روپیہ بٹورنے کی اس جنونانہ ہوس اور زراعت کی ترقی واصلاح اور آبپاشی وغیرہ کی آسانیاں مہیا کرنے کی طرف سے بے نیازی کا یہ اثر ہوا کہ لگان کی آمدنی صرف ۸ لاکھ دینار رہ گئی حالانکہ حضرت عمرو بن عاصؓ کے زمانہ میں اس کی آمدنی ۱۲،۰۰۰،۰۰۰ دینار تھی، اور ان کے جانشین عبد اللہ بن سعد کے زمانہ میں ۴،۰۰۰،۰۰۰ تک پہونچ گئی تھی۔

ابن مدبر کی اس ذہنیت اور سخت گیرانہ رویہ سے ملک کے باشندوں میں

ایک ہیجان پیدا ہوگیا اور اس کے خلاف شورشیں اٹھنے لگیں، اس سیاسی ماحول میں بغداد کی مرکزی حکومت کی طرف سے یارجوح مصر کا گورنر مقرر کیا گیا، اس نے ابن مدبر کا نہ صرف موجودہ منصب برقرار رکھا بلکہ اپنا نائب قرار دیا، مصریوں کے جذباتِ عداوت کے لیے یہ اور تازیانہ ہوا، ابن مدبر بھی اس صورتِ حالات سے ناواقف نہ تھا، جب اسے اپنا انجام بد دکھائی دیا تو اس نے اپنے بھائی ابراہیم کے ذریعہ مرکزی حکومت میں کوشش کی اور تاج خلافت کی طرف سے اس کا تبادلہ کر دیا گیا اور دمشق، فلسطین اور اردن کا افسر خراج بنا دیا گیا یہ ۲۵۷ھ کا واقعہ ہے، مصر کا افسر خراج، ابن مدبر کی جگہ احمد بن محمد (احمد بن خالد، وزیر اعظم خلافت بغداد کے خواہرزادہ) کا تقرر عمل میں آیا۔

یارجوح کی وفات ۸ رمضان المبارک ۲۵۹ھ کے بعد احمد بن طولون اس کا جانشین مقرر کیا گیا، اس نے ابن مدبر کو مصر کی وزارت سونپ دی اور سرحدات کا نظم و نسق بھی اسی کے ہاتھ میں دیدیا، ۲۶۳ھ میں جب خلیفہ عباسی نے ابن طولون سے خراج کا تقاضا کیا تو اس نے یہ کہکر ٹال دیا "خراج کا معاملہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہے" ابن طولون کے زمانہ میں ابن مدبر کا اقتدار بہت بڑھ گیا اور نظام حکومت، عدالت، فوج، اور مالیات سب پر اس کا اثر و نفوذ تھا۔

احمد بن طولون، عزم و ہمت، اور پختہ کاری میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے، اس نے آمدنی کی ایک بہت بڑی مقدار ملکی اصلاحات پر صرف کی، زراعت کی طرف خصوصی توجہ کی پل تعمیر کرائے، نہریں جاری کیں، اور زراعت کی ترقی و اصلاح کی دوسری تدبیریں اختیار کیں، ان تمام کوششوں کے باوجود مصر کی مجموعی آمدنی ۴۳۰۰۰۰۰ دینار سالانہ سے آگے نہ بڑھ سکی، اس رقم میں صنعت و حرفت کا ٹیکس، اور جزیہ کی آمدنی بھی داخل ہے، اگرچہ اس وقت جزیہ کی آمدنی نہ ہونے کے برابر تھی۔

لین پول کا بیان ہے، ابن طولون کے زبردست کارناموں اور بے شمار

اصلاحات کے مقابلہ میں بلادِ مصر کی مجموعی آمدنی کافی نہیں ہوسکتی، اس بنیاد پر ابن طولون کی طرف منسوب کیے ہوئے چند من گھڑت واقعات کی دوسرے مورخوں کی طرح اس نے بھی تصدیق کی ہے، مثلاً ابن طولون کو "صحرا" میں ایک خزانہ ملا تھا جس سے اس نے "مارستان" کی تعمیر کی، ایک خزانہ "جبل" میں ملا تھا جو کئی ملین تھا، جس سے جامع مسجد اور پل کی تعمیر کی، یہ قصے افسانوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ واقعات صحیح ہیں، جب بھی ان کی مقدار بقول مورخین کے دو ملین سے زیادہ نہ تھی جو دو سال کے خراج کی آمدنی سے بھی کم تھی۔

ابن طولون کا معمول تھا کہ ہر ماہ اوسطاً ایک ہزار دینار غربا اور ایک ہزار دینار فلاح و بہبودی کے کاموں پر روزانہ صرف کرتا تھا، اس وقت ملک فقر و فاقہ کی مصیبت میں مبتلا تھا، اور صنعت و حرفت اور زراعت کی حالت نہایت ابتر تھی، اس حالت میں ملک کی فلاح و بہبودی اور اصلاح و ترقی کے لیے اٹھا، صنعت و حرفت کا احیا کیا، زراعت کی ترقی کی عملی تدبیریں اختیار کیں، ان محنتوں کا ثمرہ یہ نکلا کہ ریاست کی آمدنی ۴۳۰۰۰۰۰ دینار تک پہونچ گئی، حالانکہ اس سے قبل ابن مدبر کے زمانہ میں گھٹ کر صرف ۸۰۰۰۰۰ دینار سالانہ رہ گئی تھی۔

ابن طولون نے ہمہ گیر اصلاح و ترقی سے ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ اسے خراج کی وصولی میں کبھی سختی کرنے کی نوبت نہ آئی۔ لین پول نے جو سختی کا الزام لگایا ہے وہ صحیح نہیں ہے بلادِ مصر کو ابن طولون نے ایک نئی زندگی بخشی، اس کے زمانہ کی عام فلاح و بہبودی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ گیہوں اس کے دور میں فی دینار ۱۰ اردب تک فروخت ہوئے تھے،

خمارویہ کے دورِ حکومت میں مصر کا خزانہ خالی ہونا شروع ہوا، اور اس کی غیر معمولی سخاوت، فوج پر بے شمار انعام و بخشش اور اپنی بیٹی کے جہیز کے بے پناہ اخراجات کی وجہ سے

چند روز میں خاک اُڑنے لگی، دوسرے خلیفہ کی خدمت میں ۲۰۰۰۰۰ دینار سال ماقبل کا اور ۳۰۰۰۰۰ دینار سالانہ سال رواں کا پیشگی خراج ایک ساتھ روانہ کرتا تھا، اس "نیازمندی" سے خوش ہوکر خلیفہ نے اسے فرات اور برقہ کے مابین بلاد کا حاکم بنادیا تھا، وہاں کی امامت مالیات، اور عدالت کے اختیارات و فرائض بھی اسی کو حاصل تھے اور اس کی اولاد بھی تیس برس تک ان بلاد پر حکمراں رہی تھی۔

خمارویہ نے نہایت بے دردی سے اپنی بیٹی کے جہیز میں کروڑوں دینار لٹادیے تھے جس کی وجہ سے مصر کے بیت المال میں دھول اُڑنے لگی تھی، مورخین کا بیان ہے کہ اس جہیز کی مثال مصر کی تاریخ میں نظر نہیں آتی۔

کافور اخشیدی نے زراعت کی ترقی میں نہایت جد وجہد سے کام لیا تھا جس کی وجہ سے مصر کے خراج کی آمدنی میں ۴ ملین دینار کا اضافہ ہوگیا، بدقسمتی سے اخشیدیوں کے آخری دور (۳۲۴ – ۳۵۸ھ) میں دریائے نیل کا پانی گھٹ گیا۔ اور برابر ۹ برس (۳۵۱ – ۳۶۰ھ) تک یہ حالت قائم رہی، اس زمانہ میں بلادِ مصر دوگونہ مصیبت میں مبتلا تھے، قحط اور وبا، سخت مہنگائی کی وجہ سے لوگ فاقوں مرنے لگے اور گیہوں کی شکل تک دکھائی نہ دیتی، افلاس وغربت کی وجہ سے مُردوں کے کفن و دفن تک کا سامان لوگوں کے پاس نہ تھا اس ۹ برس کے عرصہ میں فقر وفاقہ اور وبا سے مرنے والوں کی تعداد ۶ لاکھ تک پہونچ گئی مُردوں کی کثرت کی وجہ سے انہیں دریائے نیل میں پھینک دیا جاتا۔ دریائے نیل کے پانی کے گھٹنے کا اثر حکومت کے محکموں اور صوبوں پر بھی نہایت گہرا پڑا اور عالم گیر فقر وفاقہ اور وبا سے لوگ گھبرا اٹھے، اور لوٹ مار کرنے لگے، کافور، فوج کی تنخواہیں نہ ادا کرسکا جس کی وجہ سے اس کی فوجوں نے اس کے خلاف بغاوت کردی۔

فاطمیوں کے عہد میں

جوہر صقلی نے جس وقت مصر فتح کیا اس وقت مصر پر یہ قہر وغضب مسلط تھا اس نے سب سے پہلے قحط اور فقر وفاقہ کی بلاخیزیوں کو دور کرنے کے لیے

دانشمندانہ قدم اٹھایا، ایک بہت بڑا غلّہ کا ذخیرہ عام لوگوں کے لیے فراہم کیا اور اسی محتسب کی نگرانی میں دیدیا، جو اس کی تقسیم کا مناسب انتظام کرتا، محتسب اس کی سختی سے دیکھ بال رکھتا تھا کہ کوئی شخص غلّہ کا ذخیرہ مناسب وقت پر گراں فروخت کرنے کے لیے تجمع نہ کرنے پائے۔[1]

مصر کی تسخیر کے وقت علی بن یحیٰی افسر خراج تھا، اس وقت جوہر نے اُسے اپنے عہدہ پر برقرار رکھا لیکن ایک ماہ کے بعد ہی اس کا شریک کار، رجاء بن صولاب کو کردیا جو غالبًا بلادِ مغرب کا شیعہ تھا، کچھ عرصہ بعد خراج کا محکمہ یعقوب بن کلس اور علوج بن حسن کی نگرانی میں دیدیا گیا، اور ابن یحیٰی اور ابن صولاب دونوں سبکدوش کر دیے گئے اس وقت خراج وصول کرنے والے عملہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، ایک علی محمد اور عبداللہ بن عطاء کی ماتحتی میں تھا، اور دوسرا حسن بن عبداللہ اور حسین بن احمد روزباری کی نگرانی میں تھا، جوہر صقلی[2] نے پہلے سال ۳۰۰،۰۰۰،۴ دینار خراج وصول کیا، کافور کے آخری زمانہ میں خراج کی مقدار بہت زیادہ گھٹ گئی تھی، اس لحاظ سے یہ آمدنی بہت کافی کہی جاسکتی ہے۔

خلیفہ معزؔ (۳۴۱ - ۳۶۵ھ) نے یعقوب بن کلس اور علوج بن حسن کو ٹیکس کا جدید نظام مرتب کرنے کے لیے مامور کیا تھا ان دونوں نے پیداوار کی مختلف اقسام کا جائزہ لیا، اس کے بعد نظام ٹیکس کا ایک جدید خاکہ بنایا، ترتیب کے وقت مختلف دوروں کے ٹیکس بھی ان کے پیش نظر تھے، حکومت نے اس خاکہ پر عمل کرنے کی پوری کوشش کی، اس کا بہت اچھا اثر پڑا اور پیداوار میں اس کی وجہ سے معتد بہ اضافہ ہوگیا، اس وقت خراج کے افسروں کے خلاف شکایات کی سماعت اور ان کے انسداد کے لیے باقاعدہ ایک شعبہ قائم کیا گیا جو ان کی بے اعتدالیوں کے خلاف نہایت سختی سے کارروائیاں

---

[1] جوہر صقلی (علی ابراہیم حسن) ص ۷۵ [2] الخطط ج ۱ ص ۹۹

کرتا تھا۔

ابن میسر کا بیان ہے، فاطمیوں کے عہد میں فسطاط کی یومیہ آمدنی ۵۰،۰۰۰ اور ۱۰۰،۰۰۰ دینار کے بین بین تھی اور دمیاط، اور اشمونین کی یومیہ آمدنی کا اوسط ۲ لاکھ ۳۰ ہزار دینار تھا[1] لیکن یہ حقیقت کے خلاف معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اگر ۱۰۰،۰۰۰ دینار یومیہ کا اوسط فرض کر لیا جائے تو سالانہ آمدنی ۳۶ ملین دینار ہوتی ہے، اور اس قدر آمدنی فاطمیوں کے عہد میں کبھی نہیں ہوئی تھی، غالبًا یہ مقدار دراہم کی ہے دینار کی نہیں۔

خلیفہ معز الدین کے عہد میں مصر کا مزروعہ رقبہ ۲۸۵،۷۱۴ فدان تھا، وزیر اعظم بدر جمالی کے زمانہ تک اس رقبہ میں کمی نہ ہونے پائی، خلیفہ مستنصر کے درمیانی عہد حکومت میں یہ رقبہ بہت گھٹ گیا تھا، اس کی وجہ صرف دریائے نیل کے پانی میں کمی اور وبا نہ تھی، بلکہ حکام کی بے اعتدالیاں اور زراعت کی طرف سے مجرمانہ غفلت کا بھی بہت بڑا دخل تھا نہریں کھدوانا، پل تعمیر کرانا، اور دوسری زراعتی سہولتوں کی طرف اس وقت کسی نے توجہ نہ کی تھی۔

ذیل کے نقشہ سے مزروعہ رقبہ کی دور بہ دور کی ترقی اور انحطاط کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حاکم	سنہ	مزروعہ رقبہ	خراج	ٹیکس ایک فدان پر
حضرت عمرو بن عاص رضہ	۲۰ھ	۶ ملین فدان	۴،۰۰۰،۰۰۰ دینار	۲/۳ دینار
ہشام بن عبد الملک	۱۲۵ھ	۲ ملین ،،	،، ،، ،،	۲ دینار
مامون	۲۱۸ھ	۲،۱۲۸،۰۰۰ ،،	۴،۲۵۷،۰۰۰ دینار	،، ،،
احمد بن طولون	۲۷۰ھ	؟ [2]	۸۰۰،۰۰۰ ،،	×
اخشید	۳۳۴ھ	۵،۰۰۰،۰۰۰ ،،	۲،۰۰۰،۰۰۰ ،،	۴ ،،
معز الدین	۳۵۸ھ	۲۸۵،۷۱۴ ،،	،، ،، ،،	۷ ،،
مستنصر (آخری دور)	۴۸۷ھ	؟	۳،۰۶۱،۰۰۰ ،،	؟

[1] ابن میسر ص ۴۶ [2] مقریزی ج ۱ ص ۶۹

مستنصر فاطمی کے آخری دور میں ٹیکس کی مقدار میں اضافہ کر دیا گیا تھا اور اس زمانہ میں ان اشیاء پر بھی ٹیکس لگا دیے گئے تھے جن پر فتح اسلامی سے اس وقت تک کسی فرماں روا نے عائد نہ کیے تھے، لین پول[1] نے ان جدید ٹیکس کی حسب ذیل تفصیل بیان کی ہے۔

گندم اور جو	——— ٢½ یا ٣	اردب،	فی فدان
لوبیا	——— ٤½ یا ٣	"	" "
جوار، چنا اور مسور	——— ٢½ -	"	" "
کتان	——— ٣	٢ دینار	" "
ابریشم	——— ١	"	"
لیمون	——— ٣	"	"
روئی	——— ١	"	"
گنا	——— ٥ یا ٢½	"	"
قلقاس	——— ٥	"	"
بادنجان	——— ٣	"	"
نیلہ	——— ٣	"	"
انگور اور دوسرے میوہ جات۔	——— ٢	"	"

یہ ٹیکس گندم، جو، لوبیا، گنا، قلقاس، بادنجان اور میوہ جات کے لیے ایک بارگراں تھے، ان کی پیداوار اس کی متحمل نہ تھی، ستم ہے کہ فی فدان، ۴ دینار اوسط پڑتا تھا۔

[1] A HISTORY OF EGYPT IN THE MIDDLE AGES, P.143
یہ فہرست لین پول نے ابن مماتی کی کتاب "الدواوین" سے نقل کی ہے۔

بدر جمالی کی وزارت عظمیٰ کے دور میں خراج کی آمدنی ۳۰۶۱۰۰۰ تھی، اس سے ہم تخمینہ لگا سکتے ہیں کہ مستنصر کے عہد میں مزید رقبہ $\frac{3061000}{4}$ = ۷۶۵۲۵۰ فدان تھا، یہ بیان کرنے کی حاجت نہیں کہ یہ بہت کم رقبہ تھا۔

فاطمیوں کے عہد میں مصر میں ۲۳۲۸ گاؤں اور ۴۳۸ قصبے اور شہر تھے اور خراج کی آمدنی ۳۰۶۱۰۰۰ دینار تک پہونچ گئی تھی[1]

فاطمیوں نے کاشت کاروں کے ساتھ نہایت رواداری کا سلوک کیا تھا اور وہ ہمیشہ ان کی فلاح وبہبود اور ان کی سطح زندگی بلند کرنے کی کوشش کرتے تھے، خصوصًا معزالدین اور عزیز الدین کے دور میں کاشت کاروں پر غیر معمولی عنایات مبذول رہیں، جب فاطمی خلفاء کے اقتدار کا خاتمہ ہوگیا اور وزارت عظمیٰ نے اس کی جگہ لے لی اس وقت وزراء کا سلوک کاشت کاروں کے ساتھ اچھا نہ رہا تھا۔

وزراء میں صرف یازوری کی ذات ایسی گذری ہے جس نے بدعنوانیوں کی اصلاح کی، اس کا ایک امتیازی کارنامہ یہ تھا کہ اس نے حکومت کے گندم کے ذخیرہ کو مناسب داموں میں فروخت کر دیا تھا اور دوسرے وزراء کی طرح گرانی کے وقت کا انتظار نہ کیا تھا، اس کی وجہ سے ایک طرف حکومت کو سخت مالی خسارہ اٹھانا پڑا، دوسری طرف حکومت کے پاس وقت ضرورت کے لیے گندم کا ذخیرہ نہ رہا، خوش قسمتی سے اسی سال گندم کی پیداوار زیادہ ہوئی اور اسے کاشت کاروں کی حالت سدھارنے کا اور موقع ملا اور اس نے تاجروں کو ارزاں داموں میں گندم خریدنے کی ممانعت کر دی اور حکومت کی طرف سے مناسب نرخ مقرر کر دیا، یہ بیان کرنے کی شاید ضرورت نہیں کہ اس زمانہ میں کاشت کاروں کو روپیہ کی ضرورت ہوتی اور تاجر اُن کی شدت احتیاج سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے، دوسری طرف حکومت نے غلہ کی ایک بہت بڑی مقدار ذخیرہ کے طور پر فسطاط میں محفوظ کر دی تاکہ

[1] کنائس مصر (ابوصالح ارمنی) ص ۱۰

قحط وغیرہ کے وقت اسے کام میں لایا جائے ۔[1]

مملوکوں کا دور مملوک سلاطین نے زراعت کی طرف خصوصی توجہ مبذول کی اور اس کی اصلاح وترقی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی، اس دور میں دریائے نیل سے کاٹ کر بڑی بڑی نہریں جاری کی گئیں اور ملک کے ہر گوشہ میں پل تعمیر کیے گئے، یہ پل دو قسم کے تھے، شاہی پل، یہ پل ملک کے عام مفاد سے تعلق رکھتے تھے اور لگان کی آمدنی کا ایک بہت بڑا حصہ ان پر خرچ کیا جاتا تھا، یہ حالت سلطان ناصر کے دور میں قائم نہ رہی تھی، اس کے زمانہ میں لگان کی آمدنی سلطان کی خدمت میں بھیج دی جاتی تھی، اور پلوں کی تعمیر ومرمت اور تحفظ کے اخراجات شہریوں سے وصول کیے جاتے تھے، دوسری قسم کے پل "بلدیہ" کہلاتے تھے، ان کا مفاد مقامی تھا اور ان کے اخراجات مقامی کاشت کاروں کو برداشت کرنا پڑتے تھے،

مملوکوں کے عہد میں وسائلِ آمدنی حسب ذیل تھے،[2]

(۱) زمین کی پیداوار، زمین کی پیداوار پر مختلف لگان تھا، سمندر کے محاذ میں جو علاقہ تھا، اس کا ٹیکس پیداوار کی شکل میں لیا جاتا تھا، یہ پیداوار گندم، جو، تل، لوبیا، مسور اور پیاز کی تھی اور معمولاً ان کا ٹیکس ایک فدان پر دو اردب سے تین اردب تک مقرر تھا، ساحلی علاقہ کا ٹیکس عموماً نقد کی شکل میں لیا جاتا تھا اور سنہ ۷۹۰ھ = سنہ ۱۳۷۰ء میں اس کی مقدار دس روپیہ فی فدان غیر معمولی زرخیز علاقہ سے وصول کیا جاتا تھا، اور ساڑھے سات روپیہ فی فدان متوسط زرخیز علاقہ سے لیا جاتا تھا، اس ٹیکس میں پیداوار کی زیادتی اور قلت کی بناء پر کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔

مصر کے ساحلی اور محاذی دونوں مزروعہ رقبوں کا انتظام سرکاری دفاتر، جاگیردار امراء وغیرہ کے سپرد تھا، مساجد اور مدارس کے اوقاف اس سے مستثنیٰ تھے ان کے انتظامات

[1] STANLEY LANE POOLE, A HISTORY OF EGYPT IN THE MIDDLE AGES. P.134.

[2] صبح الاعشیٰ ج ۳ ص ۴۵۲ - ۴۶۸

قوم کے ہاتھ میں تھے۔ سرکاری دفاتر کی دو قسمیں تھیں۔

اوّل، یہ چار محکموں میں تقسیم تھا۔

(۱) دیوانی وزارت، اس کے ذمّہ الجیزہ اور منفلوط کے صوبوں کا انتظام تھا، یہاں سے گندم وغیرہ کی ایک قلیل مقدار شاہی غلّہ کے ذخیرہ کے لیے فسطاط آتی تھی۔

(۲) دیوان خاص، اس کے ذمّہ اسکندریہ، فُوّہ (دریائے نیل کے ساحل پر ایک چھوٹا شہر) تروجہ (بحیرہ روم کا ایک شہر) اور نستردہ یا بحیرہ برلس کے علاقوں کا انتظام اور خراج وغیرہ وصول کرنا تھا۔ یہ آمدنی خزانۂ خاص میں داخل کر دی جاتی تھی، جو سلطان کے "ناظر خاص" کی نگرانی میں ہوتا تھا، یہ دیوان سلطان ناصر بن محمد قلادون نے قائم کیا تھا۔

(۳) دیوان مفرد، چند مخصوص ضلعوں کا انتظام اس کے سپرد تھا اور اس کی آمدنی سے شاہی باڈی گارڈ کی تنخواہیں دی جاتی تھیں، یہ دیوان ظاہر برقوق نے قائم کیا تھا۔

(۴) دیوان املاک، یہ محکمہ چند ان زرخیز ضلعوں کا انتظام کرتا تھا جن کی آمدنی سلطان نے اپنی ذات کے لیے مخصوص کر لی تھی، اسے بھی سلطان ظاہر برقوق نے قائم کیا تھا۔

دوسری قسم کے دفاتر امراء کی جاگیروں کے لگان وغیرہ کے حساب و کتاب اور دوسرے ضروری امور سے تعلق رکھتے تھے، ساحلی اور محاذی علاقوں کا ایک بہت بڑا رقبہ جاگیروں کی شکل میں امراء کے قبضہ میں تھا، یہ جاگیریں حسبِ مراتب تھیں، بعض امراء کے قبضہ میں ایک ضلع سے دس اضلاع تک تھے، سلطانی مملوکوں کو بھی جاگیریں دی گئی تھیں اور یہ معمولاً ایک ضلع میں دو یا دو سے زیادہ حصہ دار ہوتے تھے۔

۲۔ حکومت کا دوسرا ذریعہ آمدنی، معدنی چیزوں کی آمدنی تھی، ان میں تین کانیں مشہور تھیں "زمرد، نمک، اور نطرون، زمرد کی آمدنی سے زیادہ خرچ آتا تھا، اس لیے اس میں روپیہ ضائع کرنا چھوڑ دیا گیا، یہ سلطان ناصر محمد بن قلادون کے آخر زمانہ کا ذکر ہے،

نمک کی برآمد، اسکندریہ کی بندرگاہ سے روم میں کی جاتی تھی اور ایک قنطار کی قیمت

معمولاً ۵ اور ۵½ دینار ہوتی تھی، حکومت اس کی آمدنی کا ½ حصہ امراء اور فوج پر صرف کرتی تھی۔

نطرون، طرانہ کے علاقہ سے نکلتا تھا اور اس کی آمدنی کا ½ حصہ فوج پر صرف کیا جاتا تھا۔

(۳) مملوک حکومت کا تیسرا ذریعہ آمدنی زکوٰۃ تھا۔ نقد کے علاوہ اس مال و اسباب سے بھی زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی جس کی اسکندریہ کی بندرگاہ سے برآمد ہوتی تھی۔

(۴) آمدنی کا چوتھا ذریعہ، جزیہ یا شخصی ٹیکس تھا، جو ۱۰ یا ۲۵ درہم کے درمیان لیا جاتا تھا۔

(۵) چُنگی، جو اسکندریہ اور دمیاط کی بندرگاہوں پر درآمد ہونے والے مال و اسباب پر لی جاتی تھی، اس کی مقدار ۱۰٪ سے ۳۵٪ تک تھی، مستقبل میں اس میں اور زیادہ اضافہ کردیا گیا، ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا، جب ایک جہاز سے جو یورپ سے اسکندریہ پہونچا تھا، چالیس ہزار دینار سے زیادہ چُنگی وصول کی جاتی تھی، آخر زمانہ میں ٹیکس میں بہت تخفیف کردی گئی تھی، مقصد اس سے تجارت کی حوصلہ افزائی تھا۔

(۶) لاوارثی مال و دولت۔

(۷) قاہرہ کے "دارالضرب" کی آمدنی۔

یہ مملوکوں کے ذرائع آمدنی کا ایک اجمالی خاکہ ہے، تفصیل مقریزی (ج ۱ ص ۱۰۳-
۱۱۱) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ذیل میں ایک فہرست دی جاتی ہے جس سے مختلف عہدوں کی آمدنی کا اندازہ ہوگا۔

خراج کی مقدار دینار کی شکل میں۔	خلیفہ	حاکم
۱۲,۰۰۰,۰۰۰ دینار	حضرت عمرؓ	عمرو بن عاصؓ
۱۴,۰۰۰,۰۰۰ ″	حضرت عثمانؓ	عبداللہ بن سعدؓ
۱۲,۰۰۰,۰۰۰ ″	سلیمان بن عبدالملک	اُسامہ بن زیدؒ
۲,۷۲۳,۳۹ ″	ہشام بن عبدالملک	عبیداللہ بن حجاب
۴,۲۵۷,۰۰۰ ″		موسیٰ بن عیسیٰ
۸۰۰,۰۰۰ ″		احمد بن مدبر
۴,۳۰۰,۰۰۰ ″		احمد بن طولون
۴,۱۰۰,۰۰۰ ″		خمارویہ بن احمد بن طولون
۲,۰۰۰,۰۰۰ ″		محمد بن طغج خشید
۳,۲۷۰,۰۰۰ ″		کافور خشیدی
۳,۴۰۰,۰۰۰ ″	معزالدین فاطمی	جوہر صقلی
۳,۰۰۰,۰۰۰ ″	عزیزالدین فاطمی	وزارت یعقوب بن کلس
۳,۴۰۰,۰۰۰ ″	حاکم	
۲,۰۰۰,۰۰۰ ″ اس میں ایک ملین شام کی آمدنی کا ہے۔	مستنصر	وزارت یازوری
۲,۸۰۰,۰۰۰ ″		سنہ ۴۶۳ھ میں
۳,۱۰۰,۰۰۰ ″		بدر جمالی سنہ ۴۸۷ھ میں
۵,۰۰۰,۰۰۰ ″	مستعلی	افضل بن بدر جمالی
۴,۶۵۳,۰۲۹ ″		صلاح الدین یوسف بن ایوب ۵۸۵ھ
۱۲,۰۰۰,۰۰۰[۲] ″		ظاہر بیبرس

۱؎ مقریزی ج ۱ ص ۸۷-۹۸ ... ۲؎ صرف ابن ایاس (ج ۳ ص ۶۶۶) نے یہ رقم بیان کی۔

باب چہارم

نظامِ عدالت

۱۔ عدالت

۲۔ عدالتِ عظمیٰ

۳۔ احتساب

۱۔ عدالت

عہد جاہلیت میں

عہد جاہلیت میں نوعیت کے لحاظ سے "عدالت" کی تین قسمیں تھیں۔

۱۔ حکومت، اسلام سے قبل قریش میں بنی سہم کی حکومت قائم تھی، یہ حکومت کس قسم کی تھی، یقینی طور پر نہیں بتایا جا سکتا، لیکن اتنا معلوم ہے کہ اسلام سے قبل عربوں کا معمول تھا کہ متمدن قبیلے، معاشرہ اور سوسائٹی کی تنظیم اور فلاح و بہبود کے لیے اجتماعی معاملات کی ذمہ داریاں آپس میں تقسیم کر لیا کرتے تھے۔ اس لیے ممکن ہے کہ بنی سہم کی اس حکومت کا مقصد عدل و انصاف کا قیام ہو، قریش اور وفودِ عرب بنی سہم کے سرداروں کے پاس باہمی خصومات کا تصفیہ کرانے کے لیے آتے ہوں۔

عہدِ جاہلیت کے ممتاز قاضی، ہاشم بن عبد مناف، ابو لہب بن عبد المطلب، عاص بن وائل، قس بن ساعدہ ایادی، امیہ بن ابی الصلت، زہیر بن ابی سلمیٰ ذوالا عدوانی، اور اکثم بن صیفی تھے، یہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا کہ صرف قاضی کے فیصلہ سے خصومات کا خاتمہ نہیں ہو جاتا تھا بلکہ فیصلے منوانے میں طاقت اور دباؤ سے بھی کام لینا پڑتا تھا۔

۲۔ ثالث بنانا، عربوں کا معمول تھا کہ وہ اپنے خصومات فیصل کرانے کاہنوں اور قیافہ شناسوں کے پاس جاتے تھے، کاہنوں کے متعلق ان کا اعتقاد تھا کہ ان کے تابع جنات ہیں اور وہ انہیں ہر چھپی چیز سے آگاہ کر دیتے ہیں، قیافہ شناس کا ان کے ہاں مفہوم

یہ تھا کہ وہ نفسیات کا ماہر ہو، اس کی شخصیت غیر معمولی دانائی کی حامل ہو، انسانوں کی حرکات
اور قرائن سے انہیں بھانپ لے اور بات کی تہ تک پہونچ جائے، جھگڑوں کے فیصلے کے لیے
عربوں میں قرعہ اندازی کا طریقہ بھی رائج تھا جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی برقرار رکھا تھا۔
آنحضرتؐ جب کسی سفر پر تشریف لے جاتے تو قرعہ اندازی کے ذریعہ اس کا فیصلہ فرماتے کہ
کون سی زوجۂ مطہرہ کو ہمراہ لے جانا چاہیے، اثباتِ واقعہ کے لیے گواہوں کی شہادت بھی
معتبر خیال کی جاتی تھی،

۳- دادخواہی، اس دور میں عدالتِ عظمیٰ کی یہ ابتدائی شکل تھی، اور مظلوم اپنے سے
زبردست ظالم کی ناانصافی اور جبر و ظلم کے خلاف عدالتِ عظمیٰ میں، جسے وہ سمجھتا ہو، یا ماحول
نے بنا دیا ہو، احتجاج کرتا تھا، مستقبل میں مسلمانوں میں "النظر فی المظالم" کے نام سے دادخواہی
کا محکمہ قائم کیا گیا، غالباً یہ نظام عربوں نے ایرانیوں سے لیا تھا، عربوں میں اس کی ابتداء
عاص بن وائل اور قبیلہ زبید کے ایک شخص کے درمیان ایک اختلاف کی وجہ سے ہوئی تھی
عاص بن وائل (ممتاز قاضی) نے قبیلہ زبید کے آدمی سے کچھ سامان خریدا تھا لیکن قیمت
ادا کرنے میں مدت تک بہانے کرتا رہا، جب وہ مایوس ہو گیا تو اس نے کعبہ کا طواف
کرتے ہوئے قریش کی دہائی دی، قریش اس سے بے حد متاثر ہوئے اور اسی وقت
عبداللہ بن جدعان کے مکان میں جمع ہوئے اور وہاں سب نے یہ حلف اُٹھایا کہ مظلوموں
کی ظالموں کے خلاف امداد کی جائے گی، اس باہمی عہد کو "حلف الفضول" کہا جاتا ہے،
اس مجلس اور معاہدہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک تھے[1]

(ب) عہدِ رسالت میں | جاہلیت میں عدالت کے نظام کی ایک بنیاد موجود تھی، ظہور اسلام
کے بعد عدالت کے فرائض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ تھے، آپؐ مسلمانوں اور
غیر مسلموں سب کے باہمی خصومات کا فیصلہ کرتے تھے، مدینہ میں مہاجرین اور مدینہ کے مسلمانوں

[1] تفصیل دیکھیے، الاحکام السلطانیہ ص ۷۵

اور یہود و مشرکین میں جو معاہدہ ہوا تھا، اُس میں یہ الفاظ موجود تھے "اس معاہدہ میں شریک ہونے والوں کے درمیان اگر کوئی جھگڑا یا اختلاف ہوگا تو وہ اللہ عزوجل و محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف رجوع کریں گے۔"[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف شریعتِ اسلامی کے مبلغ تھے بلکہ آپؐ کی حیثیت ایک قاضی کی بھی تھی، آپؐ کی زندگی میں آپ کے سوا کوئی دوسرا قاضی کے فرائض انجام نہ دیتا تھا، اس عہدِ طیبہ میں پورے طور پر فطری سادگی موجود تھی اور اسلام کا دائرہ عمل بھی ابھی تک صرف ایک مختصر رقبہ تک محدود تھا۔ دوسرے خصومت و مقدمات کی کمی بھی تھی، اس لیے اور قاضیوں کے تقرر کی حاجت نہ تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں صرف قاضی کی حیثیت سے کسی شہر میں کسی کا تقرر نہ فرمایا تھا، ہاں بعض گورنروں کو دوسری ذمہ داریوں کے علاوہ یہ ذمہ داری بھی سپرد کر دی تھی، بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپؐ کسی صحابی کو کسی جھگڑے کے طے کرنے کے لیے مامور کر دیا کرتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے جھگڑوں، قضیوں کا فیصلہ وحی کے مطابق فرماتے تھے، آپؐ مدعی اور مدعا علیہ دونوں کی گفتگو کو توجہ سے سنتے، اثباتِ واقعہ کی صورتیں آپؐ کے ہاں، بیّنہ، قسم، گواہوں کی شہادت، تحریر، فراست و درایت سے واقعہ کا اثبات یا نفی اور قرینہ وغیرہ تھیں، آپؐ کا قول تھا "مدعی کے ذمہ بیّنہ پیش کرنا ہے اور مدعا علیہ اگر وہ منکر ہو تو قسم لازم ہے"۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان صورتوں میں سے کسی صورت سے صحیح واقعہ کا علم ہو جاتا تو آپؐ فیصلہ فرما دیتے، آپؐ فرمایا کرتے "میں ظاہری ثبوت و شواہد سے فیصلے کے لیے مامور ہوں، بھیدوں سے صرف خدا واقف ہے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدعی اور مدعا علیہ کسی کی رُو رعایت نہ فرماتے، آپ صحابہ کو ہدایت فرماتے "جب مدعی مدعا علیہ تمہارے سامنے حاضر ہوں، تو اس وقت تک

---

[1] ابن ہشام، ج ۲، ص ۹۴ ۔ ۹۴۰

فیصلہ نہ کرو جب تک دوسرے فریق کی باتیں بھی نہ سُن لو، دونوں فریق کی باتیں سننے کے بعد واقعہ کی اصلی حقیقت تمہارے سامنے آجائے گی" مسلم کی روایت ہے آپ نے فرمایا" اگر حاکم اجتہاد کرے اور صحیح کرے تو اس کے لیے دو اجر ہیں، ورنہ ایک"

اسلام کی دعوت و تبلیغ کا دامن جب زیادہ وسیع ہوا تو آپ نے بعض صحابہ کو قرآن وحدیث اور اجتہاد کے مطابق لوگوں کے جھگڑے قضیے طے کرنے کی اجازت دیدی اسی طرح چند صحابہ کو فتویٰ دینے کی اجازت بھی دیدی تھی، اس دور کے مشہور مفتیوں کی تعداد جن میں مرد اور عورت دونوں شامل تھے ۱۳۱ تھی، ان میں ممتاز حضرات سات تھے، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن عباس، اور حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں عہد جدید کی نوعیت کے جیل خانوں کا وجود نہ تھا، سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے اس قسم کے جیل خانے تعمیر کرائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اتنا کافی خیال کیا جاتا کہ مجرم کو کچھ مدت کے لیے لوگوں سے ملنے جلنے اور معاشرتی تعلقات قائم نہ رکھنے دیا جائے، اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ مجرم کو ایک گھر یا مسجد میں بند کر دیا جاتا تھا۔ اور اس کے مخالف کو اس پر متعین کر دیا جاتا تھا کہ وہ مجرم کو لوگوں سے ملنے جلنے نہ دے، عہد رسالت میں کوئی قید خانہ مجرموں کو محبوس کرنے کے لیے نہ تھا، اس کا رواج حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہوا اور پھر برابر ہر دور میں قائم رہا۔

خلافت راشدہ میں حضرت ابوبکرؓ نے اپنے دور خلافت میں حضرت عمرؓ کو قضاء کے عہدہ پر مامور کیا، لیکن آپ کی سخت گیری اور حزم و تدبر سے لوگ واقف تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ دو برس تک آپ کی خدمت میں کوئی مدعی، مدعا علیہ حاضر نہ ہوا۔ اسی لیے" خلافت ابوبکرؓ کے قاضی کی حیثیت سے آپ کی شہرت نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں جب اسلام کا میدانِ عمل اور زیادہ وسیع ہوا اور غیر اقوام کے ساتھ ربط و ضبط میں ترقی ہوئی اس وقت ایک ایسے نظامِ عدالت کی ضرورت محسوس ہوئی جو عربوں اور غیر عربوں سے یکساں نافذ کیا جائے، اس مقصد کے لیے قاضیوں کا تقرر کیا گیا جن کا فرض تھا کہ قرآن و حدیث اور قیاس (مشترک علت) کے مطابق فیصلہ کریں۔

حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے عالمِ اسلامی میں قاضیوں کا تقرر فرمایا تھا، اس کے بعد یہ رواج قائم ہو گیا تھا کہ قاضیوں کا تقرر "تاجِ خلافت" کی طرف سے کیا جاتا، اپنے صوبہ میں اس والی (گورنر) کو بھی اس کا اختیار حاصل تھا جس کے حیطۂ اختیار و اقتدار میں جملہ امورِ انتظام و انصرام دیدیے گئے ہوں، دوسرے لفظوں میں خراج و زکاۃ دونوں کی ذمہ داریاں جس کے سپرد کر دی گئی ہوں، حضرت عمرؓ نے حضرت ابوالدرداءؓ کو مدینہ شریح بن حارثؓ کندی کو کوفہ، ابوموسیٰ اشعریؓ کو بصرہ اور عثمان بن قیس بن ابی عاصؓ کو مصر کا قاضی مقرر کیا تھا، بلادِ شام کی عدالت مستقل تھی اور وہ کسی دوسرے صوبہ کی عدالت کے ماتحت نہ تھی۔

حضرت عمرؓ نے ان قاضیوں کے لیے ایک لائحہ عمل مقرر کیا تھا جس پر وہ عمل درآمد کرتے تھے، یہ لائحہ عمل مستقبل میں مرافعہ یا اپیل کی بنیاد قرار دیا گیا، یہ لائحہ عمل آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور دوسرے قاضیوں کو روانہ کیا تھا، اس کا اقتباس بے محل نہ ہوگا۔

.... "عدالت" میں مدعی، مدعا علیہ کو ایک نظر سے دیکھو، ان کی نشست گاہ میں کسی قسم کا امتیاز نہ کیا جائے، عدل و انصاف میں کسی کی رعایت نہ کرو کسی "بڑے آدمی" کو کوئی ناجائز توقع پیدا نہ ہو سکے، اور کمزور کو عدل و انصاف سے مایوسی نہ ہو۔ مدعی کے ذمہ ثبوت اور گواہ پیش کرنا، اور منکر مدعا علیہ پر قسم ضروری، فریقین کو آپس میں

راضی نامہ کی اجازت ہے، اگر اس سے شرعی حلال وحرام پر کوئی اثر نہ پڑتا ہو جن جدید مسائل میں تردد پیدا ہو ان میں عقل و درایت سے کام لو پچھلے نظائر اور امثال کی روشنی میں غور کرو، مدعی کو اتنی مہلت دو کہ وہ گواہ اور ثبوت آسانی سے پیش کر سکے مسلمان ایک دوسرے کے لیے عادل گواہ کی حیثیت سے پیش ہو سکتے ہیں۔ بجز اُن مسلمانوں کے جن پر شرعی حد جاری ہو چکی ہو، ان کی جھوٹی گواہی کا تجربہ ہو چکا ہو، یا ان کا فریق مخالف کے ساتھ ذاتی تعلق یا قرابت داری ہو، دیکھو! قلق و اضطراب اور اذیت رسانی کی روش سے ہمیشہ بچنا......

خلافتِ راشدہ میں، "عدالت" حکومت کا ایک شعبہ تھا، اور اس کا انتہائی احترام کیا جاتا تھا، قاضی کے انتخاب میں غیر معمولی علمیت، تقویٰ وطہارت اور منصفانہ فطرت کا خیال رکھا جاتا تھا۔

اس دور میں جن جدید امور کے بارے میں "نص صریح" نہ ملتی اُن میں قاضی اپنے "اجتہاد" سے کام لیتا تھا، اس اجتہاد کی بنیاد قرآن وحدیث پر قائم ہوتی تھی، مستقبل میں اسلاف کے مجتہدانہ فکر و نظر سے عدالتی امور میں بہت کام لیا گیا اور بہت سے احکام کی بنیاد انہیں پر قائم تھی۔

خلافتِ راشدہ میں قاضی کا کوئی پیش کار یا کاتب نہ تھا، قاضی کے فیصلہ کے اندراج کے لیے عدالت کی کوئی فائل بھی نہ تھی، وجہ یہ تھی کہ فیصلہ کے بعد فوراً ان کا نفاذ قاضی بذاتِ خود کر دیتا تھا، اس لیے اس کی ضرورت بھی نہ ہوتی تھی۔

اس عہد میں قاضی پہلے اپنے مکان میں عدالت کا اجلاس کیا کرتے تھے پھر وہ مسجد میں کرنے لگے تھے۔

عہد بنی امیہ میں | اس عہد کی دو امتیازی خصوصیات ہیں۔

۱۔ قضاۃ اپنے فیصلے اپنے "اجتہاد" اور عقل و درائت کی روشنی میں کرتے تھے،

اس اجتہاد کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت ان "مذاہب اربعہ" کا (جن کی پابندی بعد کے قضاۃ نے کی) وجود نہ تھا۔ اس لیے قاضی فصل مقدمات کے وقت صرف کتاب وسنت پر بھروسہ کرتا تھا، دوسرے اُس وقت "حدیث" فقہاء، محدثین اور ناقدین حدیث کے درمیان جنگ وجدال کا مرکز تھی، اس لیے صحیح اور غیر صحیح حدیث کا امتیاز بہت دشوار تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت عربوں کی اکثریت نوشت وخواند سے ناواقف تھی مشہور تاریخی واقعات اور احادیث کی زبانی روایت ایک دوسرے سے کرتے تھے، اس لیے ماحول اور مختلف فرقوں کے ذاتی رجحانات سے احادیث محفوظ نہ رہی تھیں، اور ہر فرقہ اپنے اشخاص کی حمایت، اُن کی شخصیت کو نمایاں کرنا اور دوسرے فرقہ پر لعن وطعن اور اُس کی حیثیت کو پست ثابت کرنا اپنا مقصد زندگی سمجھتا تھا، اور اس مقصد کے ماتحت اپنی من گھڑت روایتوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کردیتا تھا، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اسی فروغ کذب اور سیاسی اختلافات کے ظہور کے اندیشہ سے حدیث بیان کرنے کی ممانعت کردی تھی۔

۲- اس دور کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ عدالت کا محکمہ اپنے اختیارات وفرائض میں اموی فرماں رواؤں کے اثر واقتدار سے بالکل آزاد تھا، اور ان کے ذاتی رجحانات کا اس پر کوئی اثر نہ تھا، اس زمانہ میں عدالت کے فیصلے گورنروں اور خراج کے افسروں تک پر بلارورعایت نافذ کیے جاتے تھے۔

عہدِ اموی میں قاضی کے انتخاب کے لیے ضروری تھا کہ وہ بلند سیرت، پاکباز، پرہیزگار، عالم، مجتہد اور عیوب سے مبرا ہو، اور عدل وانصاف کے مقابلہ میں دنیا کی کسی طاقت کی اسے پرواہ نہ ہو۔

عباسیہ کے دور عروج میں

عہد عباسیہ میں عدالتی نظام میں زبردست انقلاب پیدا ہوا، اس دور میں "مذاہب اربعہ" کے ظہور کی وجہ سے اجتہادی روح میں ضعف آگیا تھا اور

قاضی کے فکر و نظر کا دائرہ انہیں مذاہب میں سے کسی نہ کسی تک محدود ہوگیا، اس دور میں عراق کے قاضی، امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے مطابق، شام اور بلادِ مغرب کے قاضی امام مالکؒ کے مذہب کے مطابق اور مصر کے قاضی امام شافعیؒ کے مذہب کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ اگر مدعی، مدعا علیہ ایسے مذہب سے تعلق رکھتے ہوتے جو عام طور پر اس شہر میں رائج نہ ہوتا تو اس وقت ان کے مقدمہ کے فیصلہ کے لیے قاضی کسی ایسے شخص کو اپنا نائب بنا دیتا تھا جو انہیں کے مذہب کا پیرو ہوتا تھا۔

اس دور کے قاضی خلیفہ کے اثر و اقتدار سے آزاد نہ تھے، بات یہ تھی کہ عباسی فرماں روا اپنے تمام اعمال و افعال کو مذہبی رنگ میں پیش کرنا چاہتے تھے، اس غرض کے لیے وہ قاضیوں کو اپنا آلۂ کار بناتے تھے اور قاضی کے انتخاب میں اس کا لحاظ رہتا تھا کہ وہ ان کے رجحانات اور خواہشات سے انحراف تو نہیں کرے گا، اسی کا اثر تھا کہ بہت سے فقہاء قضاء کے منصب سے دامن بچاتے تھے، انہیں احساس تھا کہ شریعت اسلامی، اُن کے فرائضِ منصبی، اور ضمیر کے خلاف فتویٰ دینے پر اُن کو آمادہ کیا جائے گا۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ سے منصور عباسی نے منصبِ قضاء کے قبول کرنے کی استدعاء کی تو آپ نے معذرت کرتے ہوئے جواب دیا "مجھے اپنے اوپر یہ اعتماد نہیں ہے کہ آپ کی رضامندی اور خواہشات کا لحاظ رکھوں گا! پھر آپ کے غیظ و غضب سے بچنے کی صورت؟" اس واقعہ کے بعد امام ابوحنیفہؒ اور منصور کے ایک قاضی محمد بن عبدالرحمٰن میں کچھ کشیدگی پیدا ہوگئی تھی، کشیدگی کی وجہ یہ تھی کہ امام ابوحنیفہؒ نے باوجود عمر میں چھوٹے ہونے کے، ابن عبدالرحمٰن کے فیصلوں پر نکتہ چینی کی تھی ابن عبدالرحمٰن نے منصور سے شکایت کردی، نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت کی طرف سے "حکم زباں بندی" نافذ ہوگیا، اور انہیں فتویٰ دینے کی ممانعت کردی گئی۔[1] اس زمانہ کے خلفاء نے بہت سے جنرلوں اور علویوں

---

[1] التمدن الاسلامی، ج ۲، ص ۱۸۵ — ۱۸۶

وغیرہ سے امن و امان کا وعدہ کیا، اس کے بعد قاضیوں کے فتووں کی آڑلی اور اپنے وعدوں کی صریح خلاف ورزی کی، سفاح نے ابن ہبیرہ، منصور نے محمد بن عبداللہ (معروف بہ "نفس زکیہ") اور ہارون نے یحییٰ بن عبداللہ کے ساتھ جو کچھ کیا وہ اس دعویٰ کی کھلی شہادت ہے۔

ابن ہبیرہ کو سفاح کی طرف سے "امان" دیدی گئی تھی، لیکن چند روز کے بعد اسے قتل کر دیا گیا۔ منصور نے اپنے چچا عبداللہ بن علی اور ابو مسلم خراسانی کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کیا تھا، اسی واقعہ کی طرف محمد بن عبداللہ بن الحسن بن علی بن ابی طالب نے منصور کے ایک خط کے جواب میں اشارہ کیا تھا "مجھے کون سی "امان" دیجیے گا؟ ابن ہبیرہ کی طرح، اپنے چچا عبداللہ بن علی کی طرح یا ابو مسلم خراسانی کی طرح؟ محمد "نفس زکیہ" کے بھائی یحییٰ بن عبداللہ نے بلادِ دیلم میں ہارون رشید کے خلاف بغاوت کی تھی، ہارون نے فضل بن یحییٰ برمکی کو اس کے مقابلے کے لیے روانہ کیا، فضل بن یحییٰ نے اپنے غیر معمولی تدبر سے اسے اس شرط پر مصالحت کے لیے آمادہ کر لیا کہ ہارون اپنے قلم سے "امان" لکھدے اور اس پر فقہاء، قضاۃ اور بنی ہاشم کے ممتاز افراد کی گواہیاں ثبت ہوں، ہارون نے اس شرط کو قبول کر لیا اور اس کی حسبِ خواہش تحریر لکھدی، اس کارروائی کے بعد جب یحییٰ فضل کے ساتھ بغداد آیا تو ہارون نے نہایت عزت و احترام کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا، لیکن ابھی بغداد آئے ہوئے چند روز بھی نہیں گذرے تھے کہ ہارون نے اسے نظر بند کر دیا اور فقہاء سے "امان" کے متعلق فتویٰ طلب کیا، کچھ فقہاء نے اس کو برقرار رکھا لیکن بعض فقہاء نے "نقضِ امان" کے جواز کا فتویٰ دیدیا اور ہارون نے اس گروہ کے فتویٰ پر عمل کیا۔

عباسیوں نے اپنے عہد میں "قاضی القضاۃ" کا منصب قائم کیا، جو عہدِ جدید کے وزیرِ عدل و انصاف کے ہم پلّہ تھا، اس کا تقرر خلیفہ کی طرف سے کیا جاتا تھا، قاضی القضاۃ دار السلطنت میں قیام کرتا تھا اور وہ تمام عالم اسلامی میں قاضیوں کا تقرر کرتا تھا

جو اس کے نائب کی حیثیت سے عدالت کے فرائض انجام دیتے تھے، پہلے اس عہدہ پر امام ابو یوسفؒ مامور ہوئے، یہ ہارون رشید کے عہد کا واقعہ ہے، ہارون ان کا بے حد لحاظ و احترام کرتا تھا، اندلس میں "قاضی القضاۃ" کو "قاضی الجماعۃ" کہا جاتا تھا، دونوں کے اختیارات و فرائض ایک تھے، ان میں صرف نام کا فرق تھا۔

عباسیہ کے دورِ عروج میں قاضی القضاۃ کے اختیارات و فرائض اور زیادہ وسیع ہو گئے تھے، اور دیوانی اور فوجداری کے علاوہ، اوقاف، محکمہ وصایا، پولس، مظالم، قصاص، احتساب، دار الضرب (ٹکسال) اور بیت المال کے شعبے بھی اسی کے ماتحت تھے اس دور میں حضرت امام ابو یوسفؒ کے ماسوا دو ہر ے ممتاز قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثمؒ (گرمیوں میں جنگ کرنے والی فوج کے جنرل بھی تھے) اور احمد بن دؤاد تھے، ابن اکثم عہدِ مامون میں قاضی القضاۃ تھے، اور ابن ابی دؤاد ان کے شاگرد اور عہدِ واثق کے قاضی القضاۃ تھے۔

امویوں کے عہد میں ہر صوبہ میں، ایک قاضی مقرر کیا جاتا تھا، لیکن عہد عباسیہ میں ہر صوبہ میں "مذاہب اربعہ" کی نمائندگی کے لیے چار قاضی مقرر کیے جاتے تھے، تاکہ ہر مذہب کا مقلد اپنے قاضی کے پاس مقدمہ پیش کرے، اور اپنے مذہب کے مطابق اسے طے کرا سکے۔

ائمہ مذاہب کا دور

اس دور کی ابتدا دولتِ عباسیہ کے قیام ۱۳۲ھ سے ہوئی اور سقوطِ بغداد ۶۵۶ھ کے بعد اس کا خاتمہ ہو گیا، اس دوران میں اصولِ فقہ وضع کیے گئے اور اربابِ رائے اور اصحابِ حدیث کے اختلافات کا دامن بہت وسیع ہو گیا، اس دور میں جن مذاہب نے جنم لیا ان میں مذہب امام ابو حنیفہؒ (۱۵۰ھ) مذہب امام مالکؒ (۱۷۹ھ) مذہب امام شافعیؒ (۲۰۴ھ) اور مذہب امام احمد بن حنبلؒ (۲۴۱ھ) امتیازی درجہ رکھتے ہیں، امام ابو حنیفہؒ اہل رائے کے پیشوا خیال کیے جاتے تھے، امام مالکؒ اور

امام احمد بن حنبلؒ معمولاً حدیث پر اعتماد کرتے تھے، اور حضرت امام شافعیؒ حدیث و رائے میں تطبیق کی کوشش فرماتے تھے۔

امام احمد بن حنبلؒ سے فقہاء اسلام کی ایک جماعت نے حدیث کی تعلیم پائی تھی ان میں ممتاز حضرات، امام بخاریؒ اور امام مسلم تھے، یہ مذاہبِ اربعہ اس وقت تک فقہ اسلامی اور قانونِ اسلامی کے سرچشمہ خیال کیے جاتے ہیں، ان مذاہبِ اربعہ کے ماسوا اس دور میں اور بھی مذاہب تھے، مثلاً یمن کا مذہب زیدیہ (امام زین العابدینؒ کی طرف انتساب تھا) ایران وعراق کا مذہب اثنا عشری اور اسماعیلیہ فرقہ (حضرت اسماعیل بن امام جعفر صادقؒ سے انتساب تھا) نمایاں حیثیت رکھتا ہے اس زمانہ میں جو مذاہب مٹ گئے ان میں خوارج، مرجیہ اور معتزلہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اس جگہ محمد بن جریر طبریؒ (م ۳۱۰ھ) کے مذہب کی طرف اشارہ بے محل نہ ہوگا۔

سچ پوچھیے تو یہ مذہب امام شافعیؒ کے مذہب کا چربہ تھا، اس کے بنیادی عناصر میں شافعی مذہب کے اصول و قوانین داخل تھے محمد بن جریر طبریؒ رائے و قیاس کے قائل تھے اسی لیے حنابلہ ان کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، غالباً اجتہاد کے قائل یہ آخری شخص تھے۔

اسی دور میں "صحاح ستہ" کی تدوین ہوئی جن کے متعلق مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ وہ قرآن کریم کے بعد صحیح ترین کتابیں ہیں، صحاح ستہ کے مصنف امام بخاریؒ (م ۲۵۶ھ) امام مسلمؒ (م ۲۶۱ھ) امام ابن ماجہؒ (م ۲۷۳ھ) امام ابوداؤدؒ اور امام ترمذیؒ (م ۲۷۳ھ) اور امام نسائیؒ تھے۔

تقلید کا میلان اور ذہنیت حضرت ابوالحسن اشعریؒ کے ظہور کے بعد مسلمانوں میں خصوصیت کے ساتھ پیدا ہوئی، پروفیسر براؤن، ڈوزی سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"معتزلہ کی موشگافیوں نے اہلِ سنت کے مذہب کو کبھی پنپنے نہ دیا، متوکل کی وفات (م ۲۴۷ھ) کے قریباً بارہ برس بعد اہلِ سنت کی ایک عظیم شخصیت (م ۲۶۰ھ ۸۷۳ء)

میں پیدا ہوئی جس نے معتزلہ کی آغوش میں نشو ونما پائی اور چالیس سال کی عمر تک ان سے تعلیمات حاصل کی، جب منطق وفلسفہ کے اسلحہ سے اچھی طرح .. مسلح ہوگئی تو اہل سنت کی طرف سے ان کا مقابلہ کیا اور نہایت کامیاب مقابلہ کیا، اور اپنی پوری زندگی اسی میں صرف کردی، یہ بلند پایہ شخصیت ابو الحسن اشعریؒ کی تھی، جو حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی اولاد سے تھے۔ ابو الحسن اشعریؒ نے اپنے معتزلی استاد جبائی سے اختلاف پیدا ہوجانے کے بعد بہت سی کتابیں فلسفیانہ نقطۂ نظر سے توحید وغیرہ پر لکھیں جن کی تعداد تین سو سے زیادہ تھی، ان کتابوں نے معتزلہ کے اثر واقتدار پر ضرب کاری لگائی اور مستقبل میں پھر انہیں کبھی سر اٹھانے کا موقع نہ ملا گیارہویں صدی عیسوی (پانچویں صدی ہجری) کے بعد قریباً معتزلہ کے مذہب کا خاتمہ ہوگیا اور امام اشعریؒ کی تعلیمات اس پر حاوی ہوگئیں[1]

نظام عدالت عباسیہ کے دور انحطاط میں

عباسیہ کے دور انحطاط میں، مدنی اور فوجی معاملات ہی تک فساد وبدنظمی کا دائرہ محدود نہ تھا بلکہ اس کا دامن عدالت تک وسیع تھا، نوبت یہاں تک پہونچ گئی تھی کہ اس مہتم بالشان منصب کے حصول کے لیے ایک خطیر رقم سالانہ رشوت میں ادا کی جاتی تھی، علامہ سیوطیؒ نے ۳۵۰ھ کے واقعات میں ذکر کیا ہے، کہ ابو العباس عبداللہ بن شوارب نے معزالدولہ سے قضاء کا منصب دو لاکھ درہم سالانہ کے بدلہ میں حاصل کیا تھا اور اس کا قبالہ لکھ کر اسے دیدیا تھا[2]۔ اس دور میں عدالت کا محکمہ سیاسی اثر سے آزاد نہ تھا، اس لیے ارباب زہد وورع، اہل علم، اس منصب کو قبول کرنے سے گریز کرتے تھے، سیوطیؒ نے ۳۶۳ھ کے واقعات کے ذیل میں بیان کیا ہے، کہ جب خلیفہ مطیع نے ابو الحسن محمد بن شعبان کو قضا کا منصب پیش کیا تو آپ نے پہلے انکار کیا، بعد میں بڑی مشکل میں ان شرطوں پر راضی ہوئے کہ عدالت[3] کو

---

[1] LIBRARY HISTORY OF PERSIA. VOL. I. P. 291.

[2] تاریخ الخلفاء ص ۲۶۵ – ۲۶۶   [3] ایضاً ص ۲۶۷

تاجِ خلافت کی طرف سے آلۂ کار نہ بنایا جائے گا، معزول نہیں کیا جائے گا، شریعت کے خلاف کسی امر کے لیے سفارش نہیں کی جائے گی، خلیفہ مطیع نے جب یہ شرطیں مان لیں اور باقاعدہ اقرار نامہ لکھ دیا تو آپ نے اس عہدہ کو قبول کر لیا، آپ تمام عباسی قلمرو کے قاضی تھے۔

بنی بویہ کے دورِ اقتدار میں "عدالت" کی حالت نہایت ابتر تھی، اور اسے بالکل استقلال حاصل نہ تھا۔ ۳۹۴ھ میں بہار الدولہ نے ابو احمد حسین بن موسیٰ علوی کو قاضی القضاۃ کے منصب پر مامور کیا اور حج، مظالم، اور نقابت طالبیین، کے فرائض بھی اس کے سپرد کیے اور اس تقرر کے متعلق شیراز سے اسے باقاعدہ ایک تحریر بھی لکھ کر بھیجدی، لیکن خلیفہ قادر نے اس کے اس تقرر کی تصدیق نہیں کی اس کا بظاہر سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ، وہ علوی تھا، خلیفہ کے انکار کی وجہ سے وہ اس منصب پر فائز نہ ہوسکا۔[1]

ان واقعات سے یہ اندازہ بہ آسانی ہوسکتا ہے کہ اس منصب پر تقرر کے وقت خلفاء اور ان طاقتوں میں رسہ کشی ہوتی تھی جو وقتاً فوقتاً اس دور میں بغداد کی سیاسی طاقت پر حاوی رہیں، دونوں کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ میرا ہوا خواہ اس عہدہ پر مامور کیا جائے، اس ذہنیت اور کشمکش کی حالت میں نیک و بد اور مستحق اور غیر مستحق کی تمیز نہیں رہتی، اس لیے لازمی طور پر "عدالت" کی وقعت اور دیانت داری کی روح کا خاتمہ ہو گیا تھا، یہ بیان کرنا غالباً ضروری ہے کہ منصبِ قضاء پر تقرر کرنے کا حق دستوری اور رواجی طور پر خلیفہ کو ہر دور میں حاصل رہا، غاصب سیاسی طاقتیں رائے عامہ کے برانگیختہ ہونے کی وجہ سے "خلافت کے اس حق کو سلب کرنے سے جھجکتی تھیں۔

---

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۴۷۲

نظام عدالت مصر میں

عربوں کی تسخیر سے عہد فاطمی تک

حضرت عمرو بن عاص رضؓ نے مصر کی تسخیر کے بعد قومی قاضیوں کو اپنے منصب پر برقرار رہنے دیا، اس زمانہ میں حضرت عمرؓ نے قاضی القضاۃ کے منصب پر قیس ابن ابی العاص رضؓ کو مامور فرمایا تھا، جو اپنی وفات ربیع الاول ۲۳ھ تک اس عہدہ پر قائم رہے اُن کی وفات کے بعد ان کی جگہ عثمان بن قیس بن ابی العاصؓ کو مقرر کیا گیا، یہ بھی اپنی وفات تک اس عہدہ پر متمکن رہے، ان کی وفات حضرت علیؓ کے دور خلافت میں ہوئی، آپ کی وفات کے بعد یہ منصب کچھ عرصہ تک کس مپرسی کے عالم میں رہا، جب امیر معاویہؓ خلیفہ ہوئے تو آپ نے سلیم بن عشر تجیبی کو اس عہدہ پر مامور کیا، یہ ۴۰ھ کا واقعہ ہے۔

عدالت کا اجلاس جامع عمرو بن عاص میں ہوا کرتا تھا، اس وقت بحث و جرح زبانی ہوتی تھی اور وہ قلمبند نہیں کی جاتی تھی اور نہ ان کی باقاعدہ مثل مرتب کی جاتی تھی بلکہ قاضی زبانی فیصلہ سناتا اور خود ہی اسے نافذ کر دیتا تھا۔

بنی امیہ کے دور میں خلافتِ راشدہ کا طریقۂ کار باقی رہا اور اس کے لائحہ عمل میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی قاضی کے اختیارات و فرائض کا دائرہ ضرور وسیع ہو گیا، اور اب اسے دیوانی، مذہبی اور فوجداری اور پولیس سے متعلق مقدمات کی سماعت کے اختیاراتؔ حاصل ہو گئے

ؔ کندی - ص ۳۲۲

اس دور کے بعض قاضیوں نے مفید اصلاحات جاری کیں، مثلاً عبدالعزیز بن مروان (۸۶ھ) کے گورنری کے زمانہ میں سب سے پہلے قاضی مصر عبدالرحمٰن بن معاویہ بن خدیج نے یتیموں کے مال کے تحفظ کے لیے سرکاری انتظام کیا تھا۔

توبہ بن نمر حضرمی (۱۱۵ھ - ۱۲۰ھ) استقامت اور سلامت روی میں امتیازی درجہ رکھتا ہے، وہ اپنی تمام آمدنی و ملکیت اپنے بھائیوں کو دیدیا کرتا تھا، اس لیے لوگ اس کو مسرف کہا کرتے تھے۔ اس کا قابل قدر کارنامہ یہ تھا کہ اس نے اوقاف کے لیے باقاعدہ ایک محکمہ قائم کیا، اور وقف کی دولت کو تباہی اور توارث کے خطرہ سے مامون کر دیا تھا۔

عہد بنی امیہ کے قاضیوں کے مبلغ اجتہاد اور آزاد منصبی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ انہیں گواہوں کی شہادت ان کی مادری زبان میں سننے میں کوئی تامل نہ تھا، چنانچہ خیر بن نعیم حضرمی (۱۲۰ھ - ۱۲۷ھ) قبطیوں کی گواہی قبطی زبان میں سنا کرتے تھے۔

اموی خلفاء، قاضیوں کی کڑی نگرانی رکھتے تھے، اگر انہیں ان کی کسی کمزوری یا بے انصافی کا علم ہو جاتا تھا تو کبھی اس سے چشم پوشی نہ کرتے تھے، ایک دفعہ ہشام بن عبدالملک کو خبر پہنچی کہ قاضی مصر یحییٰ بن میمون حضرمی (۱۰۵ھ - ۱۱۴ھ) نے ایک یتیم کے معاملہ میں غیر منصفانہ فیصلہ کیا ہے تو ہشام کے لیے یہ ناقابل برداشت ثابت ہوا اور اس نے اپنے گورنر مصر کو لکھا "یحییٰ کو کان پکڑ کر نکال دو اور اس کی جگہ کسی پاکیزہ سیرت پرہیزگار، انسانی کمزوریوں سے مبرا شخص کو قاضی بنا دو، جسے حق و صداقت کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی طاقت متزلزل نہ کر سکے"[1]

مصر میں، عباسی عہد کے قاضیوں نے عدالت کے نظام میں بہت سی مفید

[1] کتاب القضاۃ ص ۳۳۲ - ۳۴۴

اصلاحات کی تھیں، قاضی غوث (سنہ ۱۳۵ھ بمطابق ۱۴ء) نے محکمۂ عدلیہ کو ان تمام برائیوں سے جو اس میں سرایت کر گئی تھیں، دور کیا ان معائب میں سرفہرست جھوٹی شہادت کا رواج تھا، قاضی غوث، جھوٹی اور سچی گواہی میں امتیاز کرنے کے لیے پہلے گواہوں کے کردار اور چال چلن کے متعلق نہایت خفیہ طور پر معلومات حاصل کرتا اور جب اُن کی سلامت روی و نیک کرداری کا یقین ہو جاتا تھا تو اُن کی گواہی قبول کر لی جاتی تھی، کندی کے الفاظ میں "یہ قانونی نکات اور ان کی پیچیدگیاں سلجھانے کی غیر معمولی قابلیت رکھتا تھا" اور عدل و انصاف اور اعتدال پسندی میں مشہور تھا۔ قاضی غوث کی عدل پروری کا یہ ایک معروف واقعہ ہے، کہ ایک دفعہ خلیفہ عباسی مہدی (سنہ ۱۵۸ھ۔ سنہ ۱۶۹ھ) پر ایک عورت نے دعویٰ دائر کیا، آپ نے عدالت کے اندر عورت اور خلیفہ کے نمائندہ میں کوئی امتیاز گوارا نہ کیا اور دونوں کو ایک صف میں کھڑا کیا۔

قاضی ابو خزیمہ (سنہ ۱۴۲ھ بمطابق ۷۵۹ء) کے زہد و تقویٰ کا یہ حال تھا کہ اگر اپنے کپڑے دھونے یا کسی جنازہ کی شرکت کی وجہ سے عدالت کے اجلاس کرنے کا موقع نہیں ملتا تو وہ اس روز کی تنخواہ نہ لیتے! اس واقعہ سے اس دور کے قاضیوں کی خاکساری اور تواضع کا اندازہ ہو سکتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس زندگی سے "آپ اپنے اکثر کام اپنے ہاتھ سے خود کر لیتے تھے" ان کی زندگی کتنی قریب تھی۔

مفضل بن فضالہ (سنہ ۱۶۸ھ [illegible] سنہ ۱۶۹ھ بمطابق ۷۸۵ء) نے عدالت کے نظام میں بہت سی اصلاحات کیں، وہ سب سے پہلا شخص تھا جس نے عدالتی کارروائیوں کی مثلوں کے فائل مرتب کرائے، اور وصایا و دیون کے متعلق تمام امور ان میں مندرج کیے گئے، اس کا ایک کارنامہ یہ تھا کہ اس نے گواہوں کی "عدالت" اور صداقت کی جانچ کے لیے ایک شخص کا تقرر کیا تھا، جسے "صاحب مسائل" کہا جاتا تھا، لیکن یہ اصلاح صرف ظاہری تھی، اس میں کوئی معنوی خوبی پیدا نہ ہو سکی، یہ شخص دو اور شخصوں سے کر چھپ کے گواہوں

کی عدالت وصداقت کی تصدیق قاضی کے سامنے کر دیا کرتا تھا۔ مفضل نے اس عہدہ کے مضر اثرات کو بہت جلد محسوس کر لیا لیکن جھوٹی شہادت کے عام رواج کے سامنے وہ بے بس بھی تھا، اس لیے شہادت کے فرائض انجام دینے کے لیے اس نے دس اشخاص کو متعین کر دیا لیکن جمہور نے دو وجہوں سے قاضی کی اس اصلاح کو پسند نہ کیا، اوّلاً شہادت صرف چند اشخاص میں محدود ہو کر رہ جاتی تھی، دوسرے یہ ایک ایسا نیا طریقہ تھا جسے اس سے پہلے کسی اور قاضی نے اختیار نہ کیا تھا

لہیعہ بن عیسیٰ (۱۹۶ھ - ۱۹۸ھ، ۱۹۹ھ - ۲۰۴ھ) نے "اوقاف" کے نظام کی طرف خصوصی توجہ کی اور اس میں چند اصلاحات کیں سب سے پہلے اوقاف کے مال و دولت کی باقاعدہ تنظیم کی گئی، اس کا ایک حصہ اہل مصر کے لیے مخصوص کیا اور اس "اوقاف" سے ان رضاکاروں کے وظائف مقرر کر دیے جو سرحدی مقامات پر "رضاکارانہ" مسلمانوں کی خدمات انجام دیتے تھے، لہیعہ سب سے پہلے قاضی تھے جنہوں نے قاضیوں کے فرائض و اختیارات کا خاکہ بنایا تھا جس پر ان کے مابعد کے جانشینوں نے عمل کیا۔

اس زمانہ کا نظامِ عدالت اپنی خوبیوں کے ساتھ عیوب و نقائص سے بھی خالی نہ تھا، اس کی وجہ سیاسی نظام کی پراگندگی تھی جس نے دنیائے اسلام کی مرکزیت کا قریب قریب خاتمہ کر دیا تھا، اس وقت قاضی رشوتیں لینے سے نہ جھجکتے تھے، اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ عدالت کے وقار اور ہیبت کا خاتمہ ہو گیا، عبد الرحمٰن بن عبد اللہ عمری کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے ایک لاکھ دینار رشوت سے حاصل کیے تھے، مزید برآں شراب نوشی اور رقص و سرود کی محفلوں سے بھی کوئی احتراز نہ تھا، ان باتوں نے اسے نظروں سے گرا دیا تھا لیکن ان اخلاقی برائیوں کے باوجود ایک کام اس نے یہ کیا تھا کہ گواہوں کی ایک فہرست مدوّن کرائی تھی، شہادت دینا صرف ان گواہوں کا کام تھا۔

اس دور کے قاضیوں میں ابن مسروق کندی (۱۷۷ھ - ۱۸۴ھ) سب سے مشہور قاضی گذرا ہے، اس کا امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے عدالت کے اعزاز و احترام کی سطح بہت بلند کردی تھی، اور گورنر مصر کے اثر و اقتدار سے "عدالت" کو آزاد کردیا تھا، وہ کبھی گورنر کے پاس نہ جاتا تھا، حالانکہ اس کے پیش رو قاضی، گورنروں کی بارگاہ میں جبین سائی فخر خیال کرتے تھے، اس کی اس جرأت کا یہ اثر ہوا کہ اس کے بعد قضاۃ نے دربارِ حکومت کی حاضری ترک کردی، علاوہ ازیں اس نے محکمۂ عدالت میں یہ زبردست اصلاح کی کہ ایک محفوظ الماری بنوائی جس میں عدالت کے کاغذات مہرشدہ حالت میں رکھدیے جاتے تھے۔ جب وہ عدالت کا اجلاس کرتا تھا اس وقت ان مہروں کو توڑ کر انہیں کھولا جاتا تھا۔

سٹانلی لین پول نے اپنی کتاب A HISTORY OF EGYPTIN IN THE MIDDLE AGES: میں ان الفاظ میں عہدِ اموی اور عہدِ عباسی کے ابتدائی دور کے قاضیوں پر تبصرہ کیا ہے۔

"فقہ اسلامی میں انہماک کی وجہ سے وہ غیر معمولی بصیرت رکھتے تھے، رائے عامہ کی نظر میں استقامت اور بلندیِ اخلاق کے لحاظ سے مشہور تھے، ان کے مرتبہ و عہدہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور اثر و نفوذ کے اعتبار سے ان کی شخصیت نمایاں درجہ رکھتی تھی، اس لیئے ان کے ساتھ وہ برتاؤ نہ تھا جو اور سرکاری عہدہ داروں کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا، چنانچہ قاضی عموماً متعدد گورنروں کے زمانہ میں اپنے عہدہ پر مامور رہتا تھا، نیا گورنر اپنے پیش رو کے زمانہ کے عہدہ داروں میں تغیر و تبدل کر دیتا تھا لیکن قاضی کو اس کے منصب سے علیحدہ نہ کرسکتا تھا، اگر قاضی کی کارروائیوں میں کوئی بالادست اقتدار دخل دیتا تو وہ فوراً اپنے عہدہ سے استعفاء دیدیتا، قاضیوں کے ساتھ جمہور کی غیر معمولی محبت کا یہ عالم تھا کہ گورنر اگر کسی قاضی کو معزول کرنے کا ارادہ کرتے تو مدت تک انہیں پس و پیش رہتا

اور عموماً وہ جمہور میں ہیجان پیدا ہو جانے کے خطرہ سے اس اقدام کی جرأت نہ کرتے تھے، عباسی عہد میں قاضیوں کو معزول کرنے کا اختیار گورنر کو حاصل نہ تھا، بلکہ معمولاً مرکزِ خلافت سے اس کا تعلق تھا اور براہِ راست وہیں سے ان کا تقرر بھی ہوتا تھا، اسی طرح ان کی تنخواہ کی تحدید اور اس کی ادائیگی کا تعلق بھی "بابِ خلافت" ہی سے تھا۔"

طولونیوں (۲۵۴ھ - ۲۹۲ھ) اور اخشیدیوں (۳۲۳ھ - ۳۵۸ھ) کے دور میں کسی خاص مذہبی فرقہ کے پیرو، قاضی مقرر نہ کیے جاتے تھے، بلکہ ہر فرقہ کے لوگ اپنی صلاحیت کی بنا پر اس عہدہ پر فائز ہو سکتے تھے۔ وہ اس کے بھی پابند نہ تھے کہ فریقین کے مذاہب کے مطابق فیصلہ کریں، بلکہ خود جس مذہب سے تعلق رکھتے تھے، اسی کے قوانین کے ماتحت فیصلہ کرتے تھے، اس دور کے قاضی پاکیزگیٔ اخلاق، استقامت اور نڈر ہونے میں ممتاز تھے۔

طولونیوں کے زمانہ کی ایک ممتاز شخصیت قاضی بکار بن قتیبہ کی ہے یہ مسلمانوں کا ممتاز ترین اور فقہ اسلامی میں غیر معمولی تبحر رکھنے والا قاضی گذرا ہے، اس کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے جو ابن طولون کے ساتھ پیش آیا تھا، واقعہ یہ تھا کہ خلیفہ عباسی معتمد کو جب اس کے بھائی موفق نے نظر بند کر دیا تو ابن طولون نے اسے نقضِ عہد بیعت اور خلافت کی بہت بڑی توہین پر محمول کیا، لیکن تہہ تک پہنچیے تو اس موقع پر ابن طولون کی ذاتی اغراض کام کر رہی تھیں، موفق نے اس کے پاس اس کی معزولی کا فرمان بھیج دیا تھا، اس فرمان نے اسے موفق سے برگشتہ کر دیا تھا، اس واقعہ کے وقت وہ دمشق میں تھا، اس نے وہاں سے فوراً ایک خط اہلِ مصر کے نام لکھا جس میں تحریر کیا "ابو احمد موفق نے معتمد کی بیعت توڑ دی، اُسے گرفتار کر لیا، اور غیر مہذبانہ سلوک کیا . . . . معتمد کی حالت ناگفتہ بہ ہے وہ بے حد گریہ وزاری کر رہا ہے۔" خطیب نے جمعہ کے روز مصر میں اپنے خطبہ میں

---

[1] کندی ص ۲۲۶

معتمد کے مصائب کا ذکر کیا اور آخر میں یہ دعا کی "اے اللہ! جس شخص نے خلیفہ کو محصور کر رکھا ہے اور اس پر ظلم و ستم توڑے ہیں اُس کے شر سے تو مظلوم خلیفہ کو نجات دے۔

ابن طولون نے دمشق میں ایک دربار منعقد کیا، جس میں قاضیوں، فقیہوں اور شام اور سرحدوں اور مصر کے سر برآوردہ لوگوں کو بلایا اور تمام لوگوں سے ایک محضر نامہ پر دستخط کرائے، جس میں موفق کو شرعی نقطۂ نظر سے خلافت کے لیے غیر مستحق قرار دیا گیا کیونکہ اس نے معتمد کو نظر بند کیا تھا۔ اس محضر نامہ پر صرف مصر کے تین اشخاص قاضی بکار بن قتیبہ، محمد بن ابراہیم اسکندرانی اور محمد بن موسیٰ نے دستخط نہیں کیے تھے۔ قاضی بکار نے موفق کی معزولی کی تصدیق کرنے سے صاف صاف انکار کر دیا تھا، یہ ۱۲ ذیقعدہ ۲۶۹ھ کا واقعہ ہے لیکن کندی کا بیان ذرا اس سے مختلف ہے وہ لکھتا ہے کہ قاضی بکار موفق کو نقضِ عہد بیعت کا مجرم قرار دینے اور اس بنا پر حق خلافت سے محروم ہونے میں ابن طولون کا ہم نوا تھا، لیکن موفق پر لعنت بھیجنے کا قائل نہ تھا، اس کی عبارت یہ ہے "قاضی بکار نے موفق کو "نقض عہد" کا مجرم قرار دیا، اور اس کی تصدیق کی، اس میں شام کے اور سرحدوں کے قاضی بھی ان کے ہم نوا تھے، احمد بن طولون نے ان لوگوں سے موفق پر لعنت کرنے کی خواہش کی، قاضی بکار نے انکار کیا، ابن طولون نے بار بار اصرار کیا قاضی نے برابر انکار کیا، اس پر ابن طولون سخت غضب ناک ہوا۔ اس سے پہلے وہ ان کا بہت ادب اور احترام کرتا تھا، اور سالانہ ایک ہزار دینار ہدیۃً بھیجتا تھا، جب اس کا عتاب ان پر نازل ہوا تو اس نے کہلا بھیجا "میرے عطایا کہاں ہیں؟" اس کے جواب میں قاضی بکار نے سولہ[۱۶] تھیلیاں جوں کی توں مہر شدہ ابن طولون کے گھر بھیجدیں جسے اس نے لے کر رکھ لیا، اس واقعہ سے "عدالت" کے ہر قسم کے اثر اور دباؤ سے آزاد ہونے اور قاضیوں کے دنیا سے زہد و بے نیازی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔[۱]

[۱] کتاب الولاۃ والقضاۃ۔ ص ۵۱۲

٢ فاطمیوں اور ایوبیوں کا عہد

فاطمیوں کی تسخیر مصر کے وقت ابوطاہر محمد بن احمد قاضی القضاۃ تھے، جو سنّی تھے اور ربیع الاول ۳۴۸ھ سے اس عہدہ پر مامور تھے، جوہر نے اس وقت ان کی جگہ کسی شیعہ کو دینا مصلحت وقت کے خلاف سمجھا، لیکن ان کے اثر و اقتدار کا خاتمہ کرنے کے لیے خفیہ کارروائیاں شروع کر دیں۔

خلیفہ معز فاطمی جب مصر کے قریب پہونچا تو اس وقت شہریوں نے اس کا پُر تپاک خیر مقدم کیا اور احترام میں اپنی اپنی سواریوں سے اُتر پڑے اور زمین بوس ہوئے اُس وقت صرف ابوطاہر تھے، جو سواری سے نہیں اُترے، جب وہ خلیفہ کے بالکل قریب پہونچے تو سواری سے اُترے اور زمین بوسی کی جگہ "سلام علیکم" کہا، معز نے اس چیز کو محسوس کیا اور اپنے کسی حاجب سے دریافت کیا، یہ کون صاحب ہیں۔ اس نے جواب دیا، قاضیِ مصر، جب لوگوں نے ابوطاہر کو اس رویہ پر ملامت کی تو آپ نے فرمایا "صرف خدا ہی کو سجدہ کرو ... اگر حقیقت میں تم اسی کی عبادت کرتے ہو"[1]

خلیفہ معز نے بھی ابوطاہر کو اپنی سیاسی پالیسی کے ماتحت منصبِ قضا سے ہٹانا غیر مناسب سمجھا، ممکن ہے ان کی غیر معمولی ذکاوت اور بدیہہ گوئی کا بھی اس میں دخل ہو، مقریزی نے ایک واقعہ لکھا ہے، خلیفہ معز نے ابوطاہر سے دریافت کیا "آپ نے کتنے خلیفہ دیکھے؟ قاضی صاحب نے برجستہ جواب دیا "خلیفہ ایک بھی نہیں دیکھا بجز معزالدین کے" خلیفہ اس جواب سے بہت خوش ہوا، اُسے علم تھا، ابوطاہر نے

[1] کنہری ص ۵۰۸

خلیفہ معتضد، مکتفی، اور مقتدر وغیرہ کو دیکھا ہے۔

لیکن، ابوطاہر کے اقتدار کو گھٹانے کی طرف، خلیفہ معزؔ کی توجہ مبذول رہی، اور رفتہ رفتہ اُسے پابندیوں میں جکڑ دیا گیا۔ پہلے خلیفہ نے اسے یہ حکم دیا کہ عقائد شیعی کے مطابق فیصلے کیے جائیں[۱] مزید برآں ایک مغربی شیعہ ابوسعید عبداللہ بن محمد بن ابی ثوبان کو شوال ۳۶۲ھ میں اس کا شریکِ کار کر دیا اور مغربی شیعوں کی اپیلوں کی سماعت اس کے سپرد کر دی[۲] شروع میں مغربی شیعوں کی اپیلیں ابوسعید کے پاس جاتی تھیں، چند روز کے لیے ان مشترک فیصلوں کی اپیلیں بھی اسی کے متعلق کر دی گئیں جن کا تعلق مغربی شیعوں اور مصریوں سے تھا، پھر اس کا اثر و نفوذ اتنا بڑھ گیا کہ خود مصریوں کی اپیلیں بھی اس کی عدالت سے متعلق ہو گئیں، اور اسے قاضی مصر و اسکندریہ کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

۳۶۳ھ میں خلیفہ معزالدین نے ابوسعید کی جگہ ایک دوسرا مغربی شیعہ قاضی، علی بن نعمان کو مقرر کیا اور عدالتی امور قاضی ابوطاہر اور اس میں تقسیم کر دیے، ابن نعمان، جامع عمرو بن عاصؓ اور قاضی ابوطاہر جامع ازہر میں عدالت کا اجلاس کرتے تھے ۳۶۶ھ میں جب قاضی ابوطاہر کبیر السنی اور ضعف و نقاہت کی وجہ سے اس عہدہ سے سبکدوش ہوئے تو ان کی جگہ مستقل طور سے ابن نعمان کو مقرر کیا گیا۔

نعمان کا خاندان ۳۹۸ھ تک منصب قضا پر فائز رہا، صفر ۳۹۳ھ میں حسین بن علی بن نعمان مصر اور اس کے صوبوں پر قاضی مقرر کیا گیا، اسے دعوت و تبلیغ کا منصب بھی تفویض کیا گیا، یہ شیعی دعوتِ تبلیغ کا اقتدارِ اعلیٰ تھا۔ یہ سب سے پہلا واقعہ تھا کہ قاضی القضاۃ کو دعوت و تبلیغ کے فرائض بھی سونپے گئے، اسی قاضی القضاۃ اور "داعی الدعاۃ" دونوں کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

۱؎ ابن میسر اص ۴۴- دمقریزی، اتعاظ الحنفاء ص ۹۲۔ ۲؎ کتاب جوہر صقلی (علی ابراہیم حسن) ص ۷۸-۸۰

فاطمیوں کے آخر دور میں کبھی کبھی سنیوں کو بھی منصب قضاء دیدیا جاتا تھا، اس زمانہ میں منصب قضاء پر صرف شیعوں کے تقرر کی پالیسی کو تھوڑا بہت بدل دیا گیا تھا، چنانچہ حاکم نے ایک سنی ابوالعباس بن عوام حنبلی کو قاضی مقرر کیا تھا، جو اپنی وفات تک اس عہدے پر مامور رہے تھے، آپ مصر، برقہ، صقلیہ، شام اور حرمین کے قاضی تھے، ابوالعباس کے ماتحت دارالضرب، معیار اور وزن وغیرہ کی دیکھ بھال، نماز، میراث، مساجد اور جامع مسجدوں کے انتظامات کے محکمے بھی تھے، اس جگہ یہ بیان کردینا ضروری ہے کہ ابوالعباس کے ساتھ مجلس عدالت میں خلیفہ کے شیعی نمائندے موجود رہتے تھے۔ اور فیصلہ صادر ہونے سے قبل خلیفہ کو عدالت کی کارروائی دکھا دینا ضروری تھا، اس لیے غیر شیعہ قاضی کا اقتدار صرف رسمی تھا ورنہ سچ پوچھیے تو اسے کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔

ابوعلی بن افضل بن بدر جمالی، وزیر اعظم خلیفہ حافظ (۵۲۴ھ - ۵۴۴ھ) نے یہ پابندی اٹھادی کہ عدالت کے فیصلے شیعی قانون کے ماتحت صادر ہوں، یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ ابوعلی بن افضل مذہب اثنا عشری سے تعلق رکھتا تھا، ابوعلی نے ۵۲۵ھ میں چار قاضیوں کا تقرر کیا تھا، ان میں دو شیعہ، دو سنی تھے، شیعہ قاضیوں میں، ایک قاضی اسمٰعیلیہ فرقہ، اور دوسرا امامیہ فرقہ کا پیرو تھا، سنی قاضیوں میں ایک قاضی، شافعی اور دوسرا مالکی تھا، ان قاضیوں کو اپنے اپنے مذہب کے مطابق احکام صادر کرنے میں پوری آزادی حاصل تھی، اس وزیر کے قتل کے بعد، امامیہ قاضی کے فرائض و اختیارات اسماعیلیہ قاضی کے سپرد کر دیے گئے تھے، یہ نظام ۵۶۴ھ تک برابر جاری رہا ۵۶۴ھ میں صلاح الدین ایوبی نے فاطمیوں کی خلافت کا خاتمہ کر دیا، اور فقہ کی تعلیم کے لیے وہاں دو مدرسے قائم کیے، ان میں ایک مدرسہ شافعی اور دوسرا مالکی تھا، تھوڑے عرصہ بعد صدر الدین عبد الملک بن درباس، قاضی القضاۃ کے مشورہ سے تمام شیعہ

قاضیوں کو معزول کر دیا گیا، اور ان کی جگہ ان سنی قاضیوں کو دیدی گئی جو شافعی مذہب کے پیرو تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنی مذہب پھیلنے لگا (سنی مذہب فاطمیوں سے پہلے عام طور پر مصر میں رائج تھا) اور مذہب شیعہ کے دونوں فرقوں اسماعیلیہ اور امامیہ کا اثر برابر گھٹتا گیا، اور آخر کار وہاں سے قریب قریب اس کا خاتمہ ہوگیا[1]

۳۔ مملوکوں کے عہد میں

مملوکوں کے عہد میں عدالت کا نظام اوج کمال پر تھا، مملوک سلاطین میں سب سے پہلے بیبرس نے مرافعہ یا اپیل کے لیے "عدالت عظمیٰ" قائم کی اور اس کے اختیارات خود اپنے ہاتھ میں رکھے، اور ہر ہفتہ، دوشنبہ پنجشنبہ کو اس کا اجلاس کرتا تھا، اس وقت اس کے پاس، مذاہب اربعہ کے قاضی، صاحب دیوان انشاء اور مالیات اور سول کے محکموں کے بڑے بڑے افسر موجود ہوتے تھے[2]

مملوکوں کے شروع زمانہ میں بدرالدین سنجاری قاضی القضاۃ تھے، ان کے جانشین تاج الدین عبد الوہاب ہوئے تھے، جن کی ماہانہ تنخواہ سو روپیہ تھی، اس وقت عدالت کے فرائض تاج الدین اور برہان الدین سنجاری میں تقسیم کر دیے گئے تھے، اور برہان الدین قاہرہ اور ساحلی آبادیوں کے قاضی تھے، اور تاج الدین مصر اور سمندر کے محاذی علاقوں کے قاضی تھے، ۶۶۰ھ میں برہان الدین معزول کر دیے گئے اور تمام مصر کی عدالت کے فرائض تاج الدین کو سونپ دیے گئے، ۶۶۳ھ (۱۲۶۵ء) میں بیبرس نے عدالت کے نظام میں اصلاحات کیں، اس کے بعد سلطان کی طرف سے مذاہب اربعہ کے چار قاضی مقرر کر دیے گئے، اس سے قبل پوری قلمرو کے لیے، صرف ایک قاضی تھا اور وہ تاج الدین تھے، نظام عدالت میں اس تبدیلی کی وجہ، تاج الدین کا تمرد اور اس کی متعصبانہ ذہنیت تھی اس وقت سے تاج الدین کی حیثیت صرف شافعی مذہب کے قاضی کی رہ گئی تھی، شیخ شرف الدین ابو حفص عمر بن صالح مالکی مذہب، قاضی بدرالدین بن سلیمان حنفی مذہب

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین ج ۱ ص ۱۲۱ و الفاطمیون فی مصر ص ۲۳۰-۲۳۱ [2] الخطط ج ۲ ص ۲۰۸

اور قاضی شمس الدین محمد بن شیخ عماد الدین حنبلی مذہب کے قاضی مقرر ہوئے، ان میں سے ہر ایک کے اختیارات و فرائض متعین کر دیے گئے، انہیں اکناف مصر میں اپنے ماتحت قاضی مقرر کرنے کا اختیار حاصل تھا، تاج الدین کے ماتحت، اوقاف، اموال یتامیٰ اور وراثت کا محکمہ بھی تھا، ان قاضیوں کے علاوہ فوج کا ایک قاضی ہوتا تھا، جو قضاۃ اربعہ کے ساتھ "عدالت گاہ سلطانی" میں موجود رہتا تھا، اور "عدالت گاہ سلطانی" میں سلطان کے قریب بیٹھتا تھا، قضاۃ اربعہ کو یہ اعزاز حاصل نہ تھا۔[1]

عدالت کا یہ نظام مملوکوں کی حکومت کے خاتمہ تک برابر قائم رہا، مملوکوں کے عہد کے، سب سے مشہور قاضی القضاۃ تاج الدین بنت اعز گذرے ہیں، انہی کو، ظاہر بیبرس نے امام احمد بن خلیفہ ظاہر بامر اللہ کے نسب کی تحقیق کے لیے مامور کیا تھا، جب دوسرے قاضیوں اور فقیہوں نے امام احمد کے نسب نامہ کو صحیح بتایا تو قاضی القضاۃ نے ان کی شہادت کو قبول کر لیا، اور صحت نسب کا فیصلہ کر دیا، اس وقت امام احمد کی بیعت خلافت کر لی گئی، قاضی القضاۃ کے بعد سلطان ظاہر بیبرس اٹھا اور اس نے بھی امام احمد کی بیعت کر لی، اس واقعہ سے اس زمانہ کے قاضی القضاۃ کی اہم حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے، اس دور کے دوسرے مشہور قاضی عز الدین بن جماعہ تھے، قاضی عز الدین نے بتایا تھا کہ خلیفہ عباسی مستکفی نے اپنی جانشینی کے لیے اپنے بیٹے احمد کے لیے وصیت کی ہے، چنانچہ ان کے کہنے پر عمل کیا گیا تھا اور احمد کی بیعت خلافت کر لی گئی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاضیوں کی زبان پر کتنا اعتماد کیا جاتا تھا۔

قاضیوں کی تنخواہیں

حضرت عمرؓ نے کوفہ کے قاضی حضرت شریحؒ کی تنخواہ ۱۰۰ درہم مقرر کی تھی، اس کے علاوہ گندم کی کچھ مقدار بھی دی جاتی تھی، بنی امیہ کے زمانہ میں

[1] صبح الاعشیٰ ج ۴ ص ۳۶

وسائل آمدنی کی زیادتی کے ساتھ تنخواہوں میں بھی اضافہ کر دیا گیا تھا، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانہ میں قاضیوں کو بالکل تنخواہ نہیں دی جاتی تھی، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ قاضیوں کی تنخواہ کو جائز نہ سمجھتے تھے، اُن کا خیال تھا کہ یہ مذہبی خدمت ہے اس کا معاوضہ نہ لینا چاہیے امویوں کے آخری فرماں روا مروان بن محمد کے زمانہ میں قاضی کی تنخواہ دس دینار تھی، اس کا علم اس سرکاری کاغذ سے ہوا ہے جس میں مروان نے بیت المال کے خزانچی کو لکھا تھا کہ قاضی عبد الرحمٰن بن سالم کو دس دینار ماہانہ تنخواہ دی جائے اس سرکاری دستاویز پر ۱ ار ربیع الاول ۱۳۱ھ کی مہر ہے

دورِ عباسیہ میں قاضی مصر کی ماہانہ تنخواہ ۳۰ دینار تھی، ابن لہیعہ کو یہی تنخواہ ملتی تھی، مامون کے زمانہ میں عیسیٰ بن منکدر قاضی مصر کی تنخواہ ۲۷۰ دینار ماہانہ تھی، عہد عباسیہ میں یہ سب سے بڑی تنخواہ تھی، اس سے زیادہ تنخواہ کسی قاضی کو نہیں دی گئی، احمد بن طولون کے زمانہ میں قاضی بکار کی تنخواہ ایک ہزار دینار ماہانہ تھی، فاطمیوں کے عہد میں یہ تنخواہ ۱۲۰۰ دینار ماہانہ تھی، غلہ وغیرہ اس میں داخل نہ تھا۔

دورِ عباسیہ میں جاگیرداروں کو جاگیروں کے بدلہ میں رقم کی ایک معین مقدار بیت المال میں داخل کرنا پڑتی تھی، حکومت کو اس سے غرض نہ تھی کہ کم وصول ہوا یا زیادہ اسے اپنی معین مقدار سے کام تھا، عہدِ عباسیہ کے آخر زمانہ میں یہ نظام محکمۂ عدلیہ تک متعدی ہو گیا تھا اور قاضی ایک خاص مقدار رقم کی ادا کرنے کا وعدہ کرتا تھا اور وہ اس رقم کو محکمۂ عدالت سے وصول کرتا تھا، اور معین مقدار حکومت کو بھیج دیتا تھا، اور باقی رکھ لیتا تھا، عبد اللہ بن شوارب (۳۵۰ھ) نے معز الدولہ بن بویہ سے ۲۰۰۰۰۰ درہم سالانہ بغداد کی قضاء کے بدلہ ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

۲۔ عدالتِ عظمیٰ

"عدالتِ عظمیٰ" میں ماتحت عدالت کے فیصلے اس وقت بھیج دیے جاتے تھے جب وہ انہیں نافذ کرنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی، یا جب فریقین کو اس کے فیصلے سے اطمینان نہ ہوتا اُس وقت وہ "عدالتِ عظمیٰ" میں اپیل کر سکتے تھے، اس محکمے کے قیام کی اساسی غرض اربابِ اقتدار کے جبر و استبداد کا استیصال تھا، اس منصب پر صاحبِ جاہ و جلال، حد درجہ پرہیزگار اور نہایت طاقت ور شخص کو مامور کیا جاتا تھا، اسے "قاضی مظالم" کہا جاتا تھا اور عدالتِ عظمیٰ "محکمہ مظالم" کے نام سے موسوم تھی۔

خلافتِ راشدہ میں صرف حضرت علیؓ نے "عدالتِ عظمیٰ" کے فرائض انجام دیے تھے، لیکن آپ نے اس کے لیے کوئی دن یا کوئی وقت مقرر نہیں کیا تھا، بلکہ شب و روز میں جس وقت بھی کوئی مظلوم ان سے دادخواہ ہوتا اسی وقت وہ انصاف کر دیتے تھے، عبدالملک بن مروان سب سے پہلا فرماں روا گذرا ہے جو باقاعدہ اس کے لیے اجلاس کیا کرتا تھا، عبدالملک نے ایک دن مقرر کر دیا تھا جس میں وہ مظلوموں اور غیر منصفانہ فیصلوں پر غور و خوض کرتا اور ان کا عادلانہ فیصلہ کرتا تھا، عبدالملک نے اپنی امداد کے لیے قاضی ابن ادریس ازدی کو اپنا شریک کار بنا لیا تھا، قاضی ابن ادریس پیچیدہ معاملات کو سلجھانے میں مدد کرتے اور عبدالملک "اقتدار اعلیٰ" کی حیثیت سے فیصلہ کرتا تھا۔

"عدالتِ عظمیٰ" خلیفہ اور خود مختار گورنروں کے ماتحت ہوتی تھی، یہ عہدہ اگرچہ

کسی بڑے عہدہ دار کے سپرد کیا جاتا تھا تو وہ ایک دن اس کے فرائض ادا کرنے کے لیے مخصوص کر لیتا تھا، اور اگر مستقل اس عہدہ پر کسی شخص کا تقرر کیا جاتا تھا تو وہ روزانہ اس کے فرائض انجام دیتا تھا۔

"عدالت عظمیٰ" کا اجلاس مسجد میں ہوتا تھا، اس وقت "قاضی مظالم" کے ساتھ دیگر پانچ گروہ موجود ہوتے تھے۔

۱۔ مسلح پولس اور فوج۔ مقصد یہ تھا کہ مجرموں کو سرکشی کی جرأت نہ ہو اور عدالت کے فیصلہ سے سرتابی نہ کر سکیں۔

۲۔ حکام، یہ فریقین کے بارے میں واقعات کی تحقیقات پیش کرتے تھے اور قاضی مظالم ان کی تحقیقاتی رپورٹ سے استفادہ کرتا تھا۔

۳۔ فقہاء، ان سے "صاحب مظالم" شرعی مسائل دریافت کر لیتا تھا، جب کسی مسئلہ میں اسے تامل یا شبہ ہوتا تھا۔

۴۔ محرر، یہ فریقین کے بیانات اور قاضی مظالم کے فیصلے قلم بند کرتے تھے۔

۵۔ گواہ، ان کا کام ماتحت عدالت کے فیصلہ کے بارے میں تائید یا تردید تھی۔[۱] "قاضی مظالم" کے فرائض میں حسب ذیل چیزیں داخل تھیں۔

۱۔ ان مقدمات کی سماعت اور فیصلے جو جماعتوں یا اشخاص کی طرف سے گورنروں خراج کے افسروں، اور محکموں کے محرروں کے خلاف دائر کیے جاتے تھے۔

۲۔ تنخواہوں میں تخفیف یا تاخیر سے متعلق مقدمات کے فیصلے۔

۳۔ ان احکامات کا نافذ کرنا، جو محتسب اور قاضی نہ کر سکے تھے۔

۴۔ حج، عید، جمعہ اور جہاد اور دوسری عبادات کا قیام اور تحفظ۔

اس سرسری جائزہ سے اس عہدہ کی اہمیت اور اقتدار کا اندازہ آسانی سے ہو جاتا ہے۔[۲]

---

[۱] الاحکام السلطانیہ ص ۷۳ - ۸۱ [۲] دیکھیے فجر الاسلام ص ۲۷۰ - ۳۰۱ - وضحی الاسلام ص ۱۵۱ - ۲۴۲

۳۔ احتساب

عہدِ جدید کی طرح، قاضی یا جج کے اختیارات و فرائض، قاضی، محتسب اور "قاضی مظالم" کے درمیان منقسم تھے، قاضی کا کام ان مقدمات اور قضیوں کا فیصلہ تھا، جو عام طور پر مذہبی معاملات سے تعلق رکھتے تھے، محتسب کے اختیارات و فرائض کا دائرہ عمل امن عامہ کے تحفظ کی عملی کارروائیوں تک محدود تھا، اسے بسا اوقات شہری امن و امان کی حفاظت کے لیے فوری تدابیر اختیار کرنا پڑتی تھیں، "قاضی مظالم" کا کام اُن مقدمات کے فیصلے اور اُن کا نفاذ تھا، جو قاضی اور محتسب کے امکان یا اختیارات سے خارج تھے۔

عدالت اور احتساب کے فرائض و اختیارات بعض دفعہ ایک ہی شخص کے سپرد کر دیے جاتے تھے، اس وقت نہایت باوقار اور غیر معمولی بیدار مغز انسان کا انتخاب عمل میں آتا تھا، یہ بیان کرنے کی غالباً حاجت نہیں کہ قاضی کی کارروائیوں کے لیے تحقیقات اور صبر و وقار کی ضرورت ہے اور محتسب کے فرائض عموماً عجلت کے متقاضی ہیں۔[1]

محتسب احکام شرعی کا تحفظ کرتا تھا اور ان کی پابندی کراتا تھا، منڈیوں اور بازاروں کے نظم و نسق کی نگرانی کرتا تھا اور ان تمام باتوں کا سدِ باب کرتا تھا، جن کا منڈیوں

---

[1] الاحکام السلطانیہ ص ۶۱ - ۶۲

پر بُرا اثر پڑنے کا اندیشہ ہوتا تھا محتسب قرضوں کو ادا کراتا تھا وزنوں اور پیمانوں کی جانچ پڑتال کرتا رہتا تھا اور اس کام کے لیے ایک باقاعدہ آفس تھا[۵۹] جہاں تمام دکان داروں اور خرید و فروخت کرنے والوں کو معین اوقات میں آنا پڑتا تھا اور وہ اپنے وزن اور پیمانے وغیرہ اپنے ساتھ لاتے تھے۔ اس آفس میں باقاعدہ ان کی جانچ کی جاتی تھی، یہ آفس فاطمیوں اور ایوبیوں دونوں ادوار میں قائم تھا۔[۶۰]

حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے احتساب کا نظام قائم کیا تھا، اور وہ بذاتِ خود محتسب کے فرائض انجام دیتے تھے، محتسب کے فرائض کو اختصار کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے" امر بالمعروف و نہی عن المنکر" اجتماعی زندگی کے آداب کی حفاظت اور نگرانی، ناموس و آبرو اور امانت کا تحفظ محتسب کے یہ فرائض تھے۔

فاطمیوں کے عہد میں احتساب کا نظام بہت ترقی یافتہ حالت میں تھا، اس عہد میں محکمۂ احتساب کی طرف سے مختلف عہدہ دار بازاروں اور منڈیوں میں پھرتے رہتے تھے اور خورد و نوش وغیرہ کی اشیاء کی تفتیش اور دیکھ بھال، جانوروں پر ان کی طاقت سے زیادہ سامان لادنے پر سرزنش کرتے، اور سقّوں کو مشکوں کے ڈھانپنے کی تاکید کرتے تھے، ان کے فرائض میں پائجاموں اور تہبندوں کی نگرانی بھی داخل تھی کہ کہیں آدابِ عامہ اور تہذیب و معاشرت کے خلاف تو نہیں بندھے ہیں۔ یہ مکتبوں کے ملاؤں کو چھوٹے بچوں کو بے دردی سے مارنے سے روکتے تھے۔ محتسب جامع عمرو اور جامع ازہر میں مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے اجلاس کیا کرتا تھا۔ اس کے اختیارات عہدِ فاطمیہ میں اس قدر وسیع تھے کہ پولس کے لیے اس کے احکام کا نفاذ ضروری تھا، محتسب کی ماہانہ تنخواہ اس دور میں ۳۰ دینار (۵۰ اروپیہ) تھی۔[۶۱]

---

[۵۹] الاحکام السلطانیہ ص ۲۴۷، ۲۳۰، ۲۳۳ [۶۰] مقدمہ ابن خلدون ص ۲۲۵ — ۲۲۶، خطط ج ۱ ص ۴۶۳ — ۴۶۴

باب پنجم

نظامِ غلامی

۱ ۔ غلامی یونانیوں، رومیوں اور یہودیوں میں۔

۲ ۔ اسلام سے قبل عربوں میں۔

۳ ۔ اسلام میں۔

غلامی

۱۔ یونانیوں، رومیوں اور یہودیوں میں

یونان کے فلاسفہ نے نوعِ انسانی کو دو قسموں میں تقسیم کیا تھا، پیدائشی آزاد، پیدائشی غلام۔ ان کے خیال میں، دوسری قسم، صرف پہلی جنس کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہے ارسطو نے غلامی کا رواج سوسائٹی کے لیے ضروری قرار دیا تھا، اس کا زاویۂ نگاہ تھا کہ "ریاست (.STATE) کے قیام کی حقیقی غرض یہ ہے کہ وہ ہیئتِ اجتماعی یا سوسائٹی کی زندگی کو بہتر سے بہتر بنا سکے، اس مقصد کے لیے ناگزیر ہے کہ غلاموں کا وجود بھی ہو تاکہ ریاست کے سخت جسمانی کام غلام انجام دے سکیں جنہیں سوسائٹی نہیں کر سکتی یا کرنا نہیں چاہتی"، اس غرض کے لیے یونانی ان لوگوں کو غلام بنا لیتے تھے جنہیں وہ جنگوں میں گرفتار کر لیتے تھے اور سوسائٹی کے ذلیل کام ان سے لیتے تھے، اور یونانی خود ریاست کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوتے اور دستوری مجلسوں کے فرائضِ رکنیت انجام دیتے تھے۔

رومیوں کا عقیدہ تھا کہ تمام لوگ آزاد پیدا ہوئے ہیں، مگر اس عقیدہ کے باوجود ان کی نظر میں، وہ لوگ جو جنگ میں قیدی بنا لیے جائیں یا ان کے والدین غلام ہوں، یا جو لوگ اپنا قرض ادا نہ کر سکتے ہوں، یا لشکر سے بھاگ گئے ہوں یہ سب لوگ غلامی کی

زندگی کے مستحق تھے۔

یہودیوں میں غلاموں کی دو قسمیں تھیں، ایک تو، وہ یہودی تھے جنہیں کسی مذہبی جرم یا قرض کی عدم ادائیگی کی وجہ سے غلام بنالیا جاتا تھا، دوسرے غیر اقوام کے وہ اشخاص تھے جنہیں جنگوں میں گرفتار کیا جاتا تھا، یہ غلام گھروں کا کام، محفلوں کے چھوٹے کام اور کاشت کاری وغیرہ کیا کرتے تھے، اور ان کی حیثیت میں کاموں کے اختلاف سے کوئی فرق نہ پیدا ہوتا تھا، یہ لوگ سوسائٹی میں نہایت ذلت سے اپنی زندگی کے دن پورے کرتے تھے، حضرت عیسٰی علیہ السلام نے غلامی کا "رواج" مٹانا تو کجا، اس حیوانیت سے فروتر طبقہ کی سطح زندگی بلند کرنے کے لیے بھی کوئی قدم نہ اٹھایا تھا۔

۲۔ غلامی

عہد جاہلیت میں

دوسری قوموں کی طرح عربوں میں بھی غلامی کا رواج موجود تھا، عربوں میں غلامی، جنگ میں اسیری کا نتیجہ ہوتی تھی، اس وقت اپنے اور غیر کا کوئی امتیاز نہ تھا، اور کسی عربی نسل کے آدمی کو غلام بنانے میں انہیں کوئی تامل نہ ہوتا تھا، لیکن رومیوں میں یہ احساس تھا اور ایک رومی دوسرے رومی کو غلام بنانا جائز نہ سمجھتا تھا، عربوں کا معمول[1] تھا کہ جب کسی باعزت قیدی کو رہا کرتے تو اس کی پیشانی کے بال تراش لیتے اور ان پر بہت فخر و ناز کرتے تھے۔

عربوں میں غلاموں کی باقاعدہ خرید و فروخت ہوتی تھی، عہد جاہلیت میں، غلاموں کی خرید و فروخت قریش کی غیر معمولی ثروت کا ایک اہم ذریعہ تھی، اس دور میں غلاموں کا سب سے مشہور تاجر عبداللہ بن جدعان تھا، اس کی تجارت کا دائرہ بہت وسیع تھا، عربوں میں غلاموں کی اولاد بھی غلام خیال کی جاتی تھی، غلام اس زمانہ میں تمام تمدنی حقوق سے محروم تھے، انہیں اپنی زندگی کی ضروریات کے لیے خرید و فروخت اور دوسرے "تصرفات" کا کوئی اختیار نہ تھا۔

---

[1] بلوغ الارب فی احوال العرب ج ۳ ص ۱۴

دورِ جاہلیت میں غلامی سے نجات پانے کی چند صورتیں ہوتی تھیں، آقا کسی غلام کے بہت بڑے کارنامے سے خوش ہو کر اس کو آزاد کر دیتا، کسی جنگ میں غیر معمولی شجاعت کا اظہار کرتا، اس کی وجہ سے آزاد کر دیا جاتا، یا اپنے آقا کی انتہائی خیر خواہی اور محبت کا ثبوت دیتا، اس کے بدلہ میں آزادی مل جاتی، اس زمانہ میں غلاموں کی آزادی کی ایک قسم "سائبہ" (بالکل آزاد) ہوتی تھی، اس کا مطلب یہ تھا کہ غلام کے آزاد کرنے کے بعد نہ آقا کو غلام کے کسی بیت اور تاوان سے واسطہ رہتا، نہ آقا غلام کے مرنے کے بعد اس کے ترکہ کا وارث ہوتا۔

۳۔ غلامی

اسلام میں

اسلام نے غلاموں کی حیثیت صرف جنگی قیدیوں کی قرار دی، اور ان سے منصفانہ برتاؤ اور شفقت اور مہربانی سے پیش آنے کی ہدایت کی، قرآن کی بہت سی آیات اس دعویٰ کی دلیل ہیں۔ مثلاً

"اور (دیکھو) اللہ کی بندگی کرو، اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھیراؤ اور چاہیے کہ ماں باپ کے ساتھ، قرابت داروں کے ساتھ، پڑوسیوں کے ساتھ، خواہ قرابت والے پڑوسی ہوں، خواہ اجنبی ہوں، نیز پاس کے اٹھنے بیٹھنے والوں کے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ جو مسافر ہوں یا (لونڈی غلام ہونے کی وجہ سے) تمہارے قبضہ میں ہوں احسان و سلوک سے پیش آؤ۔

(سورہ نساء آیت ۳۶)

اسلام میں غلامی کی سب سے اہم وجہ جنگ میں اسیری تھا، گرفتاری کے بعد ان غیر مسلم قیدیوں کا انجام قتل، فدیہ کی رقم دے کر رہائی حاصل کرنا، بلا فدیہ آزاد کر دیا جانا یا غلام بنا لینے کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا۔ تاریخ کے صفحات میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا ہے، جس سے یہ ثابت ہو کہ کسی امیر نے جنگ کے قیدیوں کو قتل کرا دیا ہو، ہاں اس صورت میں جب کسی قیدی کا خطرہ مسلمانوں کی اجتماعی ہیئت پر پڑنے کا اندیشہ ہوتا تھا اور شدید ہوتا تھا،

اس وقت ضرور اس قسم کے ایک آدھ خطرناک قیدی کو ختم کیا جاتا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نضر بن حارث کے قتل کا حکم دیا تھا جس نے آنحضرتؐ کی ایذا رسانی، مسلمانوں کی ہجو، مسلمانوں کی ماں، بہنوں کی شان میں عشقیہ اشعار اور انہیں بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا، پھر بھی آنحضرتؐ نے ایک بار اسے امان دیدی تھی اور حدودِ مدینہ چھوڑ دینے کے لیے چند روز کی مہلت بھی دیدی گئی تھی، مگر اس کی موت اسے وہیں چکر دیتی رہی، لیکن جب میعاد گذر جانے کے بعد بھی مدینہ کے حدود میں پایا گیا تو اسے قتل کر دیا گیا، دوسری صورت فدیہ کی ہے، اسیر اسے قبول کرنے کے بعد رہا کر سکتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیرانِ بدر کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا تھا، اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کے قبضہ میں اس کثرت سے قیدی غلام تھے کہ ایک ایک مسلمان کے پاس سینکڑوں کی تعداد میں موجود تھے۔

اسلام اور غلامی

اسلام نے غلاموں کی حیثیت جنگی قیدیوں کی قرار دی، امام کو اختیار دیا گیا کہ بلا کسی قسم کی شرط اور قید کے انہیں چھوڑ دے یا مال کا فدیہ لے لے، یا اس شخص کے حوالہ کر دے جس نے اسے قید کیا تھا۔

جنگ کے بعد کفار کو خوب مضبوط باندھ لو، پھر اس کے بعد انہیں یا تو بلا معاوضہ چھوڑ دینا یا معاوضہ لے کر چھوڑ دینا۔ (آیت ۴ سورہ محمدؐ)

اسلام نے نوعِ انسانی کے امتیازاتِ باطل کو مٹا دیا، سیاہ و سفید، بدوی شہری حاکم و محکوم اور مرد و زن میں کوئی آئینی حد فاصل قائم نہ کی، اسلام نے حلیف یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کے درمیان بھی آئینی مساوات قائم کر دی اور کسی تفاوت کو گوارا نہ کیا، قرآن نے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کا بھائی قرار دیا، انسانیت میں اگر کوئی فرد دوسرے سے ممتاز ہے تو اس کی وجہ صرف ایمان کی کمی بیشی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے یادگار عالم خطبہ حجۃ الوداع میں صاف صاف الفاظ میں فرما دیا تھا "لوگو! مسلمان آپس میں حقیقی بھائی ہیں

کی طرح ہیں، تمہارا خدا ایک، تمہارا مورثِ اعلیٰ ایک یعنی تم سب آدمؑ کی اولاد سے ہو اور آدمؑ کا خمیر مٹی سے اٹھا تھا، خدا کے نزدیک تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اس سے سب سے زیادہ ڈرتا ہے، عربی نسل کے انسان کو غیر عربی نسل کے انسان پر کوئی فوقیت نہیں، فوقیت ہے تو صرف تقویٰ کی وجہ سے۔"

اسلام میں ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کو اسیر کرنا اور اسے غلام بنانا مطلق جائز نہ تھا، لیکن غیر مسلم جب جنگوں میں گرفتار کیے جائیں تو انہیں غلام بنانے میں کوئی مضائقہ نہ تھا، اس وقت عربی النسل اور غیر عربی النسل میں بھی کوئی امتیاز نہ تھا،

شریعت اسلامی میں کسی مسلمان کو کسی حالت میں بھی غلام بنانا جائز نہیں ہے، صرف جہاد کے (جو خدا کے نام اور دین کی سربلندی کے لیے کیا گیا ہو) اسیرانِ جنگ غلام بنائے جا سکتے ہیں، اس وقت یہ ضروری تھا کہ غیر مسلموں نے مسلمانوں پر حملہ کرنے میں پیش قدمی کی ہو، لیکن جو غیر مسلم قومیں مسلمانوں سے برسرِپیکار نہ ہوں، انہیں امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ (ایک روایت میں) کے نزدیک غلام بنانا بالکل ناجائز ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کی تحقیر اور ان کی اہانت کی ممانعت فرمائی، ایک آزاد کردہ غلام نے شرفاءِ عرب کے ایک ممتاز خاندان "بنی بیاضہ" میں نکاح کا پیغام دیا، آنحضرتؐ نے اس کی سفارش کی، اس خاندان کے لوگوں نے کہا "رسول اللہ کیا ہم اپنی بیٹیاں اپنے غلاموں سے بیاہ دیں"، آپؐ کو ان کا یہ سوال ناگوار گذرا، اس وقت خدا کا یہ حکم نازل ہوا۔

لوگو! ہم نے تمہیں ایک ماں باپ سے پیدا کیا اور گروہ اور قبائل تو باہمی شناخت کے لیے کر دیے، خدا کے نزدیک سب سے بہتر وہ ہے جو اس سے سب سے زیادہ ڈرتا ہے۔[1]

[1] آیت ۱۳ سورۂ حجرات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہ بن زیدؓ کو، جو ایک نوعمر غلام تھے مسلمانوں کے اس لشکر کا جنرل بنایا تھا جس میں ممتاز اور تجربہ کار صحابہؓ موجود تھے، اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ جیسی شخصیت انہیں رخصت کرنے نکلی تھی، اس وقت حضرت اسامہؓ سوار تھے اور حضرت ابوبکرؓ پیدل چل رہے تھے، اگرچہ حضرت اسامہؓ نے متعدد بار کہا "خلیفۂ رسول اللہ! آپ کو بھی سوار ہونا پڑے گا ورنہ میں بھی اتر پڑوں گا" آپ نے فرمایا نہ تم اترو گے، نہ میں سوار ہونگا"[۱] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحشؓ کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام، زید بن حارثہؓ سے کر دیا تھا، اس سے بھی زیادہ مساوات کا اعلیٰ نمونہ یہ تھا کہ پھر ان سے خود آپؐ نے نکاح کر لیا تھا، درآں حالے کہ وہ آپؐ کے ایک غلام کی بیوی رہ چکی تھیں، تاریخ اسلام کا یہ ایک اہم واقعہ ہے۔

اسلام نے غلاموں کی سطح زندگی بلند کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا، اسلام نے غلاموں کو آزادی کے راستہ پر لا کھڑا کیا اور آقا و غلام میں، کھانے پینے، تعلیم و تہذیب، اور بہت سے تمدنی حقوق میں مساوات قائم کر دی، آنحضرتؐ نے غلاموں کے ساتھ حسنِ معاشرت پر برانگیختہ کیا اور بدسلوکی سے بہت سختی کے ساتھ روکا، اگر آپؐ کو معلوم ہو جاتا کہ کوئی مسلمان اپنے کسی غلام سے بدسلوکی سے پیش آتا ہے تو آپؐ اُسے آزاد کرنے پر مجبور کرتے، غلاموں کی آزادی کے لیے شریعتِ اسلامی نے اسباب اور ماحول پیدا کر دیا، چنانچہ قسم کے کفارہ میں، ایفار نذر میں، اور "محض ثواب کی خاطر" اُنہیں آزاد کر دیا جاتا تھا۔

اسلام نے غلامی کو ایک عارضی چیز قرار دیا اور غلاموں کے لیے اپنی آزادی کو حاصل کرنے کے لیے بہت وسیع میدانِ عمل پیدا کر دیا۔

اگر تمہارے لونڈی غلام تم سے مکاتبت کی درخواست کریں تو تم انہیں مکاتب بنا دو۔ (آیت ۳۳۔ سورہ توبہ)

[۱] طبری، ج ۳، ص ۲۱۲

مکاتبت

مکاتبت کا مفہوم یہ ہے کہ آقا سے غلام ایک معین مقدار، محدود مدت میں ادا کرنے کا معاہدہ کرلے، یہ رقم ادا کردینے کے بعد وہ آزاد خیال کیا جاتا تھا، ادائیگی کی اس مدت میں غلام تجارت، خرید وفروخت اور دوسرے تصرفات کرسکتا تھا جن سے وہ مال فراہم کرسکے۔

حضرت جویریہؓ بنت حارث جو بنی المصطلق کے اسیران جنگ میں تھیں اور اپنی قوم کے سردار کی صاحبزادی تھیں، لڑائی کے بعد باندی کی حیثیت سے ثابتؓ ابن قیس کے حصہ میں آئی تھیں، یہ ان کی خودداری کے لیے بہت بڑا حادثہ تھا، انہوں نے ابن قیسؓ سے مکاتبت کی درخواست کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مالی امداد کے لیے حاضر ہوئیں، اس وقت آنحضرتؐ نے ان کے دل سے اسلام سے بغض ونفرت دور کرنے کے لیے بہت مناسب موقع خیال کیا اور انہیں مکاتبت کے مال کی معین مقدار دیدی اور مزید تالیف قلب کے لیے ان سے نکاح کی درخواست کی، جسے انہوں نے بصد عزت قبول کیا۔[1]

فقہاء اسلام کا اتفاق ہے کہ مکاتبت مستحب ہے، امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک یہ واجب ہے، جب غلام آقا سے اپنی خرید کردہ قیمت یا کچھ زیادہ کے عوض آزاد ہونے کی درخواست کرے۔

مکاتب اگر درمیان میں مکاتب بننے سے انکار کردے اور اس کے پاس اتنی

---

[1] سیرۃ ابن ہشام۔ غزوہ بنی المصطلق۔

رقم ہو جو آقا اور غلام میں طے ہوئی تھی، اس وقت مذہب حنفی کے مطابق اسے رقم ادا کرنے پر مجبور کیا جائے گا، تاکہ وہ غلامی کی لعنت سے آزاد ہو جائے۔ اگر اتنی رقم نہ ہو، لیکن وہ کمانے کی استعداد رکھتا ہے تو امام مالکؒ کے زاویہ نظر سے اسے کمانے پر مجبور کیا جائے گا، فقہاء مکاتبت کے وقت غلام کی حالت اور صلاحیتوں کا لحاظ کرتے ہیں اور اسی کے مطابق رقم معین کرنے کی اجازت دیتے ہیں، ان کے نزدیک محض آزاد کرنے کے معمولی وعدہ، بلکہ ہلکے سے اشارہ سے بھی آقا پر آزاد کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ قرآن نے ان الفاظ میں غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے آمادہ کیا ہے۔

"آپ کو معلوم ہے (زندگی کی تاریک گھاٹی سے نجات دینے کا کیا مفہوم ہے؟ کسی گردن کا غلامی سے چھڑا دینا۔" (سورہ بلد پ ۳۰)

تدبیر مدبر بنانے کا مفہوم یہ تھا، کہ آقا اپنے غلام کی آزادی کے لیے مرنے سے قبل وصیت کر دے، آقا کے مرنے کے بعد یہ غلام آزاد ہو جاتا تھا، ائمہ کا اجماع ہے، اگر ایک شخص کے قبضہ میں عاقل بالغ غلام ہو، اور وہ دعویٰ کرے کہ یہ میرا غلام ہے، اور غلام کو اس سے انکار ہو، ایسی حالت میں قسم کے بعد غلام کا قول معتبر ہوگا، اور اسے آزاد خیال کیا جائیگا اس جگہ اسلام کے مشہور قانون "شہادت مدعی پر اور قسم مدعا علیہ پر ضروری ہے" کے مطابق یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی زاویہ نگاہ سے غلامی ایک عارضی چیز ہے اس لیے مدعی کو شہادت پیش کرنے کی "تکلیف" دی گئی اور مدعا علیہ کی قسم پر اکتفا کیا گیا۔

اسلام کا قانون ہے، ایک پڑا ہوا بچہ اگر دو شخصوں کے درمیان وجہ نزاع ہو، ایک شخص مسلمان ہو، دوسرا غیر مسلم، مسلمان کا دعویٰ ہو کہ یہ میرا غلام ہے اور کافر کہتا ہو، یہ میرا بچہ ہے، اس وقت قاضی کافر کے حق میں فیصلہ کرے گا تاکہ اسے آزادی حاصل ہو سکے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام نے انسانی آزادی کا کتنا احترام کیا ہے۔

لہ الاسلام دین الفطرۃ ص ۸۱

اسلام کے ابتدائی دور میں غلامی کا ایک اور راستہ تھا اور وہ جزیہ کا تھا مسلم حکومتوں کی ماتحت حکومتوں کو جزیہ کی رقم کے ساتھ بعض اوقات غلاموں کی ایک محدود تعداد بھی بھیجنا پڑتی تھی، مثلاً حضرت عمرو بن عاصؓ اور شاہ نوبہ (   ) کے معاہدہ میں غلام روانہ کرنے کی بھی تصریح کر دی گئی تھی، اسی زمانہ میں غلاموں کی تجارت کا عام طور پر رواج ہو گیا تھا، بات یہ تھی کہ قیدیوں کی کثرت کی وجہ سے غلاموں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی، اور آقا اُن کے اخراجات برداشت نہ کر سکتے تھے، غلاموں کے تاجروں کی آمد و رفت، فرانس، اٹلی، بلقان، اور حبشہ وغیرہ کے ساحلوں سے کثرت سے جاری تھی۔

اسلام نے غلاموں کی آزادی کے لیے متذکرہ صدر وسائل کے علاوہ اور اسباب بھی پیدا کر دیے مثلاً مصرفِ زکوٰۃ میں مکاتب غلام کی مالی امداد کرنا بھی داخل ہے اور صدقات کے مال سے غلام خرید کر آزاد کیے جا سکتے تھے۔

غلاموں سے مسلمانوں کا برتاؤ

ایک بار ابن سوید نے حضرت ابوذر غفاریؓ اور ان کے غلام کو ایک ہی قسم کا لباس پہنے دیکھا، تو حیرت سے دریافت کیا۔ حضرت ابوذرؓ نے جواب دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، تمہارے غلام، تمہارے بھائیوں کی حیثیت رکھتے ہیں تمہیں چاہیئے، کہ جو تم کھاؤ، وہی انہیں کھلاؤ، جو تم خود پہنو وہی انہیں پہناؤ.......

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار دور سے ابن مسعودؓ کو اپنے غلام کو کوڑے مارتے دیکھ لیا، آپ نے وہیں سے انہیں ڈانٹا، اور قریب آ کر نہایت غصہ سے فرمایا "خدا اس سے زیادہ تم پر اقتدار رکھتا ہے، جتنا تم اس غلام پر رکھتے ہو" ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ سوار ہے اور اس کا غلام پیچھے پیچھے دوڑتا جا رہا ہے آپ نے فرمایا "خدا کے بندے! اسے بھی اپنے ساتھ بٹھا لے، یہ تیرا بھائی ہے، تیری طرح اس میں بھی جان ہے۔"

غلاموں پر یہ لطف و کرم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تک محدود نہ تھا بلکہ صحابہؓ بھی آنحضرتؐ کے صحیح نمونہ تھے، حضرت علیؓ فرمایا کرتے، مجھے ایسے شخص کو غلام خیال کرتے ہوئے شرم آتی ہے جو کہتا ہے "میرا پروردگار اللہ ہے" ایک دفعہ آپ نے اپنے غلام کو کچھ دام دیے اور فرمایا کہ دو مختلف قیمت کے کپڑے خرید لاؤ، جب وہ خرید لایا، تو آپ نے قیمتی کپڑا اسے دیدیا اور معمولی اپنے لیے رکھ لیا، اور فرمایا "تم جوان ہو، تمہیں زیب و زینت کی خواہش ہونا چاہیے، میرا کیا میں اب عمر رسیدہ ہوں۔[1]

اسلام نے غلاموں کے دل سے احساسِ کمتری دور کرنے کی ہر امکانی کوشش کی، خدا نے غلاموں کی ڈھارس بندھائی، اور مغفرت اور حسنِ جزا کا ان سے وعدہ فرمایا۔

"اے پیغمبر! لڑائی کے قیدیوں میں سے جو تمہارے قبضہ میں ہیں، ان سے کہہ دو، اگر اللہ نے تمہارے دلوں میں کچھ نیکی پائی، تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے کہیں بہتر تمہیں عطا فرمائے گا اور تمہیں بخش دے گا، وہ بڑا بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔ (آیت ۷۰ سورۃ انفال ۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر غلام اپنے آقا کی خیر خواہی کرے اور خدا کی عبادت کرے تو اسے دگنا اجر اس کے ہر نیک کام کے بدلے میں ملے گا" آپؐ کی اس بشارت کی وجہ سے بہت سے غلام اس کی تمنا کرتے تھے کہ ہم عمر بھر غلامی کی حالت میں بسر کریں تاکہ ہمیں دوہرا اجر ملے۔

فان رنبرگ نے غلاموں کے ساتھ مسلمانوں کے برتاؤ کا خاکہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے "اسلام نے غلاموں کے لیے اس قسم کے قوانین بنا دیے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے پیروکاروں کو انسانی احترام کا کتنا احساس اور

[1] عینی (شرح بخاری) ج ۱۳ ص ۱۲۷، احیاء العلوم غزالی ج ۲، باب حقوق المملوک

شعور تھا، اِن قوانین میں، اُن قوانین کے مقابلہ میں، صدہا خوبیاں نظر آتی ہیں، جو تہذیب و تمدن کی علم بردار قوموں نے اپنی ماتحت قوموں کے لیے بنائے ہیں۔ اسلام نے غلامی کے نظام کو اگرچہ باطل نہیں کیا لیکن اس میں غیر معمولی اصلاحات کیں، اور غلاموں کی حیثیت محض قیدیوں کی رہ گئی، جن سے رفق و نرمی کے برتاؤ کا حکم دیا گیا[1]، بدر کی جنگ کے بعد جب مسلمان، اسیرانِ جنگ لے کر روانہ ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو حکم دیا "دیکھو ان سے اچھا برتاؤ کرنا" ابن عمیر (جن کے ہاتھ میں جنگ بدر میں مشرکین کا جھنڈا تھا) کا بیان ہے کہ میں انصار کے ایک قافلہ میں اسیری کی حالت میں روانہ ہوا، اس قافلہ کے لوگ کھانے کے وقت مجھے اپنی روٹیاں کھلا دیتے اور خود کھجوروں پر گذارہ کر لیتے تھے۔

موالی صدرِ اسلام میں "موالی" تین اقسام کے نفوس شمار ہوتے تھے، پناہ دیا ہوا ہمسایہ، حلیف، (۸۱۱۲۰۱) اور آزاد کردہ غلام۔

۱۔ ہمسایہ، کوئی قبیلہ جب، اپنے کسی فرد سے معاشرتی تعلقات منقطع کر لیتا، تو مجبورًا وہ کسی دوسرے قبیلہ میں پناہ لیتا، اسے ہمسائیگی یا جوار کہا جاتا تھا، یہ شخص جس کی پناہ لیتا تھا اس کا فرض تھا کہ وہ اس کی حمایت کرے اور قبیلہ میں اس کی حیثیت اور ناموس و عزت کا خیال رکھے اور کسی کو اس کی طرف بُری نظر سے دیکھنے کی جراٴت نہ پیدا ہونے دے۔

۲۔ حلیف، اس کی حیثیت سدا تقریباً ہمسایہ کی تھی، اس کے حقوق بھی پناہ گزین ہمسایہ کے برابر تھے، قبیلہ میں یہ حلیف، اگر کوئی نامناسب حرکت کرتا تھا، تو اس کی جگہ اس شخص سے کہا جاتا تھا جس کا وہ حلیف ہوتا تھا۔

۳۔ آزاد کردہ غلام، آقا اپنے آزاد کردہ غلام کی حمایت اپنا فرض خیال کرتا تھا، مرنے کے بعد اِس غلام کا ترکہ آقا کو ملتا تھا۔

اسلام کے ابتدائی زمانہ میں موالی کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی ان میں اکثریت ان

---

[1] الاسلام و روح المدنیہ۔ ص ۴۲۱

ایرانیوں کی تھی جنہیں جنگوں میں گرفتار کیا گیا تھا اور وہ غلام تھے یا انہوں نے عربوں سے دوستانہ معاہدہ کر لیا تھا اور ان کے حلیف بن گئے تھے، مقصد یہ ہوتا تھا کہ عربوں کی حمایت حاصل کی جائے اور ان کے شرف وجاہ سے فائدہ اٹھایا جائے۔

اس دور کے عربوں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، موالی، خالص عرب، اور غلام، خالص عربوں سے مراد وہ عرب تھے جن کا نسب غیر اقوام کے اختلاط سے محفوظ تھا، اور ان کی شادی بیاہ کا دائرہ اپنے خاندان سے متجاوز نہ ہوا تھا، انہیں بہت سے امتیازی حقوق حاصل تھے، یہ قبیلہ کا تحفظ اور دفاع، قومی روایات کی حفاظت اور قبیلہ کے کسی مرد مقتول کا انتقام لینا اپنا فرض خیال کرتے تھے، تیسرا طبقہ غلاموں کا تھا جو بہت سے شہری حقوق سے محروم تھا، یہ گروہ صنعت و حرفت کے کاموں میں مصروف رہتا تھا، اس زمانہ میں ان کاموں کو ہاتھ لگانا خالص عربی النسل طبقہ اپنی کسر شان سمجھتا تھا، اجتماعی زندگی میں غلاموں کا طبقہ عربی عنصر سے بہت پست خیال کیا جاتا تھا، عربوں کا اعتقاد تھا کہ اس طبقہ نے کفر و شرک سے نجات پالی ہے لیکن وہ اسیری کی بندشوں سے ابھی آزاد نہیں ہوا ہے، عرب اپنی لڑکیوں کی شادی کسی مولیٰ سے کرنا کبھی گوارا نہ کرتے تھے مولیٰ کو "کنیت" سے بھی خطاب نہیں کیا جاتا تھا۔ کنیت سے مخاطب کرنا ان کے ہاں شرف و عزت کی علامت تھا اور مولیٰ اس شرف کا مستحق نہیں خیال کیا جاتا تھا۔

ایران کے "موالی" اس امتیازی حقوق اور تمدنی اور سیاسی زندگی میں پنہاں تحقیر کی وجہ سے غیظ و غضب میں پیچ و تاب کھاتے تھے، انہیں اپنی ذلت کا شدید احساس تھا، وہ عربوں کے خلاف آمادۂ سازش ہو گئے، حضرت عمرؓ کی شہادت ایک "مولیٰ" (ابو لولو مغیرہ بن شعبہ کا آزاد کردہ غلام) کے ہاتھ سے واقع ہوئی۔ یہ شہادت اس غلام کے غیر معمولی احساس ذلت کا کھلا مظاہرہ تھا، حضرت علیؓ کے تخت خلافت پر جلوہ فرما ہونے کے بعد موالیوں نے ان کے خلاف سر اٹھایا تھا اور بغاوت گری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا، مسعر تمیمی

کے الفاظ میں اس کی وجہ بیت المال کے وظائف سے ان کی محرومی تھی، اس محرومی نے انہیں ڈاکہ زنی اور سلب و نہب کے لیے مجبور کر دیا تھا۔

اموی فرماں روا بھی اسی پالیسی پر قائم تھے جو خلافتِ راشدہ میں اختیار کی گئی تھی اور انہوں نے بھی عربوں اور موالیوں میں امتیازی حد قائم رکھی، گورنروں نے موالیوں کے مسلمان ہونے کے بعد بھی ان پر جزیہ معاف نہیں کیا، حالانکہ یہ قانونِ شریعت کے خلاف تھا، موالیوں کو، انتظامی اور سیاسی عہدوں سے محروم رکھا گیا، فوجی خدمات کے عوض عربوں کی طرح ان کے وظائف مقرر نہ کیے گئے، جنگ کے وقت انہیں سوار ہو کر لڑنے کی اجازت نہ تھی، یہ "شرف" صرف "عربوں" کو حاصل تھا، ان امتیازات کے علاوہ اور بہت سی امتیازی حدیں قائم کر رکھی تھیں۔

بنی امیہ میں صرف حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ان "موالیوں" کے حالِ زار کی طرف توجہ فرمائی اور نومسلموں سے جزیہ اٹھا دیا چاہے وہ عرب ہوں، یا موالی، اور فوجی خدمات انجام دینے کے بدلے عربوں کی طرح موالیوں کے وظائف بھی حکومت کی طرف سے مقرر کر دیے گئے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی وفات کے بعد یہ موالی پھر اپنی قدیم سطح پر آ گئے، اس وقت ان کا احساسِ ذلت اور اُبھر گیا اور امتیازی برتاؤ کی وجہ سے امویوں کے خلاف دانت پیسنے لگے اور وقت کے منتظر رہے اور بنی امیہ کا تختہ اُلٹ دینے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ، امیر معاویہؓ کے زمانہ میں مختار بن ابی عبید کے طرفدار بن کر اپنی اذیت کوشی کا اظہار کر چکے تھے، پھر وہ خوارج کے ہم آہنگ بن گئے تھے، اور عبد الرحمٰن بن اشعث کی بغاوت میں عملی حصہ لیا تھا، اس کے بعد جب یزید بن مہلب نے اموی حکومت کے خلاف شورش اٹھائی اس وقت یہ موالی اس کے پشت پناہ تھے، ان تمام واقعات

لہ KLAPHATE P. 251

سے موالیوں کے جوشِ عداوت اور احساسِ ذلت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

اس سیاسی ماحول اور خلفشار کا اثر یہ ہوا کہ تھوڑی ہی مدت میں امویوں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور عباسیوں کی حکومت نے جنم لیا، صدر اسلام میں عربوں کی انتظامی، سیاسی اور فوجی عہدوں کے لیے تخصیص اور موالیوں کی ان سے محرومی کا نتیجہ یہ ہوا کہ موالی، علوم وفنون کی تحصیل میں لگ گئے اور اس دور میں ان میں صدہا ممتاز ادیب، قانون داں اور محدث اور مورخ پیدا ہوئے۔

تیسری صدی ہجری میں جنوبی عراق میں، غلاموں نے ایک شورش اٹھائی، ان کی اس شورش کو "زنگی تحریک" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، واقعہ یہ تھا، ایک شخص جس کا دعویٰ تھا کہ وہ امام زین العابدین کا صاحب زادہ ہے۔ مدت سے عباسیوں کے ضعف وانحطاط کا منتظر بیٹھا تھا، جب تیسری صدی میں سیاسی کمزوریوں کی وجہ سے عباسیوں کا زوال شروع ہوا، تو یہ شخص بصرہ پہونچا، جہاں ہزارہا غلام صنعت وحرفت اور کاشتکاری میں مصروف تھے، یہ غلام وہاں کے تاجروں کے تھے، اس شخص نے ان غلاموں کو دورِ غلامی اور ان کی موجودہ پستی کی زندگی سے نجات کی بہت سی امیدیں دلائیں، یہ غلام بھڑک اٹھے تھے اور انہوں نے دولتِ عباسیہ کے خلاف بغاوت کر دی، جو پندرہ[15] سال تک جاری رہی تھی۔

مشرق میں مغرب کے اعتبار سے غلاموں کی حالت بہت بہتر تھی، مشرق میں غلامی کی زندگی ایک خاص عمر تک پہونچنے کے بعد ختم ہوجاتی تھی، پھر وہ آقا کے خاندان کا ایک ممبر شمار کیا جاتا تھا اور اس میں اور خاندان کے افراد میں کوئی امتیاز نہ ہوتا تھا، یہ اسلام کی تعلیمات کا اثر تھا، یہی وجہ تھی کہ مشرق کی قلمرو یعنی عباسی سلطنت میں، غلاموں کی طرف سے کوئی اجتماعی تحریک حکومت کے خلاف کبھی نہیں اٹھی، اس کے مقابلہ میں مغرب میں غلاموں کی متعدد اجتماعی شورشیں اٹھی تھیں، مشرق میں ایک "زنگی تحریک" ضرور

اٹھی تھی مگر وہ صرف ایک مقامی تحریک تھی، جسے مذہبی رنگ دیا گیا تھا، اُس کا دائرہ عمل بلادِ عراق تک وسیع نہ تھا۔

عباسی فرماں رواؤں نے غلاموں کو کبھی نفرت اور حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا، اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ بہت سے عباسی خلفاء باندیوں کے بطن سے تھے جنہیں ان کے آبا نے خریدا تھا، اس دور میں باندیوں سے عالم گیر شیفتگی کا سبب، باندیوں کا حسن وجمال ہی، عرب عورتوں سے ممتاز ہوتا تھا کشش کی ایک اور اہم وجہ یہ تھی، کہ باندیوں کو شادی سے قبل اچھی طرح سے دیکھ بھال سکتے تھے، ان کی عادات، ان کے مزاج اور ان کے اخلاق کا جائزہ لیا جاسکتا تھا، لیکن شریف عورتوں سے نکاح میں یہ آسانیاں میسر نہ تھیں، دوسرے، تجربات نے ثابت کردیا تھا کہ باندی کے بچے اپنے باپ سے، شریف عورتوں کے بطن سے پیدا ہونے والے بچوں سے زیادہ محبت کرتے ہیں اس دور میں باندی زادوں اور شریف زادوں میں کسی قسم کا امتیاز نہ کیا جاتا تھا، وراثت میں بھی دونوں برابر کے شریک خیال کیے جاتے تھے۔

اکثر عباسی فرماں روا باندیوں کے بطن سے پیدا ہوئے تھے، مثلاً مامون رشید کی ماں، ایک ایرانی لونڈی تھی، معتصم کی ماں، ایک ترکی باندی تھی، متوکل کی ماں "شجاع" رومی (یا خوارزمی) لونڈی تھی، مقتدر کی ماں "بیدہ" اور مستکفی کی ماں دونوں رومی باندیاں تھیں، مطیع کی ماں ایک صقلبی باندی تھی، جو سیٹی بجانے اور خوش آواز پرندوں کی بولیاں بولنے میں غیر معمولی کمال رکھتی تھی۔[۱]

یہ طرزِ عمل صرف عباسی فرماں رواؤں کے ساتھ مخصوص نہ تھا۔ فاطمیوں نے بھی ان کی تقلید کی تھی، مستنصر کی ماں ایک سوڈانی باندی تھی، جسے ایک یہودی ابو سعید تستری نے خلیفہ ظاہر (مستنصر کا باپ) کی خدمت میں ہدیہ میں پیش کیا تھا، مستنصر کے

---

[۱] کتاب التنبیہ والاشراف (مسعودی) ص ۳۹۸

زمانہ میں سوڈانی نسل کے غلاموں کی تعداد کوئی پچاس ہزار تھی، ناصر خسرو کے بیان کے مطابق خلیفہ مستنصر نے بحر خلیج پر جو عظیم الشان دربار کیا تھا، اس میں تیس ہزار سوڈانی اسیروں کی تعداد تھی، جنہیں غلاموں کی طرح خرید اگیا تھا، اور قریب قریب اتنی ہی تعداد میں، سوڈانی نسل کے دوسرے غلام تھے [1]

مصر اور غلام مصر کے گورنروں اور بادشاہوں نے غلاموں سے فوجی خدمات لی تھیں اور وہ ان کے قابل اعتماد سپاہی تھے، فوج میں سوڈانی، ترکی، رومی اور صقالبی غلاموں کی کثرت تھی، خلیفہ عزیز باللہ نے سب سے پہلے غلاموں کا فوجی اعزاز بڑھایا، اور انہیں مصر آنے کا موقع دیا، فاطمیوں کے بعد ایوبی مصر کے تخت وتاج کے وارث ہوئے، انہیں بھی "دیارِ غیر" میں قدم جمانے کے لیے غلاموں کی ایک عظیم الشان فوج جمع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جو عربوں اور مصریوں کے مقابلہ میں وقت پر کام دے، اس مقصد کے لیے کثرت سے غلام فوج میں بھرتی کیے گئے اور ان پر اعتماد کیا گیا، سلطان نجم الدین ایوب نے کثرت سے غلاموں کو خریدا تھا، اس کے زمانہ میں ان کی تعداد بارہ ہزار تک پہونچ گئی تھی، اس دور میں غلام آپے سے باہر ہو گئے تھے، جب ان کی بے اعتدالیاں حد سے بڑھ گئیں تو شہریوں کی طرف سے عام احتجاج کیا گیا۔ اور حکومت نے جزیرہ روضہ میں ان کے قیام کے لیے بارکیں تعمیر کروا دیں، ایوبیوں نے ان کی تعلیم وتربیت کی طرف خصوصی توجہ کی تھی، اس کا اثر یہ ہوا کہ ان میں ایک بہت بڑی تعداد فقہ، اور دوسرے علوم وفنون کے ماہرین کی پیدا ہو گئی، اس زمانہ میں غلام شہسواری اور فنونِ جنگ میں غیر معمولی قابلیت کے مالک تھے اور اپنی اس اعلیٰ تعلیم وتربیت کی وجہ سے بڑے بڑے عہدوں کے فرائض بحسن وخوبی انجام دے سکتے تھے، مصر میں غلاموں کی قدر ومنزلت اور ثروت ودولت کی خبریں جب بلادِ ترکستان پہونچیں، تو لوگوں نے غلاموں کے بچوں کو

---

[1] الفاطمیون فی مصر (ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن) ص ۲۱۰۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰

اس خیال سے فروخت کرنا شروع کر دیا کہ وہ سلطانی قرب اور اعتماد حاصل کر سکیں جو مستقبل میں ان کے لیے سود مند ثابت ہو۔ اس وقت غلاموں کا دائرہ عمل صرف جنگی قیدیوں تک محدود نہ تھا، بلکہ کثرت سے مشرقی قبائل، سلاطین اور امراء کے ہاتھ "بچوں" کو فروخت کرنے مصر آنے لگے، شجرۃ الدّر سلطان نجم الدین کی بیوی جو ۶۴۸ھ ۔ ۱۲۵۰ء میں مصر کے تخت پر جلوہ فرما ہوئی تھی انہی قبائلِ مشرقیہ کے بچوں سے تعلق رکھتی تھی، اس نے اپنی ہشتاد روزہ ایام حکومت میں ثابت کر دیا تھا کہ وہ نظم و نسق اور حکومت کرنے کی کتنی غیر معمولی صلاحیت رکھتی ہے ۸۰ روز کے بعد اس نے عزالدین ترکمان کمانڈر انچیف سے شادی کر لی تھی اور حکومت کے فرائض اپنے شوہر کے سپرد کر دیے تھے۔

اسپین میں غلاموں کی حیثیت

جے بی ٹرنڈ (‏[illegible]) اسپین اور پرتگال کے مسلمانوں کے بارے میں بیان کرتا ہے۔

عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر اور دوسرے مسلمان جنرلوں نے وتزا (اسپین کے سلاطین قوط کا آخری تاجدار) کے خاندان میں شادیاں کی تھیں، ان کے علاوہ اور بہت سے مسلمانوں کی بیویاں اسپینی تھیں، اس زمانہ میں مسلمان خاندان شمالی اسپین کی اسیر عورتوں سے بڑے شوق سے شادیاں کرتے تھے، پروفیسر ریبرا نے قرطبہ کے بازار (جہاں باندی غلاموں کی خرید و فروخت ہوتی تھی) کے بہت سے فائل اور ریکارڈ کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مسلمانانِ اندلس کے دورِ حکومت میں باندیوں کی خرید و فروخت کوئی آسان چیز نہ تھی، جیسا کہ عام طور پر یورپ میں پھیلا ہوا ہے، بلکہ خریدار کو اس وقت ان اسباب کی وضاحت کرنا پڑتی تھی جن کی وجہ سے وہ خریدنا چاہتا تھا اور یہ پوری کارروائی ریکارڈ کے طور پر محفوظ رکھی جاتی تھی، بنی امیہ اندلس کے دور میں آزادی کے لحاظ سے باندیوں کی حیثیت عہد عباسیہ سے زیادہ مرتفع تھی، نسب میں یہ مسلمان اپنے آباء و اجداد کا اعتبار کرتے تھے، اس لیے اپنا سلسلہ نسب اپنے اجداد سے ملاتے تھے۔

اور اپنی ماؤں کے نسب اور حیثیت کو درخورِ التفات نہ سمجھتے تھے۔

سر ٹامس آرنلڈ کا بیان ہے "اسپین کے عیسائیوں نے جن پر کیتھولک فرماں رواؤں کے زمانہ میں نکبت اور فقر و شدت کی حکومت تھی، مسلمانوں کی حکومت میں، جو مذہبی رواداری میں مشہور تھے، بہت سے تمدنی حقوق حاصل کر لیے تھے، اسلام کی عالمگیر مساوات، رواداری اور انسانی آزادی کے احترام کی وجہ سے سب سے پہلے ان غلاموں نے اس کا خیر مقدم کیا، جو صدیوں سے پستی کی حالت میں تھے، اس کے بعد بہت سے بت پرستوں نے ان کی تقلید کی اور کثرت سے مسلمان ہو گئے۔"

مآخذ

ذیل میں چند اہم ماخذوں کی ایک فہرست دی جاتی ہے، مصنفین کے ناموں میں حروف تہجی کا لحاظ کیا گیا ہے۔

(۱) ابن الاثیر (+ ۶۳۰ھ = ۱۲۳۸م) علی بن احمد بن ابی الکرم (الکامل فی التاریخ ۱۲ جلدیں (بولاق ۱۲۷۴ھ)۔ (۲) استاد احمد ابراہیم بک (طرق القضا فی الشریعۃ الاسلامیہ) (قاہرہ ۱۳۴۶ھ)۔ (۳ و ۴) احمد امین: استاد۔ ۱۔ کتاب فجر الاسلام، (قاہرہ ۱۹۲۸ء)۔ ۲۔ کتاب ضحیٰ الاسلام (قاہرہ ۱۹۳۵ء)

(۵، ۶) آرنلڈ: سرٹامس — Arnold, Prof. Sir Thomas.

(1) "The Preaching of Islam" 3rd. ed. (London. 1935)

(2) "The Caliphate" (Oxford, 1924.)

(۷) اصفہانی (+ ۳۵۶ھ = ۹۶۶م): ابو الفرج (کتاب الاغانی) ۲۱ جلدیں) (قاہرہ ۱۲۸۵ھ)

(۸) امیر علی۔ سید — Ameer Ali, Sayed.

"A Short History of the Saracens" (London, 1921)

(۹) ابن ایاس (+ ۹۳۰ھ = ۱۵۲۳م) ابو البرکات محمد بن احمد۔ (کتاب تاریخ مصر المعروف باسم (بدائع الزہور) ۳ جلدیں (بولاق ۱۳۱۱ھ - ۱۳۱۲ھ)

(۱۰، ۱۱) براؤن ایڈورڈ جی، — Browne, Edward. G.

(1) Literary History of Persia-From the Eastist Times until Firdausi (London, 1909.)

(2) Literary History of Persia-From Firdansi to Saidi (London, 1906)

(۱۲) بٹلر، اے،جے، Butler, Alfred. J.

"The Arab Conquest of Egypt" (Oxford, 1902.)

عربی ترجمہ از پروفیسر محمد فرید ابو حدید (قاہرہ ۱۳۵۱ھ = ۱۹۳۳ء)

(۱۳) بغدادی (+ ۴۲۹ھ = ۱۰۳۷م) ابو منصور عبد القادر بن طاہر)۔ الفرق بین الفرق (قاہرہ ۱۳۲۸ھ = ۱۹۱۰م)

(۱۴) البکری (+ ۴۸۷ھ = ۱۰۹۴م) ابو عبید عبد اللہ بن عبد العزیز (کتاب المغرب فی ذکر بلاد افریقیہ و المغرب) دوسرا ایڈیشن (پیرس ۱۹۱۱ء)

(۱۵) بلاذری (+ ۲۷۹ھ = ۸۹۲م) احمد بن یحییٰ بن جابر "فتوح البلدان" (قاہرہ ۱۳۱۹ھ)

(۱۶) ٹرنڈ، جے، بی، Trend, J.B.

"The Legacy of Islam" (Oxford, 1931) ترجمہ لجنۃ الجامعین لنشر العلم (قاہرہ ۱۹۳۶ء)

(۱۷) جاحظ، ابو عثمان عمرو بن المعروف بالجاحظ "البیان و التبیین" (طبع مصر)

(۱۸) گبن، ایڈورڈ Gibbon, Edward,

"The History of the Decline and Fall of the Roman-Empire" 7 Vol. ed. by Prof. G. B. Bury.

(۱۹) گروہمان: ڈاکٹر اڈولف Grohmann, Adolfe.

(۲۰) اوراق البردی العربیہ بدار الکتب المصریہ (قاہرہ ۱۹۳۵ء) جزاول، مترجمہ ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن، اور ترجمہ جز ثانی زیر طبع

(۲۱) جہشیاری (+ ۳۳۱ھ) ابو عبد اللہ محمد بن عبدوس۔ "کتاب الوزراء و الکتاب"

شائع کردہ، اساتذہ مصطفٰی السقا اور ابراہیم الابیاری اور عبدالحفیظ شبلی (قاہرہ سنہ ۱۹۴۸ء)

(۲۱) جرجی زیدان" تاریخ التمدن الاسلامی" پانچ جلدیں (قاہرہ۔ ۱۹۰۲-۱۹۰۶ء)

(۲۲) ابن جماعۃ: بدرالدین۔" تحریر الاحکام فی تدبیر اہل الاسلام۔ مجلۃ Islamica. (سنہ ۱۹۳۴ء)

(۲۳) جمیل تحفۃ المدور" حضارۃ الاسلام فی دار الاسلام" (قاہرہ سنہ ۱۹۳۲ء)۔

(۲۴، ۲۵) ابن حجر عسقلانی (+ ۸۵۲ھ = ۱۴۴۹م) شہاب الدین بن علی (ا) الاصابہ فی تمیز الصحابہ، (مصر سنہ ۱۹۲۳ء) (ب) رفع الامر عن قضاۃ مصر، (مصری لائبریری کا قلمی نسخہ نمبر ۲۱۱۵)

(۲۶) ابن حزم (+ سنہ ۴۵۶ھ = سنہ ۱۰۶۴م) ابو محمد علی بن احمد" الفصل فی الملل والاہواء والنحل" ۱۵ جلدیں۔ (قاہرہ سنہ ۱۳۱۷ھ)

(۲۷، ۳۲) حسن ابراہیم حسن، ڈاکٹر، (ا) تاریخ عمرو بن العاصؓ، دوسرا ایڈیشن (قاہرہ سنہ ۱۹۲۶ء) (ب) الفاطمیون فی مصر (ترجمہ انگریزی)۔ (مطبع امیریہ سنہ ۱۹۳۲ء) (ج) السیادۃ العربیہ والشیعہ والاسرائیلیات فی عہد بنی امیہ۔ ترجمہ فرانسیسی سے، تالیف از فان فلوتن (قاہرہ سنہ ۱۹۳۳ء) (د) اوراق البردی العربیہ (ترجمہ انگریزی) تالیف، از ڈاکٹر اڈولف جروہمان، جلد اول (قاہرہ سنہ ۱۹۳۴ء) جلد ثانی زیر طبع۔ (ہ) تاریخ الاسلام السیاسی الجزء الاول (قاہرہ سنہ ۱۹۳۵ء) (و) تاریخ العصور الوسطیٰ فی الشرق والغرب، پروفیسر احمد صادق الطنطائی کی شرکت سے (قاہرہ سنہ ۱۹۳۴ء)

(۳۳) الخطیب البغدادی (+ ۴۶۳ھ) الحافظ ابوبکر احمد بن علی۔" تاریخ بغداد او مدینہ السلام" ۱۴ جلدیں (قاہرہ سنہ ۱۳۴۹ھ = سنہ ۱۹۳۱ء)

(۳۴، ۳۵) ابن خلدون (+ ۸۰۸ھ = ۱۴۰۵ - ۱۴۰۶م) عبدالرحمٰن بن محمد (ا)

مقدمہ ابن خلدون (بیروت ۱۹۰۰ء) (ب) "العبر و دیوان المبتدا و الخبر" ۷ جلدیں
(قاہرہ ۱۲۸۴ھ)

(۳۶) ابن خلکان (+ ۶۸۱ = ۱۲۸۱م) شمس الدین ابو العباس احمد بن ابراہیم بن
ابی بکر الشافعی۔ "وفیات الاعیان" دو جلدیں (بولاق ۱۲۸۳ھ) (و مصر ۱۳۱۰ھ)

(۳۷) ابن دقماق (+ ۸۰۹ = ۱۴۰۶-۱۴۰۷م) ابراہیم بن محمد المصری، "الانتصار
لواسطۃ عقد الامصار" (جلد ۴، ۵) (قاہرہ ۱۳۰۹ھ = ۱۸۹۳م)

(۳۸) ابن سعید المغربی (+ ۶۷۳ھ = ۱۲۷۵م) علی بن موسیٰ المغربی "سیرۃ ابن
طولون لابن الدایہ (برلن ۱۸۹۴م)

(۳۹) ابن سلام (۲۲۴ھ) الحافظ ابو عبید القاسم "کتاب الاموال" (قاہرہ ۱۳۵۳ھ)

(۴۰) السنہوری: پروفیسر ڈاکٹر عبد الرزاق بک "Le Caliphate" (Paris 1926)

(۴۱/۴۲) السیوطی (+ ۹۱۱ = ۱۶۰۵م) عبد الرحمٰن بن ابی بکر جمال الدین۔ (ا) تاریخ
الخلفاء امراء المومنین القائمین بامر اللہ (قاہرہ ۱۳۵۱ھ) (ب) "حسن المحاضرۃ
فی اخبار مصر و القاہرہ، دو جلدیں (قاہرہ ۱۳۲۷ھ)

(۴۳) شہرستانی (۴۷۸ھ - ۵۴۸ھ) ابو الفتح محمد بن عبد الکریم "الملل و النحل" ۵ جلدیں
(قاہرہ ۱۳۱۷ھ)

(۴۴) صولی (۳۳۵ھ) ابوبکر محمد بن یحییٰ، "اخبار الراضی باللہ و المتقی للہ" یا تاریخ
الدولۃ العباسیہ از ۳۲۲ھ تا ۳۳۳ھ از کتاب الاوراق (قاہرہ ۱۹۳۵ء)

(۴۵) ابن طباطبا: محمد بن علی المعروف بابن الطقطقی "الفخری فی الآداب السلطانیہ و
الدول الاسلامیہ" (قاہرہ ۱۳۱۹ھ)

(۴۶/۴۷) الطبری (۳۱۰ھ = ۹۲۲ء) ابو جعفر محمد بن جریر (ا) تاریخ الامم و الملوک" طبع
(ڈی گوجی، لیدن ۱۸۸۱ء) (قاہرہ مطبع حسینیہ) (ب) کتاب الجہاد و

کتاب الجزیہ واحکام المحاربین من کتاب اختلاف الفقہاء" شائع کردہ ڈاکٹر یوسف شخت۔ (لیدن ۱۹۳۳ء)

(۴۸) ابن عابدین: " ردالمختار علی الدر المختار (بولاق ۱۲۹۹ھ)

(۴۹) ابن عبدالحکیم (۲۵۷ھ) "فتوح مصر" شائع کردہ مجلس معارف فرانسیسی مخصوص بہ آثار قدیمہ شرقیہ (قاہرہ ۱۹۱۴ء)

(۵۰) ابن عبدربہ (۳۴۹ھ - ۹۴۰ء) شہاب الدین احمد" العقدالفرید" ۳ جلدیں (قاہرہ ۱۳۴۶ھ = ۱۹۲۸ء)

(۵۱) علی ابراہیم حسن: تاریخ جوہر الصقلی (قاہرہ ۱۹۳۳ء)

(۵۲) عمارۃ الیمنی (۵۶۹ھ = ۱۱۷۴ء) ابوالحسن نجم الدین الیمنی "کتاب العصریہ فی اخبار الوزارۃ المصریہ" شائع کردہ ہارٹوگ ڈیرنبورپیرس ۱۸۹۷ء)

(۵۳) امیر عمر طوسون۔ "کتاب مالیہ مصر از عہد الفراعنۃ تا عہد حاضر (اسکندریہ ۱۹۳۱ء)

(۵۴) ابوالفداء (۷۳۲ھ = ۱۳۳۱ء) اسماعیل بن علی عماد الدین صاحب حماہ۔ "المختصر فی اخبار البشر" ۴ جلدیں (قسطنطنیہ ۱۲۸۶ھ)

(۵۵) قدامہ (۳۳۷ھ) ابوالفرج بن جعفر الکاتب البغدادی، "کتاب الخراج (ڈی۔ گوجی، لیدن ۱۸۸۹ء)

(۵۶) قلقشندی (۸۲۱ھ = ۱۴۱۸ء) ابوالعباس احمد "صبح الاعشیٰ فی صناعۃ الانشاء" ۱۴ جلدیں (قاہرہ ۱۹۱۳ء - ۱۹۱۷ء)

(۵۷) قرطبی (۶۷۱ھ) ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری" الجامع لاحکام القرآن" دوجلدیں (مطبع دارالکتب ۱۹۳۳ء - ۱۹۳۴ء)

(۵۸) کرد علی، پروفیسر محمد بک " الادارہ الاسلامیہ فی عز العرب" (قاہرہ ۱۹۳۴ء)

(۵۹) کریمر: الفرڈ فون Kremer, Alfred, Von

Culturgeschichte des Orients enter der Chalifen 2.Vols (Vienana, 1875) translated by Khuda Bukhsh. (Calcutta. 1920–1927.)

(٦٠) کندی (٣٥٠ھ = ٩٦١م) ابو عمر محمد بن یوسف "کتاب الولاۃ وکتاب القضاۃ"
(طبع روئن جسٹ (Rlmvon Guest)

(٦٥) ماوردی (٤٥٠ھ = ١٠٥٨ء) ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب البصری،
"الاحکام السلطانیہ" (قاہرہ ١٢٩٨ھ)

(٦٦) میز، آدم Mez. Adam.
"The Renaissance of Islam" traus. int English by Salahuddin Khuda Bukhsh and D.S. Neargolionth (London 1939.)

(٦٧) ابو المحاسن (٨٧٤ھ = ١٤٩٦م) جمال الدین یوسف بن تغری بردی
"النجوم الزاہرہ فی ملوک مصر والقاہرۃ" ٤ جلدیں (مطبع دار الکتب المصریہ)

(٦٨) محمد جمال الدین سرور "الظاہر بیبرس وحضارۃ مصر فی عہدہ" (قاہرہ ١٩٣٨ء)

(٦٩) مارگولیتھ ڈی، ایس، Margolionth Pro. D.S.
"Mohammed and the Rise of Islam" 3rd ed. (London. 1923.)

(٧٠) محمد حسین ہیکل پاشا: ڈاکٹر "حیات محمد" (صلعم) تیسرا ایڈیشن قاہرہ ١٣٥٨ھ)

(٧١) مسکویہ (٤٢١ھ = ١٠٣١م) ابو علی احمد بن محمد "کتاب تجارب الامم"
(قاہرہ ١٩١٤ء)

(٧٢،٧٣) مسعودی (٣٤٦ھ = ٩٥٦م) ابو الحسن علی بن الحسین بن علی، (ا)
"کتاب التنبیہ والاشراف" مطبعہ ڈی گوجی۔ لیدن ١٨٩٣م) (ب)
"مروج الذہب ومعادن الجوہر" ٢ جلدیں (قاہرہ ١٣٠٣ھ ١٨٨٥م)

(۷۴) مسلم (۲۶۱ھ - ۸۷۵ء) ابو الحسین مسلم بن الحجاج القشیری
"جامع الصحیح" (قاہرہ ۱۳۲۹ھ - ۱۳۳۲ھ)

(۷۵،۷۶) مقریزی (۸۴۵ھ - ۱۴۴۱ء) تقی احمد بن علی "(ا) المواعظ والاعتبار فی
ذکر الخطط والآثار" ۲ جلدیں (بولاق ۱۲۷۰ھ) (ب) "اتعاظ الحنفاء
باخبار الخلفاء" (بیت المقدس ۱۹۰۸ء)

(۷۷) ملن: جے، گرافٹن Milne, J. Grafton.
"A. History of Egypt ender Roma Rule" (London. 1913.)

(۷۸) ابن مماتی: القاضی الوزیر شرف الدین ابو المکارم بن ابی سعید "کتاب
قوانین الدواوین" (قاہرہ ۱۲۹۹ھ)

(۷۹) ابن منجب (۵۴۲ھ - ۱۱۴۷ء) امین الدین تاج الریاستہ ابو القاسم علی
نیز مسمی بہ الصیرفی المصری "الاشارۃ الی من نال الوزارۃ" (قاہرہ ۱۹۲۴ء)

(۸۰) ابن میسر (۶۷۷ھ - ۱۲۷۸ء) محمد بن علی بن یوسف بن حلب "تاریخ
مصر" طبعہ ہنری ماسیہ (Henri Masse) (قاہرہ ۱۹۱۹ء)

(۸۱،۸۲) میور، سر ولیم ٹمپل، Muir, Sir, William Temple,
(a.) "The Caliphate, its Rise, Decline and fall (oxford, 1902)
(b) "The Mamelukor Slam Dynasty of Egypt" (London, 1896)

(۸۳) ناصر خسرو (۴۸۱ھ - ۱۰۸۸ء) "سفرنامہ"
Relation duvoyage de Nasire Khosrau en Syria, en Palestine, en Egypt en Arabie et en Perse, Persian Text and Translation by Charles Schefer (Paris, 1881.)

(۸۴) ابن الندیم (۳۸۲ھ - ۹۹۳ء) محمد بن اسحٰق "کتاب الفہرست" دو جلدیں

(لائپسک ۱۸۷۱ء)

(۸۵) نکلسن جان — Nicholson, John.

"A Aceount of the Etablishment of the Fatemite Dynesty in Africa." (Tübingen. 1840)

(۸۶) نویری (۷۳۲ھ = ۱۳۳۲ء) شہاب الدین احمد بن عبد الوہاب "نہایۃ الارب فی فنون الادب" (مصری لائبریری کا قلمی نسخہ، نمبر ۱۵۷۶)

(۸۷) نکلسن، اے، رینلڈ، — Nicholson, Prof. Reynold, A.

"Literary History of the Arabs. (London. 1914.)

(۸۸) ابن ہشام (۲۱۸ھ = ۸۳۳ء) ابو محمد عبد الملک بن ہشام بن ایوب المعافری الحمیری "کتاب سیرۃ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم" ۳ جلدیں۔ (قاہرہ ۱۳۳۲ھ)

(۸۹-۹۰) ہلال الصابی (۴۴۸ھ - ۱۰۵۶ء) ابو الحسن بن المحسن بن ابی اسحق ابراہیم الکاتب، (ا) "تحفۃ الامراء فی تاریخ الوزراء" مرتبہ ایچ۔ ایف امڈروز (ب) امڈروز کی تاریخ کا حصہ ہشتم (۳۶۹ - ۳۹۳ھ) (قاہرہ ۱۹۱۹ء)

(۹۱) وسٹنفلڈ۔ ایف، فان — Wüstenfeld, F. von.

(a.) "Geschichte der Fateiniden Chalifen." (Gottingen, 1881.)

(b) Geschichtschreiber der Araber and ibre werke." (Gottingen, 1882.)

(۹۲) یاقوت (۶۲۶ھ = ۱۲۲۹ء) شہاب الدین ابو عبد اللہ الحموی الرومی "معجم البلدان"۔ ۱۰ جلدیں (قاہرہ ۱۳۲۳ھ۔ ۱۹۰۶ء)

(۹۳) یحیی بن سعید الانطاکی (۴۵۸ھ۔ ۱۰۶۶ء) "تاریخ المجموع علی التحقیق والتصدیق" (بیروت ۱۹۰۹ء)

(۹۴'۹۵) یعقوبی (۲۸۲ھ ۔ ۸۹۵ء) احمد بن یعقوب بن جعفر بن وہب بن واضح،

(ا) "تاریخ یعقوبی" دو جلدیں طبعہ ہوتسما (M.Sh. Hontosma.) لیدن ۱۸۸۳ء)

(ب) "کتاب البلدان" طبعة ڈی، گوجی، (لیدن ۱۸۹۲ء)

(۹۶) ابو یوسفؒ (۱۹۲ھ ۔) یعقوب بن ابراہیم صاحب ابی حنیفہؒ۔

"کتاب الخراج" (بولاق ۱۳۰۲ھ)

(۹۷) کتاب "الفقہ علی المذاہب الاربعۃ" (طبع دار الکتب ۱۳۴۹ھ ۔ ۱۹۳۱ء)